قرآن و سنت پر مبنی نظام

نظامِ خلافت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

خلافت ☑
جمہوریت ☒
آمریت ☒

چودھری رحمت علی

خلافت پبلی کیشنز

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

کتابِ خلافت

(نظامِ خلافت کے متعلق مفصل اور جامع کتاب)

از قلم

چودھری رحمت علی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

3- کورٹ سٹریٹ، لوئر مال، لاہور (پاکستان)

(جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں۔)

کتاب	:	کتابِ خلافت
مصنف	:	چودھری رحمت علی المعروف بابائے خلافت
		دارالسلام، واپڈا ٹاؤن، لاہور۔

فون:4-35183123-042, 03009462188

E-mail: khalafat@hotmail.com

ترتیب وتدوین	:	ال عمران چودھری
اشاعت	:	اگست - 2010ء
ایڈیشن	:	دوم
تعداد	:	1100
اہتمام	:	پروفیسر محمد امین جاوید (مینجنگ ڈائریکٹر)
		3۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال، لاہور (پاکستان)

فون:37320961 ,042-37248676 فیکس:042-37214974

ویب سائٹ	:	www.islamicpak.com.pk
ای میل	:	islamicpak@yahoo.com
مطبع	:	رضا پرنٹرز
قیمت	:	350/- روپے

اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو

الحمدللہ' صد بار الحمدللہ' امتی انحطاط وزوال کے رواں دواں دور میں راقم الحروف نے تجدیدِ دین کے سلسلہ میں خاصا کام کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ:

☆ جبکہ نظامِ خلافت کو تیاگ کر امتِ مسلمہ صدیوں سے لمبی تان کر سو چکی تھی' محراب ومنبر اس بارے میں خاموش تھے' ذرائع ابلاغ محوِ خرافات تھے' راقم الحروف نے یاد کرایا کہ امتِ مسلمہ کی بگڑی ہے تو نظامِ خلافت کو ضائع کر کے اور اس کی بنے گی تو نظامِ خلافت کو پھر اس دھرتی پر رواں دواں کر کے۔

☆ راقم الحروف ہی نے اس راز سے پردہ اٹھایا کہ نظامِ خلافت قرآن وسنت کے مطابق مبنی ہونے کی بنا پر عبادت ہے تو آمریت' جمہوریت' اشتراکیت وغیرہ جیسے انسان ساختہ نظام بغاوت ہیں۔ محض بغاوت ہی نہیں سورۂ مائدہ کی آیاتِ مبارکہ 45,44 اور 47 کے مطابق کفر بھی ہیں' ظلم بھی ہیں اور فسق بھی۔ علاوہ ازیں شرک تو ہیں ہی' لہٰذا حرام ہیں۔

☆ راقم الحروف ہی نے صدیوں بعد انکشاف کیا کہ دورِ ملوکیت میں دینِ حق سے خلیفۃ المسلمین کے علاوہ چار قرآنی ادارے بعنوان اولوالامر' شوریٰ' امتِ مسلمہ اور بیت المال نکال دیئے گئے۔ آج ہمارا اختیار کردہ دین مذکورہ اداروں کے بغیر ہونے کی وجہ سے دینِ حق نہیں رہا' دینِ ملوک بلکہ بے دینی ہی کی ایک شکل ہے۔ بنابریں عدل' امن' خوشحالی' اتحاد' غلبۂ دینِ حق جیسی اقدار ظلم' بدامنی' پسماندگی ودرماندگی' انتشار' مغلوبیت کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔

☆ یہ پتہ بھی مدتوں بعد راقم الحروف نے ہی دیا کہ اسلام کا نظامِ اطاعت' تین اطاعتوں یعنی اللہ کی اطاعت' رسول ﷺ کی اطاعت اور اولوالامر کی اطاعت پر مشتمل ہے (نساء:59)۔ آج ہماری اطاعت ادھوری اور ناقص ہے اس لیے کہ اولوالامر کا وجود ہمارے ہاں اس لیے نہیں کہ خلیفۃ المسلمین جسے اولوالامر میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے' خود نہیں۔

☆ اس راز کو بھی واشگاف کیا تو راقم الحروف نے کہ صدیوں سے ہمارے ہاں اجتہاد کے دروازے شوریٰ کے نہ ہونے سے بند ہیں۔ ارکانِ شوریٰ نے مشورہ خلیفۃ المسلمین کو دینا ہوتا ہے جو خود نہیں۔

☆ راقم الحروف ہی نے یہ سربستہ راز کھولا کہ زیرِ آسماں آج امتِ مسلمہ کا وجود نہیں۔ امتِ مسلمہ عرصہ ہوا تحلیل ہو کر اَن گنت مسلم اقوام کا روپ دھار چکی ہے۔ بنابریں غلبہؑ دینِ حق، شہادت علی الناس اور دوسرے فرائض جو امتی سطح پر ہونے تھے آج کما حقہٗ ادا نہیں ہو رہے۔

☆ اس راز سے بھی پردہ راقم الحروف ہی نے اٹھایا کہ دورِ خلافت نہ ہو تو دورِ جہالت ہوتا ہے۔ نیز جب تک ہمارے ہاں نظامِ خلافت بحال نہیں ہوتا، عصرِ حاضر کے مسلمان دورِ جہالت میں ہیں اور رہیں گے۔

☆ راقم الحروف ہی نے پتہ دیا کہ دینِ حق سے اگر خلیفۃ المسلمین اولوالامرٗ شوریٰ، امتِ مسلمہ، بیت المال وغیرہ کو نکال دیا جائے تو دین اسی طرح بے جان ڈھانچہ رہ جاتا ہے جس طرح سے انسانی جسم سے روح نکل جائے تو رہنے والی لاش محض خاک کا ڈھیر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں ہمارے اختیار کردہ دین سے وہ برکات حاصل نہیں ہو رہیں جو دورِ خلافتِ راشدہ کے مسلمانوں کو حاصل تھیں۔

☆ ایک اور بہت اہم بات جو راقم الحروف نے عام کی وہ یہ کہ کوئی بھی نظامِ زندگی، اختیار کردہ آئین کا پروڈکٹ ہوتا ہے۔ اشتراکی آئین اشتراکیت کو معرضِ وجود میں لاتا ہے تو جمہوری آئین سے سرمایہ دارانہ جمہوریت وجود پذیر ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ جب ہمیں خلافتِ راشدہ کا سا نظام مطلوب ہے تو وہ ایک ہی صورت میں وجود پذیر ہو سکتا ہے کہ قرآن وسنت آئینِ مملکت ہو نہ کہ کوئی خود ساختہ کتابچہ۔ لاریب، اصلی بیج سے اصلی فصل پیدا ہوتی ہے، قرآن وسنت کو آئینِ مملکت قرار دے دیں، وہ رونقیں، وہ بہاریں، وہ برکات لوٹ آئیں گی جو ہم سے روٹھ چکیں۔ مقصدِ تخلیقِ آدم بھی پورا ہو گا تو اسی طرح سے۔ تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوانات	صفحات
1۔	کارِ قیامِ خلافت میرا اوڑھنا بچھونا بنا تو کیسے؟	iv
	خلافت کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟	
2۔	کچھ اس کتاب کے بارے میں	01
3۔	مقصدِ تخلیقِ آدم	04
4۔	اسبابِ زوالِ امت	13
5۔	خلافت کی شرعی حیثیت	25
6۔	نظامِ باطل	49
7۔	نظامِ خلافت قائم ہو آج تو کیسے؟	67
8۔	نظامِ خلافت نہ ہونے کے مضر اثرات	87

برکاتِ خلافت

نمبر شمار	عنوانات	صفحات
9۔	اسلام انسانیت کا دین ہے	107
10۔	اسلامی معاشرے میں مرد اور عورت کی حیثیت	114
11۔	یتیموں کی فلاح و بہبود کا فکر	120
12۔	یتیموں کے علاوہ دوسرے محتاجوں کی فلاح و بہبود	124
13۔	دھاندلی سے مال ہڑپ کرنے کی ممانعت	129
14۔	حق تلفی کی ممانعت	131
15۔	بنیادی حقوق	136
16۔	تعددِ ازواج	177
17۔	مرد و عورت کے حقوق میں عدم مساوات	182
18۔	اسلامی سزاؤں کا سخت ہونا	188
19۔	اسلامی جہاد (مسلح جدوجہد) کیوں؟	196

نظام ہائے خلافت

نمبر شمار	عنوانات	صفحات
20۔	خلافت کا نظامِ حکومت	202
21۔	خلافت کا نظامِ عبادت	218
22۔	خلافت کا نظامِ معاشرت	233
23۔	خلافت کا نظامِ معیشت	249
24۔	خلافت کا نظامِ اطاعت	267
25۔	خلافت کا نظامِ مشاورت	282
26۔	خلافت کا نظامِ عفت وعصمت	296
27 ۔	ضمیمہ......سوال وجواب	312

پیشِ لفظ

کارِ قیامِ خلافت میرا اوڑھنا بچھونا بنا تو کیسے؟

زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے ناطہ سے مجھے 1952ء میں زرعی کالج لائل پور میں داخل کرایا گیا۔ پہلے ہی سال گرمیوں کی تعطیلات میں گھر جانے کیلئے سامان باندھ رہا تھا کہ ایک طالب علم ساتھی نے ایک کتابچہ مجھے پکڑاتے ہوئے نصیحت کی کہ میں اسے گاؤں پہنچ کر فارغ وقت میں پڑھوں۔ یہ کتابچہ جو سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تحریر کردہ تھا میں نے ایک نہیں وقفے وقفے سے تین دفعہ پڑھا۔ اسے پڑھنے سے پہلی دفعہ مجھ پر انکشاف ہوا کہ مسلمان دنیا میں ''مغلوب'' ہیں اور دنیا کی قیادت کفر کے ہاتھ میں ہے۔ اس خبر نے مجھے متفکر و مغموم کیا تو اس حد تک کہ اس نے میری سوچ بلکہ میری زندگی کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا۔ کالج واپسی پر اور اس کے بعد سالہا سال تک میں اس ٹوہ اور کھوج میں لگ گیا کہ ایسا کیوں ہے؟ مسلمان اور دنیا میں مغلوب ہو' میرے نزدیک ایک بہت بڑا تضاد تھا۔ اسی سوال کا جواب ڈھونڈنے کیلئے کہ مسلمان دنیا میں مغلوب ہیں تو کیوں' میں اس وقت کے بعد ایک عرصہ تک اَن گنت علماء کرام سے ملا۔ دینی جلسوں اور اجتماعات میں حاضری میرا معمول بن گیا تو اسقدر کہ اس سے میری تعلیم پر کچھ منفی اثرات مرتب ہوئے۔ بایں ہمہ مجھے کسی بھی حلقے سے میرے سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔

کالج مذکور سے ایم ایس سی کرنے کے بعد مجھے پہلے محکمہ انہار' پنجاب اور پھر واپڈا میں ملازمت کرنے کا موقع ملا۔ اسی دوران کچھ عرصہ شعبۂ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی میں بطور متعلم منسلک رہا اور وہاں پر بھی محترم علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب اور دوسرے اساتذہ سے بار بار تبادلۂ خیال کیا لیکن میری ذہنی الجھن کو کوئی حل نہ کر پایا۔ البتہ اس دوران میری تشویش میں مزید اضافہ ہوا تو اس لیے کہ مزید پتہ چلا کہ مسلمان دنیا میں مغلوب ہوتے ہیں تو اس وقت جب وہ نصرتِ الٰہی سے محروم ہوں اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمانا کہ ''(مسلمانو) غلبہ تمہارا ہی ہوگا بشرطیکہ تم

مومن ہوئے‘‘۔ یعنی مسلمانوں کا دنیا میں مغلوب ہونا ایک ہی شکل میں ممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہوں اور یہ بھی کہ وہ مومن نہ رہیں۔ واقعات کی دنیا میں جب مسلمان دنیا میں آج مغلوب ہیں تو ایک تو اس لیے کہ وہ نصرتِ ایزدی سے محروم ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کا ایمان اس معیار و سطح کا نہیں رہا کہ جو انہیں دنیا میں بطور غالب قوت رکھے۔

1982ء کی ایک رات پچھلے پہر حسبِ معمول قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہا تھا کہ پڑھتے پڑھتے ایک جگہ پر تمکین فی الارض یعنی غلبے کا ذکر آیا۔ میرا ’اسے میں پیدائشی کہوں گا‘ مسئلہ تو تھا ہی ’’غلبہ‘‘ کے متعلق، میں نے اس آیۂ مبارکہ کو بار بار پڑھا۔ سیاق وسباق کو بھی پڑھا۔ کوئی دس بارہ منٹ میں شرح صدر ہوا تو اس قدر کہ میرے ذہن میں تقریباً ربع صدی سے بسیرا کیے سوال کا بھر پور جواب مل گیا اور میں نے خود کو ایک بدلا ہوا انسان محسوس کیا۔ یہ آیۂ مبارکہ سورۂ نور کی آیت نمبر 55 تھی جس کے متعلق بعد میں میرے علم میں لایا گیا کہ مفسرین نے اسے آیۂ استخلاف کا نام دے رکھا ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نظامِ خلافت کے تین نمایاں (Distinct) مراحل کا ذکر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

’’اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ کہ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ اور ان کیلئے ان کے اس دین کو غلبہ عطا کرے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا۔ بس وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں‘‘۔

بڑا دوٹوک الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اس آیۂ مبارکہ میں پہلے خلافت کے مرحلے کا ذکر کیا ہے پھر غلبۂ دین کے مرحلے اور آخر میں اسلام کی برکات کے مرحلے کا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی پھل دار درخت کو پھل تو شاخوں پر لگتا ہے لیکن شاخیں معرضِ وجود میں نہیں آتیں جب تک کہ اس سے پہلے تنا نہ ہو اور تنا بھی ایک ہی صورت میں وجود پذیر ہوتا ہے کہ پہلے جڑ کا وجود ہو۔ یعنی جڑ ہو تو تنا اور

تنا ہوتو شاخیں، پھول اور پھل۔ مذکورہ آیت بصراحت بیان کررہی ہے کہ اسلام کی برکات وثمرات حاصل ہوتے ہیں تو اس وقت جب دنیا میں کہیں نظامِ خلافت قائم ہو۔یعنی نظامِ خلافت ہونے کا لازمی نتیجہ غلبۂ دین ہے اور غلبۂ دین ہونے کا لازمی نتیجہ اسلام کے فیوض وفوائد کا حاصل ہونا ہے۔

جب میں نے اس آیۂ کریمہ کے بیان کردہ مراحل کی روشنی میں سیرتِ رسول ﷺ کا تجزیہ کیا تو مراحل کی یہی ترتیب وہاں ملی۔مدینہ میں پہلے نظامِ خلافت قائم ہوا، پھر یہ نظام جہاں کہیں پہنچا وہیں غلبۂ دینِ حق لازماً وجود پذیر ہوا اور جہاں کہیں غلبۂ دینِ حق ہوا وہیں علاقوں کے علاقوں اور خطوں کے خطوں نے اسلام کی برکات کو جانا، چکھا اور استفادہ کیا۔سیرتِ رسول ﷺ کو مزید کھنگالنے سے مجھے یہ بصیرت بھی حاصل ہوئی کہ جب مکی دورِ نبوت میں کی گئی جدوجہد کے نتیجہ کے طور پر مدینہ میں دنیا بھر کی بڑی بڑی سلطنتوں کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم ہوکر نظامِ خلافت معرضِ وجود میں آیا تو قیامت تک جب بھی کسی نے نظامِ خلافت کو پھر قائم کرنا ہوتو وہ وہی کچھ کرے جو نبیٔ کائنات ﷺ نے مکہ میں کیا۔اس کی تفصیلات تو بعد میں آئیں گی لیکن ایک بات جس نے مجھے واپڈا کی پراجیکٹ ڈائریکٹری چھوڑنے پر آمادہ کیا، وہ رسول ﷺ کا انقطاع تھا اس نظام سے کہ جس کو وہ بدلنا چاہتے تھے۔باطل نظام کو نظامِ خلافت میں بدلنے کا مصمم ارادہ تو کرچکا تھا لٰہذا یہ کسی طور جچتا نہ تھا کہ ایک طرف تو اس نظام کا کل پرزہ بنا رہوں کہ جس کو بدلنا ہے اور دوسری طرف اسے بدلنے کی سعی کروں۔1982ء اور 1990ء کے دوران کئی دفعہ استعفاء دینے کی ٹھانی لیکن ہر دفعہ محکمانہ ساتھیوں کا اصرار اور گھریلو ضروریات اس میں آڑے آتی رہیں اس لیے کہ میرے تمام بچے اس وقت زیرِ تعلیم تھے اور برسرِ روزگار صرف میں تھا۔بالآخر ملازمت کے ابھی کئی سال باقی تھے کہ میں نے مارچ 1991ء میں ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔ملازمت چھوڑتے وقت اپنے استعفاء میں لکھا:

"Humbly I may request that till this date I have spent most of my time in pursuit of worldy gains. Now the remaining

time, if any, I intend to invest exclusively in the service of Islam."

یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ ملازمت چھوڑتے وقت کبھی یہ وسوسہ بھی دل میں آتا تھا کہ گھریلو اخراجات کیسے پورے ہونگے۔ ہمت بندھتی تھی تو درج ذیل آیۂ مبارکہ سے جسے میں اکثر گنگناتا رہتا تھا:

''جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کیلئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا......'' (نساء:100)۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر بیان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ایسا ہی ہوا جیسے کہ مذکورہ آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ جو دن بھی اس کے بعد چڑھا پہلے دن سے بہتر چڑھا اور ہر لحاظ سے یعنی جسمانی، روحانی، سماجی، معاشی اور بالخصوص حکمت وشرحِ صدری کے اعتبار سے۔

1991ء میں جب ملازمت چھوڑی تو ایک دھن اور ایک ہی لگن ذہن پر سوار تھی کہ اسی تحریک کو مقدور بھر آگے بڑھایا جائے جس کی ابتداء جدِ امجد حضرت آدمؑ سے ہوئی تھی۔ اس وقت خلافت کے حوالہ سے قابلِ ذکر کام پاکستان میں کہیں نہیں ہورہا تھا۔ حزب التحریر کی صدا کبھی کبھی کانوں میں پڑتی تھی یا پھر بھائی خورشید احمد گنگوہی صاحب نے نشست گاہ کی دیوار پر ''خلافت اکیڈمی'' (جسے ان کے کہنے کے مطابق ایک وقت پر ان کے ایک دوست نے مذاقاً ''خلافت ایک آدمی'' پڑھا تھا، یعنی اس وقت تھا ہی ایک گنگوہی جو خلافت کے حوالے سے کام کر رہا تھا) کا بورڈ چسپاں کر رکھا تھا۔ اب تو ''مرے رازداں اور بھی ہیں'' کے مصداق متعدد حلقے منزلِ خلافت کی طرف گامزن ہیں لیکن اس وقت مجھے کسی نے یہ تک کہہ ڈالا کہ ''خلافت کسی دوائی کا جنرک نام معلوم ہوتا ہے''۔

جیسے کہ اوپر ذکر ہوا ملازمت تیاگ کر کوئی نئی جماعت بنانے کا ارادہ نہ تھا، البتہ خواہش تھی کہ جو دینی جماعتیں اور افراد دینِ حق کی سربلندی کیلئے کوشاں ہیں انہیں ''کارِ قیامِ خلافت''

کی طرف لایا جائے۔ایسی تنظیموں میں سے کئی نے میرے گھر پہنچ کر کوشش کی کہ میں ان کی جماعت میں شامل ہو جاؤں۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ جو شخص اچھے بھلے عہدے کو دین کی خاطر چھوڑ کر گھر آ بیٹھا ہے' کام کا آدمی ہے۔ میں نے ان کی اس خواہش کو ایک اور طریقہ سے کیش کیا۔ میں نے بمشورہ مولانا خورشید احمد گنگوھی اور قاری عابد محمود قریشی اس وقت کی ایک معزز ہستی......سید وصی مظہر ندوی کی معاونت سے مختلف تنظیموں کے سربراہان کو ترغیب دی کہ ایک تحریکی ادارہ بعنوان ''مجلسِ خلافت'' بنایا جائے جس میں ہر تنظیم کے دو افراد کو شامل کیا جائے۔ یہ مجلس بنی۔اس کا متفقہ دستور بھی بنا۔دستور میں ان جماعتوں' تنظیموں اور اداروں کی لسٹ بھی دی گئی جو ریکارڈ کیلئے ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔کچھ افراد کو یعنی جن کی کوئی جماعت وغیرہ نہ تھی' انفرادی طور پر شامل کیا گیا:۔

نمبر شمار	تنظیم	نامزد کردہ افراد
1	تحریکِ احیائے خلافت	مفتی غلام سرور قادری (سیکرٹری)
2	تحریکِ انقلاب اسلامی	ڈاکٹر محمود الرحمٰن فیصل
3	تحریکِ خلافت	چودھری رحمت علی
		مولانا خورشید احمد گنگوہی
		عابد محمود قریشی
4	تنظیمِ اسلامی پاکستان (بطور مبصر)	ڈاکٹر عبدالخالق
		عبدالرزاق
5	جمعیت اہلحدیث پاکستان	حافظ زبیر احمد ظہیر
6	نظامِ اسلام پارٹی	مولانا وصی مظہر ندوی (کنوینر)
		معین الدین شاہ
		ڈاکٹر جہانگیر شجاع

نمبر شمار	تنظیم	نامزد کردہ افراد
7	نقشبندیہ اویسیہ (تنظیم الاخوان)	مولانا محمد اکرم اعوان' تاج رحیم
8	متحدہ علماء کونسل	مولانا ملک عبدالرؤف
9	مجلسِ تحقیق اسلامی	مولانا عبدالرحمٰن مدنی (خزانچی)
10	انفرادی طور پر	جاوید احمد غامدی
11	"	ڈاکٹر مرتضٰی حسن
12	"	ریاض الحسن نوری
13	"	سید خورشید احمد گیلانی
14	"	مولانا سیف اللہ خالد

مجلسِ خلافت کی متعدد نشستیں ہوئیں۔کوئی سال سوا سال کے بعد ٹاؤن ہال میں اس مجلس کا مشترکہ عوامی اجلاس ہوا۔اجلاس منعقد ہونے کے بعد مجلسِ خلافت بوجوہ آگے نہ چل سکی۔میں نے تو چونکہ کارِ قیامِ خلافت کو آخری سانس تک کرنے کا عزم کر رکھا تھا لہٰذا اس کو پہلے "تحریکِ خلافت" اور پھر "عالمی تحریکِ خلافت" کے عنوان سے ایک عرصہ تک جاری رکھا۔عالمی تحریکِ خلافت اپنی منزل کی طرف بھرپور انداز سے رواں دواں تھی کہ ایک موقع پر "سبق پھر پڑھ" کا کوئی شمارہ جیل میں جنرل (ر) ظہیر الاسلام عباسی صاحب کے ہاتھ لگا۔ان کے کہنے کے مطابق انہوں نے فیصلہ کیا کہ جیل سے رہائی کے بعد اس رسالے کے مدیر کو ملوں گا۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ہم دونوں میں متعدد نشستیں ہوئیں جن کے نتیجہ میں ہم دونوں نے اکٹھے ہو کر "تحریکِ عظمتِ اسلام" کے عنوان سے کارِ قیامِ خلافت کو آگے بڑھانے کا عزم کیا۔اللہ کا شکر ہے کہ یہ کام بفضل اللہ تادمِ تحریر پورے خلوص سے آگے بڑھ رہا ہے۔

رحمت علی

دارالسلام' واپڈا ٹاؤن' لاہور۔فون: 0300 - 9462188

خلافت کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟

کچھ اس کتاب کے بارے میں

خلافتِ راشدہ کے اٹھ جانے کے بعد نظامِ خلافت کو بھول جانا تاریخِ عالم کا سب سے بڑا سانحہ ہے جس کی ذمہ داری ان تمام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جو اس وقت سے لیکر آج تک اس دنیا میں آئے لیکن بحالیٔ خلافت کے کام کو کما حقہٗ نہ کر پائے۔ ایسے میں مسنون زندگی گزارنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم چین نہ لیں جب تک کہ نظامِ خلافت کو اس دھرتی کا پھر مقدر نہ بنا دیں۔ ایسا کرنے کیلئے یہ جاننا ازبس ضروری ہے کہ نظامِ خلافت ہے کیا؟ بھٹکے ہم تو کہاں؟ ذلت و خواری مسلمانوں کا مقدر بنا تو کیونکر؟ اب ہم کریں تو کیا؟ ایسے ہی سوالات کے جوابات یہ کتاب دیتی ہے بڑے مختصر لیکن بھرپور انداز میں۔

کوئی چودہ صدیاں بیت گئیں جب نظامِ خلافت کو چلتا کر کے ملوکیت نے ڈیرے آ جمائے۔ اتنا لمبا عرصہ یہ ملوک کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہے۔ اس دوران فتوحات بھی ہوئیں۔ خوشحالی کے ادوار بھی آئے۔ فلاحی و ترقیاتی کام بھی ہوئے۔ ایسا ہوا کیونکہ ایسا کئے بغیر یہ ملوک' ملوکیت کو طول نہیں دے سکتے تھے۔ اصل کام جو ان ملوک نے کیا اس لمبے عرصے میں وہ تھا دینِ حق کو مسخ کر کے دینِ ملوک کو رواں دواں کرنا۔ انہوں نے اپنے کام کا آغاز ہی نظامِ خلافت کو مسمار کر کے کیا۔ اللہ کی رحمتیں ہوں عمر بن عبد العزیزؒ پر جو اپنے دور میں پھر اللہ و رسول ﷺ کی طرف لپکا۔ صدیوں پر محیط عرصے میں باقی ملوک بضد رہے کہ خواہ کچھ ہو' نظامِ خلافت کو بحال نہیں ہونے دیں گے۔ کچھ عرصہ ان کی خوب مزاحمت ہوئی۔ خروج بھی ہوئے۔ لیکن جیسے کہ ملوکیت کا خاصہ ہوتا ہے ملوک نے ہر مزاحمت کو بے دردی سے کچلا۔ خانوادۂ رسول ﷺ کو تہِ تیغ کرنے سے بھی نہ چوکے۔ کئی علمائے امت کو جیلوں میں ڈالا' ان پر کوڑے برسائے۔ پہلے بنو امیہ پھر بنو عباس پھر عثمانی غرضیکہ صدیوں پر محیط موروثی بادشاہتوں کو جاری و ساری رکھا تو اس حد تک کہ مثال کے

طور پر ہارون الرشید نے پوری اسلامی دنیا اپنے دو بیٹوں میں آدھی آدھی یوں تقسیم کردی جیسے کہ یہ اس کی ذاتی ملکیت ہو۔ بعد میں مامون الرشید نے امین الرشید کو قتل کیا۔

طاقت کے بل بوتے پران باغی ملوک نے نہ صرف اس خلافت کا قلع قمع کیا کہ جس کو نبیٔ کائنات علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوںؓ نے تیئس سالہ دورِ نبوت میں محنتوں' مشقتوں' اور قربانیوں سے استوار کیا تھا بلکہ یہ خود کو خلیفہ کہلواتے رہے اور عندیہ دیتے رہے کہ خلافت بس یہی ہے جسے وہ رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا جرم یہی کہ انہوں نے دینِ حق ہی کو نہ بدلا تاریخ کو بھی بدلا۔

یہ کتاب بتاتی ہے کہ وہ خلیفہ نہیں تھے' غاصب تھے جنہوں نے خلیفۃ المسلمین کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کئے گئے حقِ حکمرانی کو چھینا۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ انہوں نے دینِ اسلام سے نہ صرف خلیفۃ المسلمین کو نکالا بلکہ ان اداروں کو بھی جنہیں قرآنِ مجید اولوالامر' امت اور شوریٰ کا نام دیتا ہے اور جو معرضِ وجود میں رہتے ہیں تو صرف اس وقت جب خود خلیفۃ المسلمین کا وجود موجود ہو۔ یعنی انہوں نے دینِ حق کو دینِ ملوک کی شکل دی۔ جس دین کو آج ہم اختیار کئے ہوئے ہیں یہ دینِ حق نہیں' دینِ ملوک یا بے دینی کی ایک شکل ہے۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ دورِ خلافتِ راشدہ کے مسلمانوں کو جو ثمرات و برکات حاصل تھے' وہ آج ہم کو کیوں حاصل نہیں؟ کیوں ایسا ہے کہ اس وقت عدل تھا' آج ظلم' اس وقت امن تھا' آج بدامنی' اس وقت خوشحالی تھی' آج سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بدحالی' اس وقت اتحاد تھا' آج انتشار اور اس وقت غلبۂ دینِ حق تھا آج مسلمانانِ عالم مغلوب و مجبور۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ 1924ء کو ''سقوطِ خلافت'' نہیں' ٹوٹی پھوٹی اور علامتی مرکزیت کا سقوط ہوا تھا سقوطِ خلافت تو اس وقت ہوا جب دورِ خلافتِ راشدہ کو چلتا کر کے یہ ملوک برسرِ اقتدار آئے تھے۔

امت روایات میں کھو گئی۔ کچھ لوگ 1924ء کو ''سقوطِ خلافت'' کا سال قرار دینے پر مصر ہیں شاید اس لیے کہ انہوں نے کہیں کتابوں سے ایسا ہی پڑھا ہے۔ اصل میں ایسا یہ نادان

کرتے ہیں تو اس لیے کہ ان کا تصورِ خلافت ناقص ہے۔ اس موقع کو ''سقوطِ خلافت'' قرار دینے کا مطلب پورے دورِ ملوکیت کو دورِ خلافت قرار دینا ہے۔ حماقت سے ان حضرات نے خلافت کو ''لنڈا بازار'' سمجھ لیا' کاش یہ جانیں کہ خلافت وہ ارفع و اعلیٰ مقام ہے کہ جس کے سامنے فرشتے سجدہ ریز ہوئے۔ یہ حرم بسانے اور اقتدار کی خاطر بھائی بندوں کو قتل کرنے کا دور ''دورِ خلافت'' نہیں دورِ بغاوت تھا۔ کتاب ھذا صدیوں بعد دبیز پردوں کو چاک کر کے حقائق کو پیش کرتی ہے۔

قاری کی سہولت کیلئے اس کتاب کو ضمیمہ کے علاوہ درج ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1- خلافت کیا' کیوں اور کیسے؟

2- برکاتِ خلافت

3- نظام ہائے خلافت

اس کتاب میں کچھ حقائق کا ذکر مکرر نظر آئے گا۔ ایسا ہے تو ایک تو ان کی اہمیت کے پیشِ نظر اور دوسرے سیاق وسباق کی مانگ ہی ایسی تھی۔ قرآنِ مجید میں بھی کئی امور کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے تو ان کی اہمیت کے پیشِ نظر۔ تدریس وتبلیغ کی سہولت کے پیشِ نظر چند ابواب کو لیکچروں میں بھی تقسیم کیا گیا ہے۔ فہمِ دین کی خاطر اس کتاب کا ہر گھر میں ہونا سودمند ہوگا۔ پڑھے لکھے اپنے اَن پڑھ بہن بھائیوں کو اس کے مندرجات سے آگاہ کریں۔ فہمِ دین ہی پر دنیا و آخرت کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ بیٹے ال عمران اور بیٹی سلمیٰ کی معاونت اس کتاب کی تیاری میں بڑی ممد ومعاون رہی ہے۔ بیٹی شفقت' بیٹی ثروت' بیٹی صدف' بیٹے عرفان اور بیٹے عثمان کی کاوشوں کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کو اجرِ عظیم عطا کرے۔

قارئین کرام! آپ نے سرورق پر ''بابائے خلافت'' کے الفاظ ملاحظہ فرمائے ہیں۔ یہ الفاظ راقم کو کسی مصلحت کی خاطر مجبوراً لکھنے پڑے ہیں.............راقم

لیکچر نمبر 1

مقصدِ تخلیقِ آدم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اکرم المخلوقات بنایا ہے۔ اتنی عظمت دی ربِ کائنات نے اس خاک کے پتلے کو کہ ہر دوسری مخلوق کو اس کیلئے مسخر کر دیا۔ قرآن میں آیا:

''وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں'' (بقرۃ: 29)۔

ایک اور جگہ اسی حقیقت کو مزید کھول کر بیان کیا گیا۔ فرمایا:

''اللہ وہی تو ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے۔ جس نے کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ سمندروں میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگا تار چلے جا رہے ہیں۔ اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تمہیں درکار تھا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے'' (ابراہیم: 32-34)۔

کس قدر عظیم عطا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دوسری مخلوق کو انسان کیلئے صرف مسخر ہی نہیں کیا بلکہ نافع بھی۔ انسان کی ہر فطری ضرورت پوری کی۔ دوسری اشیاء کو اللہ پاک نے بنایا ہی ایسا ہے کہ جو انسانی بقاء اور ارتقاء کیلئے ضروری ہے۔ انسان مرغی پکڑتا ہے' ذبح کرتا ہے اور کھا جاتا ہے۔ گھوڑے کو لگام دے کر سوار ہو بیٹھتا ہے۔ دریاؤں کے رخ موڑ کر پانیوں کو من مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ ہوا اور اس کی حرکت کو جیسے چاہے اپنے لیے سازگار بنا لیتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا لاڈلا اور اشرف کیوں ہے؟ دوسرے لفظوں میں ہر دوسری مخلوق جب انسان کیلئے پیدا کی گئی ہے تو انسان کس کام اور مقصد کیلئے پیدا کیا گیا ہے؟ مقصدِ

تخلیقِ آدم ہے کیا؟ ظاہر ہے وہ کام بھی اسی طرح انوکھا اور افضل ہونا چاہیئے جس طرح یہ مخلوق یعنی انسان انوکھا اور افضل پیدا کیا گیا ہے۔

پیشتر اس کے کہ ہم اس مقصد کو بیان کریں کہ جس کیلئے انسان پیدا کیا گیا ہے اس حقیقت کا ذکر ضروری ہے کہ جس قدر یہ اہم ہے کہ انسان جانے کہ اسے کس مقصد کیلئے پیدا کیا گیا ہے اتنا ہی انسانوں کی اکثریت مرنے تک یہ نہیں سوچ پاتی کہ اس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ انسانوں کی ایک معتدبہ اکثریت دنیا میں آتی ہے اور اپنی تخلیق کا مقصد جانے بغیر واپس اپنے رب کے ہاں لوٹ جاتی ہے۔ ظاہر ہے وہ تمام انسان جو نادانی میں اپنی زندگی کا پورا عرصہ گزار کر اپنے رب کے حضور پیش ہونگے تو وہ خود گنجائش پیدا کریں گے کہ ان کے خلاف کاروائی کی جائے گو وہ بصورتِ دیگر (Otherwise) کئی کارہائے نمایاں ادا کر کے گئے ہونگے۔ بزعمِ خویش بڑی بھرپور اور کامیاب زندگی گزار کر اللہ کے ہاں لوٹے ہوں گے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ فرض کریں لاہور میں واقع کوئی محکمہ اپنے کسی اہل کار کو کراچی بھیجتا ہے کہ فلاں سرکاری کام کر کے آئے۔ اہل کار کراچی جاتا ہے' خوب سیر سپاٹے اور خرید و فروخت کرتا ہے۔ اپنے رشتہ داروں سے ملاقاتیں کرتا ہے لیکن وہ کام نہیں کرتا جس کو کرنے کیلئے محکمے نے اسے کراچی بھیجا تھا۔ واپس لاہور آتا ہے۔ ظاہر ہے وہ نادان اہل کار خود محکمے کو موقع فراہم کرتا ہے کہ اس کے خلاف انضباطی کاروائی کرے۔ اللہ تعالیٰ کو موقع فراہم کرنے اور محکمے کو موقع فراہم کرنے میں' البتہ' زمین و آسمان کا فرق ہے۔ محکمے کو ایک دفعہ ناراض کر کے وہ اہل کار پھر اپنی اچھی کارکردگی سے محکمے کا نورِ نظر بن سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو ناراضگی کا موقع فراہم کر کے اللہ کے ہاں واپس جانے والے کو دوبارہ کبھی موقع نہ ملے گا کہ وہ بہتر کارکردگی سے اب کی بار اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ اس کو جو سزا ملے گی اس کی ابتدا تو ہوگی' انتہا کبھی نہیں۔

مقصدِ تخلیقِ آدم کیا ہے؟ قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر مختلف انداز میں اس کا ذکر آیا ہے۔ سورۂ ذاریات کی ایک چھوٹی سی آیۂ مبارکہ میں' البتہ' اس کا دوٹوک' حتمی اور پرزور ذکر آیا ہے۔ فرمایا گیا:

''ہم نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی مقصد کیلئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت

کریں''(ذاریات:56)۔

اللہ تعالیٰ اسے یوں بھی بیان کر سکتے تھے کہ میں نے جن اور انسان کو اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے لیکن ''سوائے اس کے'' کا ذکر کر کے مقصدِ تخلیقِ آدم کو اٹل، حتمی اور حقیقت میں بڑا ہی واضح اور پرزور کر دیا گیا ہے۔

اس آیۂ مقدسہ کو پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں ایک تعجب انگیز تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عبادت کا جو مفہوم معروف ہے وہ بس نماز، روزے، حج، زکوٰۃ، تسبیحات و مناجات اور اسی قبیل کے دوسرے مراسمِ عبودیت تک محدود ہے۔ بلکہ محض ''عبادت'' سے تو یہ تاثر ابھرتا ہے کہ دنیا داری کا کوئی کام نہ کیا جائے۔ مصلیٰ ہو، تسبیح ہو اور گوشۂ تنہائی میں بس اللہ اللہ۔ اسلام یوں ''تارک الدنیا'' ہونے کے تصور کی جڑ کاٹ دیتا ہے یہ اعلان کر کے کہ ''لا رہبانیۃ فی الاسلام''۔ اسلام میں رہبانیت جیسی کوئی شئے نہیں۔ اسلام ایک متحرک و مستحکم دین ہے۔ وہ تسخیر کائنات و تعمیر انسانیت اور تدبیر منزل کا درس دیتا ہے۔ قرآنِ مجید میں دین کی اصطلاح اکثر و بیشتر استعمال ہی ''نظام'' کے معنی میں ہوئی ہے۔ اسلام کا راستہ زندگی کے عین منجدھار سے گزرنے کا راستہ ہے۔ اکاس بیلی، یعنی وہ افراد جن کا گزر اوقات دوسروں کی کمائی پر ہو، کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ پوپ، پادری، پریسٹ، پنڈت، پروہت، پجاری، وغیرہ جیسی تن آسان اور زندگی سے فرار اختیار کرنے والی ہستیوں یعنی جن کے مذہبی تخلص کی ابتدا لفظ ''پ'' سے شروع ہوتی ہے کی اسلام شدت سے نفی کرتا ہے۔ کیا خوب ترجمانی کی علامہ اقبالؒ نے جب فرمایا:

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ حق، مردانِ خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس عبادت کا کیا مفہوم ہے جو مقصدِ تخلیقِ آدم اور بالآخر انسان کی مغفرت و نجات کا باعث بنتا ہے۔ قرآن و سنت کی رو سے درج ذیل تین نمایاں مفاہیم ہیں قرآنِ مجید کی استعمال کردہ ''عبادت'' کی اصطلاح کے۔ پہلا مفہوم وہی ہے جو عام فہم یعنی

ارکانِ اسلام......نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی، ان فرائض کا وقفے وقفے سے دہراتے رہنا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں یعنی ان انسانوں کیلئے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں، لازم قرار دیا۔ ان کی ادائیگی کے بغیر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنا محض خود کو فریب دینا ہے۔ یہ چاروں فرائض اسلام کے ستون ہیں۔ نماز کو تو خود نبی رحمت ﷺ نے ''عماد الدین'' قرار دیا۔ لیکن وہ عبادت جو مقصدِ تخلیقِ آدم ہے محض ان فرائض کی ادائیگی سے پورا نہیں ہوتا۔ محض عبادت کے لیے تخلیق کا مطلب تو یہ ہے کہ سنِ شعور سے لیکر آخری سانس تک ایک انسان کا ہر لمحہ بلکہ لمحے کا بھی کروڑواں حصہ عبادت کے بغیر نہ گزرے۔ مثال کے طور پر اگر نماز کو لیں تو پانچوں نمازوں کی ادائیگی زیادہ سے زیادہ دو گھنٹوں میں ہو جاتی ہے۔ تو پھر اس سے یعنی دو گھنٹے عبادت اور باقی بائیس گھنٹے غیر عبادت میں گزارنے سے تو مقصدِ تخلیقِ آدم پورا نہیں ہوتا۔ پورا ہوتا ہے تو صرف ایک ہی صورت میں کہ ایک انسان کا ہر لمحہ ''من الصالحین'' اور ''مع الصادقین'' کی سطح کا گزرے۔ ایسا ہونا ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ انسانی جسم کوئی ہزاروں اعضاء پر مشتمل ہے۔ ان اعضاء میں سے جب بھی کوئی عضو حرکت کرتا ہے تو نیکی کا کام ہو رہا ہوتا ہے یا گناہ کا، تیسری کوئی چیز نہیں۔ جب بھی زبان، آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ میں سے کوئی ایک عضو یا مل کر تمام اعضاء حرکت کرتے ہیں تو نتیجہ کے طور پر نیکی سرزد ہو رہی ہوتی ہے یا برائی، تیسری کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے صرف عبادت کیلئے پیدا کیے جانے کا مطلب ہے کہ سنِ شعور سے لیکر آخری سانس تک جب بھی انسان کا کوئی عضو حرکت کرے نیکی کیلئے کرے، برائی کیلئے کبھی نہیں۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت کہ جب بھی کوئی عضو نیکی کیلئے حرکت کرتا ہے تو متوازاً قرآن وسنت کے کسی نہ کسی حکم کی پیروی ہو رہی ہوتی ہے اور جب بھی یہ عضوی حرکت گناہ کا ارتکاب کر رہی ہوتی ہے تو متوازاً شریعت کے کسی نہ کسی حکم کی نافرمانی ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نیکی ہی نیکی کرنے والا مومن اس لیے چلتا پھرتا قرآن ہوتا ہے کہ اس کا سونا، اس کا جاگنا، اس کا غسل کرنا، اس کا وضو کرنا، اس کا کھانا، اس کا پینا غرضیکہ اس کا ہر ہر فعل قرآن وسنت کے مطابق ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے، فرمایا:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

پھر جس طرح ایک انسانی عضو سے سرزد ہونے والا عمل نیکی ہوتا ہے یا گناہ' اسی طرح ایک انسان سے سرزد ہونے والا کوئی کام (Job) بھی ایک طرح سے کیا جائے تو نیکی بن جاتا ہے اور دوسری طرح سے کیا جائے تو وہی کام گناہ کا کام بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جج ہو سکتا ہے کسی کیس کی تہ تک پہنچنے کے لیے تین سال لگا دے۔ اس دوران ظاہر ہے اسے شواہد و قرائین سے ہی اندازہ لگا کر کیس کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے' خود تو بالفعل وہ موقع پر موجود نہیں ہوتا۔ اگر وہ جج سماعت کا یہ کام پوری لگن' دیانتداری اور جانفشانی سے کرتا ہے تو فیصلے کی پھر بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں یعنی فیصلہ غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ اگر فیصلہ صحیح ہو جائے تو جج کو دوہرا ثواب حاصل ہوتا ہے اور اگر فیصلہ غلط ہو جاتا ہے تو شریعت کہتی ہے کہ اس کو اکہرا ثواب ضرور ہوگا۔ ہر دو صورتوں میں اس جج کا اس کیس میں لگایا ہوا تین سال کا متعلقہ وقت بطور ''عبادت'' شمار ہوگا۔ لیکن وہی جج اسی کیس کا فیصلہ سناتے وقت کسی دوست' رشتے دار وغیرہ کی سفارش پر یا رشوت وصول کر کے ڈنڈی مار جاتا ہے تو وہی وقت جو تین سالوں میں اس نے اس کیس پر صرف کیا اس کے نامۂ اعمال میں بطور گناہ درج کیا جاتا ہے۔ ذرا سادہ معاملہ لیں تو مثال کے طور پر ایک کاشتکار صبح اٹھتا ہے۔ اپنے کھیت پہنچ کر اپنی فصل کاٹتا ہے۔ گھر لا کر کترتا ہے اور جانوروں کو کھلاتا ہے تو جتنا وقت اس نے اس کام میں لگایا بطور نیکی شمار ہوگا۔ بصورتِ دیگر یعنی فصل کاٹتے وقت وہ اپنے کھیت کی کاٹی ہوئی فصل کے ساتھ پڑوسی کے کھیت سے پڑوسی کی فصل کاٹ کر شامل کر لیتا ہے تو وہ پورا وقت جو اس پورے کام میں اس نے لگایا بطور گناہ شمار ہوگا۔ غرضیکہ انسان سے سرزد ہونے والا کوئی بھی کام اگر جائز طریقہ (قرآن وسنت کے مطابق) سے کیا جائے تو نیکی ہوگا اور اگر ناجائز طور سے کیا جائے تو بدی ہوگا' تیسری کوئی چیز نہیں۔ محض عبادت کیلیے پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جائز طریقے سے نیکی کیلئے ہو' ناجائز طریقے سے بدی کیلئے کبھی نہ ہو۔

سورۂ ذاریات کی مذکورہ آیۂ مبارکہ پڑھنے سے ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں صرف دو مخلوقات یعنی جن اور انسان کا ذکر ہے۔ اس سے کیا یہ مطلب لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو ان دو مخلوقات سے عبادت مطلوب ہے باقی کروڑوں مخلوقات سے نہیں۔ عبادت تو یقیناً ہر مخلوق کی درکار ہے بلکہ قرآن بار بار اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان میں موجود ہر مخلوق

ہر لمحہ ہر آن محوِ عبادت ہے۔ تسبیح و مناجات میں مصروف ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے۔

مذکورہ آیۂ کریمہ میں صرف دو مخلوقات کا ذکر کیا گیا' باقی کا نہیں تو اس لیے کہ ان دو مخلوقات بالخصوص انسان کی حیثیت دوسری تمام مخلوقات سے یکسر مختلف ہے۔ انسان (اور کسی حد تک جن) کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقررہ مدت تک نہ صرف صوابدیدی اختیارات دے رکھے ہیں بلکہ دوسری بہت سی صلاحیتیں اور اہلیتیں بھی عطا کر رکھی ہیں جو دوسری مخلوقات کو حاصل نہیں۔ یعنی انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار و ارادہ کی صلاحیت ودیعت کر رکھی ہے کہ وہ چاہے تو نیکی کرے اور چاہے تو بدی۔ چاہے تو اللہ تعالیٰ کو بھی مانے اور چاہے تو نہ مانے۔ سورج' چاند' پانی' ہوا وغیرہ میں یہ صلاحیت ہے ہی نہیں۔ دوسری مخلوقات بے چون و چرا پابند ہیں اس کام کے کرنے کی جو اللہ تعالیٰ نے ازل سے ان میں سے ہر ایک کو تفویض کر رکھا ہے۔ سورج کو مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے روشنی اور گرمی مہیا کرنے کا کام دے رکھا ہے۔ سورج کی کیا مجال کہ وہ دیئے گئے کام سے بال برابر بلکہ بال کا کروڑواں حصہ بھی انحراف کرے۔ وہ نہیں کر سکتا کہ کسی دن نہ چڑھے اس لیے کہ اس کی طبیعت ناساز ہے یا یہ کہ وہ کسی ورکشاپ میں زیرِ مرمت ہے۔ وہ دیئے گئے کام سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا اور اس کا ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے اس کام کو کئے جانا ہی اس کی عبادت ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو عبث اور بے فائدہ یا بے مقصد پیدا نہیں کیا خواہ وہ مخلوق چھوٹی سے چھوٹی بمثل بکٹیریا ہو یا بڑی سے بڑی بمثل آسمان ہو' انسان کو بھی کیا کوئی کام دے رکھا ہے اور اگر دے رکھا ہے تو وہ کام ہے کیا؟ ظاہر ہے انسان کو دیا جانے والا کام افضل بھی ہو گا اور عظیم بھی اس لیے کہ یہ مخلوق نہ صرف شرف و افضلیت کی حامل ہے بلکہ دوسری ہر مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہی ایسا ہے کہ جو انسانی ضرورت کے عین مطابق اور موزوں ہو۔ ایسا ہی ہے' ربِ کائنات نے انسان کو زمین میں کرنے کا کم و بیش وہی کام دے رکھا ہے جو خود ربِ کائنات باقی کائنات میں براہِ راست کر رہا ہے۔ وہی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت جو باقی کائنات میں براہِ راست جاری و ساری ہے' اللہ تعالیٰ کے طے کردہ پروگرام کے مطابق زمین میں انسان کے

ذریعہ سے نافذ کرنا مطلوب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کے آغاز ہی میں یعنی سورۂ بقرۃ کے چوتھے رکوع میں جہاں فرشتوں کو عندیہ دیا ہے کہ وہ زمین میں خلیفہ بنانے والا ہے رکوع کے اختتام سے پہلے یعنی اس رکوع کی آخری آیت میں نہ صرف کارِخلافت کا بھی ذکر کیا ہے بلکہ اس کی نوعیت کا بھی۔ فرمایا:

''ہم نے کہا کہ ''تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر میری طرف سے جو ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کیلئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے''۔

اس آیۂ مبارکہ میں ایک تو اس کام کی وضاحت ہوگئی جو انسان نے زمین میں کرنا ہے یعنی دنیا میں ہدایت الٰہی کے مطابق نظام کا قیام اور دوسرے اس امر کی وضاحت کہ انسان کو ارادہ و اختیار (Discritional Powers) کی صلاحیت حاصل ہے۔ چاہے تو وہ الٰہی قوانین نافذ کرے، جس صورت میں وہ کامیاب قرار پائے گا اور چاہے تو وہ آسمانی ہدایت کو ٹھکرا دے جس صورت میں وہ ایسی آگ میں ڈالا جائے گا جو کبھی بجھنے والی نہیں۔ یہ بھی اس آیت سے عیاں کہ جب وہ اپنا نظامِ زندگی الٰہی قوانین کے مطابق استوار نہ کرے گا تو پھر اپنے خودساختہ قوانین نافذ کرے گا اس لیے کہ بہرصورت اس نے زندگی تو اس دنیا میں گزارنی ہے۔ کارِخلافت یعنی وہ کام جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو تفویض کیا ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یہ کہ ''زمین پر انسانوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین کی حکومت'' اور اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو بس ''خلافت''۔ اس جملے کے پہلے حصے میں تین اہم پالیسی امور بیان کیے گئے۔ ایک تو یہ کہ ایسی اللہ تعالیٰ کی بالواسطہ حکومت صرف ایک کرہ یعنی کرۂ ارض پر ہے باقی کرّات پر نہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی حکومت براہِ راست ہے۔ دوسرے یہ کہ ظاہر ہے کہ جس کا بنایا ہوا قانون نافذ ہو حکومت اسی کی ہوتی ہے لہٰذا زمین پر بھی اللہ تعالیٰ ہی کی حکومت ہے اس لیے کہ حاکمیت صرف ایک اسی ہستی کو سزاوار ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حکومت معرضِ وجود آتی ہے تو صرف اس صورت میں کہ دنیا میں الٰہی قانون نافذ ہو۔ جملے کے دوسرے حصے میں ایسی حکومت کو خلافت کے نام سے

موسوم کیا گیا ہے تو اس لیے کہ اصل حاکم غیب میں ہے' اللہ تعالیٰ خود زمین پر حکمرانی کوئی اپنا دفتر کھول کر نہیں کر رہا۔

قرآنِ مجید مزید پتہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ قیامِ خلافت کا کام بطور امانت دے رکھا ہے۔ بلکہ پیشکش ہونے پر انسان نے اس عظیم کام کو کرنے کا برضا و رغبت بیڑا خود اٹھایا ہے۔قرآنِ مجید میں آیا:

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کیلئے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے''۔(احزاب:72)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ کام ہی بطور امانت نہ دیا بلکہ وہ صلاحیتیں (Faculties) اور سہولتیں (Facilities) بھی بطور امانت عطا کیں جن کو دیئے بغیر وہ اس قابل ہی نہ ہوسکتا تھا کہ وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کا کام سرانجام دیتا۔ان صلاحیتوں اور سہولتوں کو عطا کرنے کا ذکر بھی الکتاب میں آیا۔فرمایا گیا:

''جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا ''میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں' پھر جب میں اس کی نوک پلک ٹھیک کر دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ''(ص:72)۔

اس آیۂ مبارکہ اور سورۂ احزاب کی مذکورہ آیتِ مقدسہ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے انسان ایک عام سی مخلوق تھی اس لیے کہ شروع میں ہی انسان اگر اشرف المخلوقات ہوتا تو دوسری مخلوقات کو کارِ خلافت کی پیشکش کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جب آفر ہونے پر انسان نے خود اس بارِ امانت کو اٹھالیا تو پھر یہ ''نوک پلک ٹھیک کرنے'' کا مرحلہ آیا۔نوک پلک ٹھیک کرنے میں کیا کیا گیا' وہی کہ انسان کو بولنے' سمجھنے' سوچنے' تمیز کرنے' فیصلہ کرنے کی صلاحیتیں دیں۔اختیار و ارادہ کی صفت صرف ربِ کائنات کو سزاوار ہے۔جب اللہ ہی کی حکومت کو زمین پر قائم کرنے کا بیڑا انسان نے اٹھالیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ''نفخت فیہ من روحی'' کی شکل میں اسی اختیار و ارادہ کی صفت کا کچھ پرتو انسان میں ودیعت فرمایا۔اس قدر عز و شرف انسان کو عطا کرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے

فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ انسان کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں تو غالباً یہ وہ سجدہ نہ تھا جو ہم انسان یا دوسری مخلوقات اللہ کے حضور کرتی ہیں۔ دراصل دنیا و آخرت میں کیے جانے امور کی نگرانی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو دے رکھی ہے (مدبراتِ امرا)۔ تو ان نگرانوں کو اللہ تعالیٰ نے جب انسان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کو کہا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہر وہ چیز جو ان نگران فرشتوں کی نگرانی میں ہے انسان کیلئے مسخر ہے۔ لہٰذا اب وہ کوئی مزاحمت کرنے کی بجائے خود بھی انسان کیلئے مدد ومعاون بن جائیں تا کہ انسان روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکومت کرنے کا فریضہ بطریقِ احسن ادا کر سکے۔

یہ تمام سہولتیں اور اہلیتیں عطا کرنے کے بعد ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور سہولت کا مہیا کرنا ضروری تھا۔ یہ سہولت تھی اللہ تعالیٰ کے ان قوانین وفرامین کی فراہمی کی کہ جن کو نافذ کر کے ہی کارِ خلافت کی تکمیل ہو سکتی تھی۔ ان قوانین وفرامین کو ایک ہی وقت میں انسانیت کے سپرد نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے کہ پوری انسانی تاریخ پر تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں وقتاً فوقتاً ترمیم وتبدیلی ناگزیر تھی۔ بنابریں ضروری تھا کہ پوری انسانی تاریخ پر آسمانی کتابوں کا نزول اور انبیاءؑ کی بعثت اس وقت تک ہوتی رہتی جب تک کہ دینِ حق کی حتمی اور آخری تکمیل نہ ہو جاتی اور سلسلۂ تنزیلِ کتب اور بعثتِ انبیاءؑ کو منقطع نہ کر دیا جاتا۔ ایسا ہی ہوا اور اس ساری حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور شیطان کو زمین پر بھیجنے کے آخری مرحلے جیسا کہ بقرۃ:29 میں بیان ہوا بصراحت واضح کر دیا۔

نتیجہ نکلا اس پہلے لیکچر کی گفتگو کا تو یہ کہ مقصدِ تخلیقِ آدم عبادت ہے۔ عبادت کے تین مفاہیم ہیں اور ان تینوں مفاہیم کے اعتبار سے عبادت کا مقصد پورا ہوتا ہے تو ایک اس صورت میں کہ دنیا میں نظامِ خلافت قائم ہو۔ بنابریں مقصدِ تخلیقِ آدم ٹھہرا...... قیام ودوامِ خلافت۔ وہ شخص جو اس دنیا کی زندگی میں قیامِ خلافت کے کام کو سرانجام نہیں دیتا' مقصدِ تخلیقِ آدم سے بے بہرہ رہ کر زندگی گزارتے ہوئے اپنے رب کے پاس لوٹتا ہے جو انتہائی خسارے کا سودا ہے۔ ہر فرد نے دنیا میں ایک ہی بار آنا ہے' دوسری بار کبھی نہیں۔

لیکچر نمبر 2

اسبابِ زوالِ امت

ربِ کائنات نے جو ذرائع اور قدرتی وسائل مسلمانوں کو دے رکھے ہیں' کسی دوسری قوم کو نہیں دیئے۔ محلِ وقوع ایسا کہ روس' چین' امریکہ' آسٹریلیا وغیرہ جیسے ممالک کو تو اللہ تعالیٰ نے قطبین اور جانبین میں پھینک رکھا ہے جب کہ اسلامی دنیا کرۂ ارض کے عین وسط میں۔ دنیا بھر کی بری' بحری' فضائی شاہراہئیں دنیائے اسلام ہی سے گزرتی ہیں۔ تقریباً تمام درے اور آبی گزرگاہیں اسلامی دنیا میں واقع ہیں۔ آب وہوا جو مسلمان دنیا کو عطا کی گئی ہے تو ایسی کہ سورج ہر وقت اسلامی دنیا میں کہیں نہ کہیں چمکتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر موسم کی اجناس' سبزیاں اور پھل وقت کے کسی بھی موڑ پر' کہیں نہ کہیں اسلامی دنیا میں دستیاب ہوتے ہیں۔ افرادی قوت اتنی کہ دنیا میں ہر چوتھا آدمی مسلمان ہے۔ سرمائے کی وہ فراوانی کہ دنیا بھر کے کارخانے' فیکٹریاں اور بینک اوپیک ممالک کی دولت کے مرہونِ منت ہیں۔ معدنی وسائل بالخصوص معدنی تیل کے ذخائر تو ایسے جیسے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر مسلمان سرزمینوں میں موجزن ہے۔ سندھ طاس اور نیل ڈیلٹا جیسے عظیم نہری منصوبے مسلم دنیا میں واقع ہیں اور سب سے بڑھ کر قرآن وسنت جیسے ہدایت کے عظیم سرچشمے اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کی تحویل میں دے رکھے ہیں۔

بایں ہمہ مسلمان ہیں آج کی دنیا میں پستی وگراوٹ کی اتھاہ گہرائیوں میں سرگرداں۔ شاذونادر ہی کوئی دوسری قوم اس قدر ذلت ومسکنت سے دوچار ہے کہ جتنی امتِ مسلمہ۔ اس وقت بلکہ ایک لمبے عرصے سے دنیا کی قیادت کفار ومشرکین کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا میں غلبہ شر کا ہے۔ اس لیے کہ ڈرائیونگ سیٹ پر کفر براجمان ہے۔ دنیا کی پنچائت اقوامِ متحدہ میں پانچ ممالک ویٹو پاور کے حامل ہیں چراغ لیکر ڈھونڈیں ان میں ایک بھی مسلمان ملک نہیں۔ تقریباً پانچ درجن مسلم ممالک اگر تمام کے تمام کوئی قرارداد پاس کرلیں' ویٹو بہادر کی ایک ٹھوکر اس کی دھجیاں بکھیر دیتی

ہے۔ جہاں کہیں دنیا میں جنگ ہو رہی ہے سب مسلمان سرزمینیں ہیں۔ کفار و مشرکین کی پروردہ خواہش ہے کہ مسلمانوں کو ان کی اپنی زمینوں پر تہہ تیغ کیا جائے۔ ارزانی ہے دنیا میں تو خونِ مسلم کی اور ویرانی ہے تو عصمتِ مسلم کی۔ روتے بچے، چیختی عورتیں، صبح و شام اٹھتے جنازے، اجتماعی قبریں مقدر ہے تو صرف مسلمانوں کا۔ اغیار کا داؤ لگ گیا مسلمانوں کو لڑا کر ان کے وسائل لوٹنے کا۔ سچ کہا علامہؒ نے:

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑا اس باغ میں گلچیں
تری قسمت کو رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

مسلمانوں کی بے بسی و بے کسی اور بے حسی و بے مائیگی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کے جیتے جی اہانت کی جا رہی ہے عظیم تر کتاب...... قرآنِ مجید کی اور عظیم تر پیغمبر...... نبی کائناتﷺ کی لیکن ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان کسی گستاخ کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ کہاں وہ مقام کہ امتِ مسلمہ کو اللہ تعالیٰ نے ''خیرِ امت'' اور ''امتِ وسط'' جیسے عظیم القابات سے نوازا اور کہاں یہ مقام کہ امتِ مسلمہ فٹ پاتھ پر پڑے تربوز کے چھلکے کی حیثیت اختیار کر گئی کہ اسے چلنے والے عام راہرو ٹھوکر مار کر جی چاہے تو دائیں پھینک دیں اور جی چاہے تو بائیں، صبح و شام بیچارا چھلکا بے رحم ٹھوکروں کے رحم و کرم پر۔ سوال پیدا ہوتا ہے یہ المناک و اندوہناک صورتِ حال پیدا ہوئی ہے تو کیوں؟ بربادئ مسلم کے اسباب ہیں تو کیا؟

کوئی اٹھتا ہے تو مسلمانوں کے زوال کی وجہ ٹیکنالوجی میں کمی قرار دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے ہاں ٹیکنالوجی کا فقدان ہے۔ مسلم دنیا میں کوئی ہوائی اڈا معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا جب تک کہ بنے بنائے ہوائی جہاز امپورٹ نہ کیے جائیں۔ اور تو اور کسی مسلمان کی کلائی اس وقت تک نہیں سج سکتی جب تک کہ گھڑی دساور سے بن کر نہ آئے۔ 1967ء میں دشمن نے متعدد عرب علاقے چند دنوں کی معمولی مزاحمت کے بعد ہتھیا لیے۔ وجہ یہ تھی کہ عربوں کے پاس اپنے دفاع تک کیلئے اسلحہ کے انبار دشمن ہی سے حاصل کردہ تھے جو محض کباڑیئے کا مال تھا۔

اسی طرح کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ مسلمانوں کے ہاں شرحِ خواندگی کم ہے اور یہ بھی بہت حد تک درست ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد کا فقدان ہے۔ کفار و مشرکین متحد ہیں جب کہ اسلام والے منتشر۔ یہ بھی درست ہے۔ غرضیکہ متعدد آراء مسلمانوں کی موجودہ پستی و زوال کی لیکن ہمارے ہاں یہ کم ہی شعور ہے کہ یہ جتنے اسباب بیان کیے جاتے ہیں اصل میں اسباب نہیں نتائج ہیں زوال کی اس وجہ کے جو سوختہ بختی او جھل ہے' مسلمانوں کو اس کا شعور تک نہیں۔ یعنی مسلمانوں کی ذلت و خواری اور پستی و زوال کا صرف ایک سبب ہے' اسباب ہیں ہی نہیں۔ صرف ایک وجہ ہے وجوہات ہیں ہی نہیں۔ اے کاش! مسلمان اس ایک سبب سے آگاہ ہوتے لیکن شواہد و قرائین ببانگِ دہل بتا رہے ہیں اور یہ ایک عظیم المیہ ہے کہ مسلمانوں کا زوال صرف ایک وجہ سے اور مسلمان ہیں کہ اس ایک وجہ سے بے بہرہ و نا آشنا۔

وہ ایک وجہ یہ ہے کہ اس دین میں جو رسول ﷺ امت کے سپرد کر کے گئے تھے اور آج ہمارے اختیار کردہ دین میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دورِ خلافتِ راشدہ کے بعد کوئی چودہ سو سال سے ہمارے ہاں ملوکیت نے ڈیرے جما رکھے ہیں۔ ملوک اس دوران کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہے۔ وہ قرآنِ مجید میں تو کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ اس کے تحفظ کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے لیکن مقدور بھر کوشش کی انہوں نے قرآن و سنت کے نظام......نظامِ خلافت کو بدلنے کی بلکہ بگاڑنے کی۔ بڑی اور بنیادی تبدیلی تو اسی وقت آ گئی جب خلفائے راشد کو چلتا کر کے ملوک آ دھمکے۔ پہلے بیعت کے ذریعہ خلفاء کا انعقاد ہوتا تھا پھر حکومت کے ذریعے بیعت ہونے لگی۔ اس ہمالہ قد تبدیلی سے بندوں کو موقع مل گیا کہ وہ خواہشات و مفادات پر مبنی قوانین کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قرآن و سنت پر مبنی قوانین میں غلط سلط کر کے اپنی مرضی کا نظام (دین) رائج کریں۔ سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے چند سالہ دورِ خلافت کے ملوک دینِ حق میں من پسند تبدیلیاں کرتے رہے اور' شومیٔ قسمت' یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ خلیفۃ المسلمین کو چلتا کر کے جدی پشتی حکومتوں کا سلسلہ شروع

ہوا۔ پہلے دورِ امیہ‘ پھر دورِ بنو عباس‘ پھر عثمانیوں کا دور اور پھر دورِ غلامی سے گزرنے کے بعد طوائف الملوکی یعنی وہ نظام جس میں آج ہم مسلمان رہ بس رہے ہیں۔ قرآن وسنت کی رو سے پوری اسلامی دنیا کی باگ ڈور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایک خلیفۃ المسلمین کے ہاتھ میں ہونا تھی۔ خلیفۃ المسلمین جیسے کہ ان الفاظ سے عیاں ہے‘ کی تعریف ہی یہ ہے کہ پوری دنیائے اسلام کا واحد سربراہ۔

خلفاءِ راشدین کو چلتا کر کے ملوک آئے تو چونکہ حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھی‘ وہ خود کو خلیفہ کہلواتے رہے۔ ظاہر ہے جب دورِ خلافت یعنی قرآن وسنت کے خالص احکامات پر مبنی نظام نہ رہا تو خود کو خلیفہ کہلوانا اسی طرح غلط تھا جس طرح کہ دورِ خلافت کو تیاگ کر دورِ ملوکیت کو لانا۔ حقِ حکمرانی جو صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے بطور امانت (خلافت) صرف خلیفۃ المسلمین کو حاصل ہے۔ ان ملوکوں نے اس حق کو چھینا اور آج تک چھینے ہوئے ہیں۔ بنابریں یہ غاصب تھے اور غاصب ہیں۔ غلط بات ہے کہ سقوطِ خلافت 1924ء میں ہوا۔ سقوطِ خلافت تو اسی وقت ہو گیا جب دورِ خلافتِ راشدہ کو منقطع کر دیا گیا۔ ہاں‘ 1924ء میں اس لنگڑی لولی مرکزیت کا اختتام ہوا جو جیسی تیسی تھی اس وقت تک بہر حال موجود تھی۔ درحقیقت 1924ء میں سقوطِ مرکزیت ہوا‘ سقوطِ خلافت نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دورِ ملوکیت میں فتوحات بھی ہوئیں۔ خوشحالی کے ادوار بھی آئے لیکن ملوک نے دینِ حق کی بیخ کنی کی تو بے دریغ‘ دل کھول کر۔

ہم نے اوپر ذکر کیا کہ اس دین میں جو رسول ﷺ امت کے سپرد کر کے گئے اور جو دین آج ہم نے اختیار کر رکھا ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلا بڑا فرق جو پیدا کیا گیا تو یہ کہ سپرد کردہ دین میں خلیفۃ المسلمین کا وجود تھا جب کہ آج ہمارے اختیار کردہ دین میں نہیں اور صدیوں سے یعنی اس وقت سے نہیں جب دورِ خلافتِ راشدہ کو دورِ ملوکیت میں بدلا گیا۔ نبیٔ کائنات ﷺ دنیا میں تشریف لائے تھے تو دورِ جہالت تھا اور جب تشریف لے گئے تو دورِ خلافت تھا۔ کون و مکاں شاہد دورِ نبوت کا حاصل خلیفہ کا انعقاد اور خلافت کا قیام تھا۔ دورِ نبوت میں حرا و ثور کی ریاضتیں بھی ہوئیں‘ حبشہ و مدینہ کی ہجرتیں بھی ہوئیں‘ صلوٰۃ و زکوٰۃ کی عبادتیں بھی ہوئیں‘ بدر و حنین

کی کاوشیں بھی ہوئیں لیکن یہ سب ذرائع (Means) تھے' ہدف تھا تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا کام...... قیامِ خلافت۔ خلیفۃ المسلمین کا چلتا کرنا اور دورِ خلافتِ راشدہ کو منقطع کرنا ان تمام محنتوں' جانفشانیوں اور قربانیوں کا تہ تیغ کرنا تھا جو دورِ نبوت میں رسول ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے کیں۔ اللہ و رسول ﷺ نے نظامِ خلافت کو اس قدر ترجیح دی تو اس لیے کہ نظامِ خلافت کے بغیر قرآن و سنت پر عمل ہو ہی نہیں سکتا اور یہ وہ حقیقت ہے کہ جو مسلمانوں سے اوجھل ہوئی تو اس قدر کہ اور تو اور خود محراب و منبر سے اس کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ شمس و قمر اور لیل و نہار پریشان کہ دینِ حق کی بنیادیں مسمار ہو گئیں لیکن مسلمانوں نے اسے اس سنجیدگی اور فکر مندی سے نہ لیا کہ جو اس کا حق تھا۔

حکماء کی تحقیق کے مطابق انسانی جسم میں چار اعضاء ایسے ہیں کہ جن میں سے اگر ایک میں بھی معمولی سا نقص بھی پڑ جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے اور اگر ان اعضاء میں سے کوئی ایک ہی جواب دے جائے تو یہی موت ہے۔ یہ چار اعضائے رئیسہ ہیں دل' دماغ' معدہ اور جگر۔ اسی طرح دینِ اسلام میں چار اجزائے رئیسہ ہیں اس لیے کہ ان کا خود قرآنِ مجید میں ذکر ہے۔ خلیفۃ المسلمین کا وجود ہو تو یہ چاروں قرآنی ادارے آ موجود ہوتے ہیں۔ بصورتِ دیگر یعنی خلیفۃ المسلمین کا وجود نہ ہو تو یہ ادارے معدوم ہو جاتے ہیں۔ آئیں دیکھیں وہ چار ادارے کونسے ہیں؟

1۔ اولوالامر

اولوالامر کا مطلب ہے صاحبِ امر لوگ یا اہلِ حل و عقد۔ اس میں خلیفۃ المسلمین کے علاوہ وہ تمام لوگ شامل ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طور ایسے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں جہاں پالیسی امور طے ہوں۔ یعنی اس میں شامل ہوتے ہیں گورنر' وزراء' ارکانِ عدلیہ' ارکانِ شوریٰ' فوج اور دوسرے قومی اداروں کے سربراہان' اہلِ فکر و دانش وغیرہ۔ ویسے تو سیکولر نظاموں میں بھی ظاہر ہے صاحبِ امر لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن تین امتیازی شرائط ہیں جو شرعی اولوالامر کو عام صاحبِ امر لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ شرعی اولوالامر ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مسلمانوں میں سے ہوتے ہیں'

غیر مسلموں میں سے نہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے پابند ہوتے ہیں اور تیسری شرط یہ کہ خلیفۃ المسلمین کو ان میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اولوالامر کی اطاعت کو، مشروط سہی، اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اور تحت لازم قرار دیا ہے۔ قرآنِ مجید میں آیا:

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ و رسول ﷺ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے" (نساء: 59)۔

وہ نظامِ اطاعت جسے ہمارا خالق و مالک...... ربِ کائنات "صحیح طریقِ کار اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر" قرار دے رہا ہے آج ہمارے اختیار کردہ دین سے معدوم ہے اور اس وقت سے معدوم ہے جس وقت سے خلیفۃ المسلمین کا وجود اس میں نہیں یا دوسرے لفظوں میں جب سے دورِ خلافتِ راشدہ کو منقطع کر دیا گیا۔ عین اس وقت سے ہمارا نظامِ اطاعت درہم برہم ہے۔ "خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں" کے مصداق ہم دو اطاعتوں یعنی اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے عادی ہو چکے ورنہ قرآنِ مجید ان دو اطاعتوں کے ساتھ تیسری یعنی اولوالامر کی اطاعت کو لازم قرار دیتا ہے اور وہ اس لیے کہ اولوالامر وہ قرآنی ادارہ ہے کہ جس نے وقت کے کسی بھی موڑ پر اسلامی دنیا میں قرآن و سنت کے احکامات کو نافذ کرنا ہوتا ہے یا دوسرے لفظوں میں نظامِ خلافت کو رواں دواں رکھنا ہوتا ہے۔ جب سے ہمارے ہاں نظامِ خلافت نہیں عین اس وقت سے ہمارے ہاں اولوالامر نہیں ہیں۔ نظامِ خلافت کے بغیر قرآنِ مجید کی مذکورہ اور اسی قبیل کی آیات پر تا قیامت عمل نہیں ہو سکتا۔ بصورتِ موجودہ ناقص ہے ہماری اطاعت اور ناقص ہے ہمارا اختیار کردہ دین۔

2۔ امتِ مسلمہ

دوسرا قرآنی ادارہ جو آج ہمارے اختیار کردہ دین میں نہیں امتِ مسلمہ کا ادارہ ہے۔ خلیفۃ

المسلمین اور نظامِ خلافت موجود تھا تو امتِ مسلمہ کا وجود بھی تھا۔ نظامِ خلافت نہ رہا تو مرکزیت کے درہم برہم ہونے سے ہمارے ہاں امتِ مسلمہ کا وجود نہ رہا، امت، اقوام میں تحلیل ہوگئی۔ زیرِ آسماں آج امتِ مسلمہ کا وجود کہیں نہیں۔ اقوام ہیں، مصری قوم، شامی قوم، ایرانی قوم، افغانی قوم، غرضیکہ اَن گنت اقوام جو اکثر و بیشتر مصروف ہوتی ہیں تو ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے (Leg Pulling) میں۔ ہمہ وقت امتِ مسلمہ کا دین میں ہونا محکم دینی تقاضا ہے اس لیے کہ بہت سے دینی فرائض کی ادائیگی صرف امتی سطح پر ممکن ہے۔ علماء کرام، سیاستدان اور ہر دانشور خواہش رکھتا ہے کہ مسلمانانِ عالم متحد ہوں۔ لیکن یہ نہیں بتاتا کہ دنیائے اسلام کی سطح کا اتحاد کیسے ہو؟ بلکہ بھول جاتا ہے کہ اتحاد کی اعلیٰ ترین صورت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی وضع کردہ اور رسول ﷺ کی آزمودہ...... پوری اسلامی دنیا کے ذرائع و وسائل کا ایک خلیفۃ المسلمین کے ہاتھ میں ہونا۔ نظامِ خلافت کو تیاگ کر ہم مسلمان اتحاد کی اس اعلیٰ ترین اور فطری صورت سے آج محروم ہیں۔ نظامِ خلافت قائم نہ ہو تو قرآنِ کریم کی مشہور آیت کہ ''سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو'' (آلِ عمران: 103) پر تا قیامت عمل نہیں ہو سکتا اور اس پر عمل نہ ہو تو مزید درج ذیل آیت پر بھی عمل نہیں ہو سکتا:

''جو لوگ منکرِ حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر (مسلمانو) تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا افساد برپا ہوگا'' (انفال: 73)۔

ان دو آیات پر عمل نہ ہو تو درج ذیل تیسری آیہ مبارکہ پر بھی عمل نہیں ہو سکتا:

''اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے (ٹیکنالوجی اور جدید اسلحہ) ان کے مقابلہ کیلئے مہیا رکھو تا کہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوفزدہ رکھو جنہیں تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا'' (انفال: 60)۔

مذکورہ تین آیات پر عمل نہ ہو تو درج ذیل چوتھی آیت یعنی شہادت علی الناس کا فرض ادا

نہیں ہوسکتا:

''اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک ''امتِ وسط'' بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہو'' (بقرۃ:143)۔

مذکورہ چار آیات پر عمل نہ ہو تو دنیا بھر کے انسانوں کی اصلاح و رہنمائی اور عالمی سطح پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہ فرض جو امتِ مسلمہ کو خیرِ امت ہونے کے ناطے سے ادا کرنا ہے اور جو درج ذیل آیۂ مقدسہ میں بیان ہوا ہے کی ادائیگی کے متعلق بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ''ایں خیال است و محال است و جنوں''۔

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو'' (آلِ عمران:110)۔

یہ تو چند آیات کا ذکر ہوا لیکن پورے قرآنِ مجید کے احکامات اس قدر باہم مدغم اور ایک دوسرے سے گندھے ہوئے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ نظامِ خلافت کی عدم موجودگی میں پورے قرآن پر کما حقہ عمل نہیں ہوسکتا تو اس بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ''ادخلوا فی السلم کافۃ'' کی صورتِ حال پیدا ہوسکتی ہے تو نظامِ خلافت کے ہوتے ہوئے ورنہ یہ منظر دنیا میں کبھی دیکھنے میں نہیں آ سکتا۔ اور تو اور صرف فریضۂ شہادت علی الناس کو لے لیں۔ قرآن و سنت کے احکامات کو انسانیت تک پہنچانے کے لیے دو ہی راستے ممکن ہیں یعنی قول اور فعل کے ذریعہ سے۔ جدید ذرائع کی موجودگی میں بذریعہ قول تو رسالتِ دین کا کام کچھ ہوسکتا ہے لیکن فعلاً تو تبھی ہو کہ نظامِ خلافت بالفعل کسی خطۂ زمین میں رواں دواں ہوتا کہ دنیا والے اس نظام کے فیوض و برکات بچشمِ سر دیکھ سکیں۔

3۔ شوریٰ

دینِ حق کا ایک اور اہم جز شوریٰ ہے اور اس کا دین میں ہونا بھی ایک قرآنی تقاضا ہے۔ فرمایا گیا:

’’(مومن وہ ہیں جو) نماز قائم کرتے ہیں‘ اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں اور ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں‘‘ (شوریٰ:38)۔

قرآنِ مجید میں اکثر و بیشتر صلوٰۃ وزکوٰۃ کا جوڑے کے طور پر ذکر اکٹھا آیا ہے۔لیکن مذکورہ آیۂ مبارکہ میں اس ترتیب کو توڑ کر ان کے درمیان ’’اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں‘‘ لایا گیا ہے۔اس سے دین میں جزوِ شوریٰ کی اہمیت دو اور دو چار کی طرح واضح ہے۔ مجلسِ شوریٰ اور آج ہمارے ہاں رائج پارلیمنٹ میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔امتی سطح کے ترقیاتی کاموں میں بھی ارکانِ شوریٰ کا کردار ہوتا تو ہے لیکن ان کی اصل ذمہ داری کسی ایسی صورتِ حال یا کوئی ایسا نیا معاملہ کہ جس کے متعلق قرآن وسنت سے براہِ راست نص نہ ملے‘ قرآن وسنت ہی سے استنباط کر کے خلیفۃ المسلمین کو مشورہ دینا ہوتا ہے۔کسی حد تک اس ادارے نے احتسابی ادارے کے طور پر بھی کام کرنا ہوتا ہے۔ بنابریں‘ یہ ادارہ مجتہدین یعنی ایسے علماء کرام پر مشتمل ہوتا ہے جن کو حالاتِ حاضرہ کے علاوہ قرآن وسنت پر پورا عبور ہوتا ہے۔جب کہ پارلیمنٹ نے قانون سازی کرنا ہوتی ہے شوریٰ کو قانون سازی کی اجازت نہیں‘انہوں نے قرآن وسنت کی محض تعبیر وتفسیر یا دوسرے لفظوں میں اجتہاد کر کے خلیفۃ المسلمین کو مشورہ دینا ہوتا ہے۔یاد رہے اسلام میں قانون سازی صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے’’ان الحکم الا للہ‘‘۔پارلیمنٹ میں تو متحارب حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف ہوتے ہیں لیکن شوریٰ میں چونکہ قرآن وسنت کی پیروی مطلوب ہوتی ہے‘ایسے احزاب کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ شوریٰ ایک امتی سطح کا ادارہ ہوتا ہے۔پتے کی بات جو یہاں کرنی مطلوب ہے یہ ہے کہ ہمارے اختیار کردہ دین میں شوریٰ کا کوئی وجود نہیں اس لیے کہ ارکانِ شوریٰ نے خلیفۃ المسلمین کو مشورہ دینا ہوتا ہے جو خود موجود نہیں اور اس وقت سے موجود نہیں جب سے خلیفۃ المسلمین کو چلتا کر کے ملوک آ گئے۔نتیجہ کے طور پر صدیاں بیت گئیں ہمارے دین سے شوریٰ کا ادارہ معدوم ہے اور اس وقت سے آج تک اجتہاد کے دروازے بند ہیں۔

4۔ بیت المال

ایک اور ادارہ جو ہمارے اختیار کردہ دین میں نہیں ہے' بیت المال کا ادارہ ہے۔ یہ بھی قرآنی ادارہ ہے اس لیے کہ زکوٰۃ جس کا قرآنِ مجید میں بار بار ذکر آیا' کی کما حقہ ادائیگی تبھی ممکن ہے جب بیت المال کا ادارہ موجود ہو۔ دارالخلافہ میں اس کا مرکزی وجود ہو اور پھر صوبوں' شہروں قصبوں وغیرہ میں اس کی شاخیں ہوں۔ زکوٰۃ ادا کرنے والوں نے اصل میں اپنی زکوٰۃ کی رقوم بیت المال میں جمع کرانا ہوتی ہیں اور یہ خلافتِ وقت کا کام ہے کہ وہ اسے وظائف کی شکل میں مستحقین میں تقسیم کرے۔ یہ جو ہمارے ہاں اس وقت ہو رہا ہے کہ لوگ اپنی زکوٰۃ اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں تقسیم کر دیتے ہیں بیت المال نہ ہونے کی وجہ سے ایک متبادل طریقے کے طور پر رائج ہے ورنہ یہ زکوٰۃ دینے والوں کا زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو دست بدست دینا اسلامی طریقہ نہیں ہے۔ اس سے کچھ لوگوں کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو ظاہر ہے' کیسے پسند ہو سکتی ہے؟

یاد رہے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دورِ خلافت کے آغاز ہی میں مانعینِ زکوٰۃ کا مسئلہ پیدا ہوا تھا۔ شاید ان کو مانعین کی اصطلاح سے یاد کیا جانا درست بھی ہے یا نہیں اس لیے کہ ان حضرات نے زکوٰۃ دینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ زکوٰۃ تو وہ نکالتے ہیں لیکن بیت المال میں جمع نہیں کراتے' خود ہی اپنے اردگرد کے مستحقین میں تقسیم کرتے ہیں۔ خلیفۃ المسلمین کو یہ تھوڑی سی ترمیم ناگوار گزری لہٰذا ان کے خلاف کارروائی کی حتیٰ کہ وہ زکوٰۃ کی رقوم کو بیت المال میں ہی جمع کرانے لگے۔ افسوس بلکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ خلیفۃ المسلمین نے تو دین میں یہ تھوڑی سی ترمیم بھی گوارا نہ کی اور ہم مسلمان ہیں کہ نہ صرف بیت المال کی دین میں عدم موجودگی سے سمجھوتہ کیے ہوئے ہیں بلکہ خود خلیفۃ المسلمین ہمارے دین میں نہ رہا اور ہم ہیں کہ بغیر خلیفۃ المسلمین کے دین کو برضا و رغبت یوں اختیار کیے ہوئے ہیں جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں اور فرض کیے ہوئے ہیں کہ ہمارا اختیار کردہ دین وہی ہے جو نبیِ رحمت ﷺ امت کے سپرد کر کے گئے تھے۔

انسانی جسم سے اگر دل' دماغ' معدہ اور جگر کو نکال دیا جائے تو باقی جو کچھ بچے اسے لاش سے موسوم کیا جاتا ہے حالانکہ وہ لاش بھی نامکمل اورادھوری ہوتی ہے۔ دینِ حق سے اگر محض خلیفۃ المسلمین کو نکال دیا جائے تو اس کی حیثیت اس انڈے کی سی ہو جاتی ہے جس سے زردی نکال دی جائے۔ ایسے انڈے کو تا قیامت سیتے رہیں اس سے بچہ کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ ایک کمرے کی چار دیواریں ہوتی ہیں۔ کسی ایک دیوار کو مسمار کر دیں' کمرہ نہیں ہر کوئی اسے کھنڈر کہے گا۔ اور پھر محض ایک دیوار کا کیا' دوسری' تیسری حتیٰ کہ چاروں دیواروں کو گرا دیا جائے تو چھت زمین کا حصہ بن جاتی ہے اور دیکھنے والوں کو ایک ٹھڑ انظر آتا ہے۔ ملبے سے البتہ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں کبھی کوئی شاندار عمارت تھی۔ ہم جھوٹی اقدار کے خوگر ہو چکے' کسی کیلئے شاید یہ ہضم کرنا آسان نہ ہو کہ وہ دین جس میں خلیفۃ المسلمین کے علاوہ' اولوالامر' امتِ مسلمہ' شوریٰ اور بیت المال نہیں' دینِ اسلام تو کیا بے دینی کی ایک شکل ہے۔ دینِ حق ہم اختیار کئے ہوتے تو ہمیں وہ تمام برکات اور فوائد و فیوض حاصل ہوتے جو دورِ خلافتِ راشدہ کے مسلمانوں کو حاصل ہوئے تھے۔ کون ومکاں شاہد اس وقت عدل تھا' آج ظلم' اس وقت امن تھا آج بدامنی' فتنہ وفساد' اس وقت خوشحالی تھی آج بدحالی بلکہ پسماندگی و درماندگی' اس وقت اتحاد تھا آج انتشار' اس وقت مسلمان دنیا میں بطور غالب قوت موجود تھے آج مغلوب' یہ تمام اقدار **180** درجے کیوں بدل گئیں؟ تمام اقدار اس لیے برعکس ہوگئیں کہ دورِ خلافتِ راشدہ کے مسلمانوں کا دین' دینِ حق تھا جب کہ آج ہمارا اختیار کردہ دین مسخ شدہ' انحراف زدہ اور حقیقت میں بے دینی کی ایک شکل ہے۔ نوٹ فرمائیں' بار بار فرمائیں' یہی ایک وجہ ہے ہمارے زوال' ہماری پستی اور ہم پر طاری ذلت و رسوائی کی۔

اللہ کا احسان ہے کہ ہمارے ہاں قرآنِ مجید بغیر کسی شوشے کی تبدیلی کے من وعن موجود ہے اور وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کے تحفظ کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ اس کے اصل اور حقیقی ہونے سے ہمیں کم از کم یہ تو پتہ چلتا ہے کہ ملوک نے دین کو بدلا تو کس حد تک۔ اس کے برعکس یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے دین (دینِ اسلام) کو بدلا تو نازل شدہ اپنی کتابوں کو بھی

بدل لیا۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ منحرف ہوئے تو کس حد تک؟ اللہ مرضی کے دین کو چھوڑ کر آج وہ من مرضی کے دین میں سرگرداں وغلطاں ہیں تو کس قدر؟

مسلمان اور دنیا میں مغلوب ہوں' ایک تضاد ہے۔ اس میں کیا شک کہ واقعات کی دنیا میں تو آج ہم مسلمان مغلوب ہیں۔ صرف مغلوب ہی نہیں ہمارا یہ مغلوب ہونا پتہ دے رہا ہے کہ ہمارا ایمان ناقص ہے۔ قرآن نے اپنے نزول کے وقت بتا دیا تھا کہ مسلمان دنیا میں مغلوب ہونگے تو اس وقت جب وہ مومن نہ رہیں گے۔ فرمایا گیا:

''دل شکستہ نہ ہو' غم نہ کرو' تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہوئے'' (آلِ عمران:139)۔

اور یہ بھی کہ مسلمان دنیا میں مغلوب ہوتے ہیں تو اس وقت جب وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہوں۔ یہ بھی قرآنِ مجید میں آیا:

''اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں'' (آلِ عمران:160)

نچوڑ اس لیکچر کا نکلا تو یہ کہ دورِ جہالت میں خلیفۃ المسلمین' اولوالامر' امتِ مسلمہ' شوریٰ اور بیت المال کا وجود نہیں تھا' آج بھی نہیں۔ ہم پھر دورِ جہالت میں ہیں۔ دورِ خلافت نہ ہو تو دورِ جہالت کا ہونا لازمی ہے۔ نظامِ خلافت آج بحال ہو جائے یہ پانچوں ادارے از خود آ موجود ہونگے۔ پانچوں ادارے آ موجود ہوں تو انسانیت کو وہی برکات وثمرات حاصل ہو جائیں جو دورِ خلافتِ راشدہ کے مسلمانوں کو حاصل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا مقصد قرار دیا تو قیامِ نظامِ خلافت کو۔ ہر دوسرے کام کو چھوڑ کر آج کے مسلمانوں کے کرنے کا صرف ''ایک'' کام ہے اور وہ یہ کہ بحالیٔ نظامِ خلافت۔ یہ ایک کام ہو جائے اس کی برکات صرف مسلمانوں کو ہی حاصل نہ ہوں گی' صرف انسانیت کو ہی حاصل نہ ہوں گی' بلکہ حیوانات ونباتات و جمادات غرضیکہ ہر مخلوق کو۔ انسانوں کو یہ فیوض وفوائد ہر مخلوق کو پہنچانے چاہیے اس لیے کہ ہر مخلوق انسان کی خدمت میں مصروف ومشغول ہے۔

لیکچر نمبر 3*

خلافت کی شرعی حیثیت

پیشتر اس کے کہ ہم خلافت کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالیں خلافت کی تعریف کو تازہ کر لیں۔ مفسرین کرام نے خلافت کی جو تعریف کی ہے اس کا نچوڑ یہ ہے کہ ہماری اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکومت کا نام خلافت ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب پوری کائنات پر حکمرانی اللہ تعالیٰ کی ہے تو پھر زمین پر قائم ہونے والی اس کی حکومت کو خلافت کا انوکھا نام کیوں دیا گیا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ پوری کائنات پر حکمرانی اللہ تعالیٰ کی ہے' ان الحکم الا للّٰہ' لیکن زمین پر قائم ہونے والی حکومت کو اسی طرح خلافت کا انوکھا نام دیا گیا جس طرح کہ کائنات کے اس حصہ پر پیدا کی جانے والی مخلوق......انسان کو انوکھا سلوب اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے صوابدیدی اختیارات اور دوسری منفرد صلاحیتوں اور اعزازات سے نوازا۔ ایسی حکومت کو اس لیے ''خلافت'' کا مخصوص نام دیا گیا کہ اس میں اصولی قوانین تو سو فیصد اللہ پاک کے نافذ ہوتے ہیں لیکن باقی کائنات کی طرح براہِ راست نہیں' انسان کے ہاتھوں نافذ ہوتے ہیں۔ مختصراً خلافت کی تعریف ہوئی تو یہ کہ ''انسانوں کے ذریعہ سے زمین پر قائم ہونے والی اللہ تعالیٰ کے قوانین پر مبنی حکومت''۔ یاد رہے قرآنِ مجید اور کتب احادیث میں بیان کردہ تعلیمات واحکامات اگر ان کے صفحات تک محدود رہیں تو ان کی حیثیت محض ایک نظریے اور تھیوری کی ہے' زیادہ سے زیادہ انہیں اسلامی نظریہ کہا جا سکتا ہے۔ البتہ جب یہ تعلیمات وقوانین کسی خطۂ زمین میں نافذ ہو جائیں تو یہی خلافت ہے۔

☆......اس لیکچر کی ترتیب وتدوین میں مولانا خورشید احمد گنگوہی صاحب کی معاونت سے استفادہ کیا گیا۔

علماءِ امت اور فقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ کسی بھی چیز کی شرعی حیثیت کو جانچنے کے چار مآخذ ہیں۔ وہی چیز شرعی حیثیت کی حامل قرار پائے گی جو ان چاروں مآخذ میں سے کم از کم ایک ماخذ پر پوری اترتی ہو۔ یہ چار ماخذ ہیں قرآنِ مجید' سنتِ رسول ﷺ' اجماعِ امت اور قیاس۔ آیئے ان چار مآخذ کی روشنی میں خلافت کی شرعی حیثیت کو پرکھیں۔

قرآنِ مجید بطور ماخذِ خلافت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنی حکومت قائم کرنے کا کام بطور امانت دیا بلکہ قرآنِ مجید سے پتہ چلتا ہے تو یہ کہ پیشکش کرنے پر انسان نے اس امانت کو خود قبول کیا۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کیلئے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا' بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے'' (احزاب:72)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دوسری مخلوقات نے اس پیشکش کو ٹھکرایا تو کیوں اور ''وہ اس سے ڈر گئیں'' تو کیوں؟ وہ ڈر گئیں تو اس لیے کہ حقِ امانت ادا کرنے کی صورت میں تو اس میں بڑی عظمت اور عالی مقامی تھی لیکن امانت میں خیانت ہونے کی شکل میں اس پیشکش میں سخت سزا کی وعید بھی مضمر تھی۔ چنانچہ اگلی ہی آیت میں اس بات کو واضح کر دیا گیا۔ فرمایا:

''اس بارِ امانت کو اٹھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے' اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے'' (احزاب:73)۔

یوں انسان کے ازخود اس پیشکش کو قبول کرنے کے بعد لازمی تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی طے شدہ سنت کے مطابق کہ وہ ہر مخلوق کو مطلوبہ کام کرنے کیلئے درکار ساخت اور راہنمائی عطا کرتا ہے (طٰحٰہ:50) انسان کو ان اختیارات و اعزازات سے نوازتا کہ جو ''فی الارض خلیفہ'' کو کارِ خلافت یا زمین میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کیلئے درکار تھے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں آیا:

''جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا''میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں' پھر جب میں اسے پوری طرح بنادوں اوراس میں اپنی روح پھونک دوں توتم اس کے آگے سجدے میں گرجاؤ''(ص:71-72)۔

یعنی عام مخلوق کی حیثیت سے انسان کی تخلیق تو ظاہر ہے پہلے ہوچکی تھی' اسی لیے تو دوسری چیدہ چیدہ مخلوقات کے ساتھ اسے بھی پیشکش ہوئی' البتہ انسان کی طرف سے اس پیشکش کو قبول کرنے کے بعد مذکورہ آیۂ مبارکہ میں اسے تین مزید اعزازات سے نوازا گیا۔ایک تو اسے سننے سمجھنے' بولنے' حق و باطل میں تمیز کرنے وغیرہ جیسی صلاحیتوں سے مزین کیا(سویۃ)' دوسرے اسے ایک مقررہ مدت تک صوابدیدی اختیارات دیئے(نفخت فیہ من روحی)اورتیسرے فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی شکل میں کارِخلافت میں درکار اشیاء وعناصر کواس کیلئے مسخر کر دیا۔یہ تمام اختیارات واعزازات البتہ اللہ تعالیٰ نے بطورامانت دیئے۔بالفاظِ دیگر کام جوکرنے کیلئے دیاوہ بھی بطورامانت اورمنفرد صلاحتیں اوراہلیتیں دیں تووہ بھی بطورامانت۔

مذکورہ اختیارات واعزازات عطا کرنے کے بعدایک اورایسی سہولت کا فراہم کیا جانا ضروری تھا جس کومہیا کیے بغیر کارِخلافت سرانجام نہیں پا سکتا تھا۔یہ سہولت الٰہی قوانین فراہم کرنے کی تھی۔ان قوانین کے نفاذ سے ہی اللہ کی حکومت معرضِ وجود میں آسکتی تھی۔قوانین ایک ہی وقت پر یکمشت نہیں دیئے جاسکتے تھےاس لیے کہ انسانی تمدن کی ترقی کے ساتھ ان میں تھوڑے بہت ردوبدل کا ہونا لازمی تھا۔چنانچہ انسانی تاریخ پراس سہولت کوکما حقہ فراہم کیا گیا تو نہ صرف وقتاً فوقتاً آسمانی کتابوں کی تنزیل سے بلکہ انبیاءؑ ورسلؑ کی متواتراً بعثت سے بھی تاکہ وہ اپنے قول وفعل سے الٰہی رضا پرمبنی تشریح وتعبیر کردیں۔تاہم شروع میں ہی یہ واضح کردیا گیا کہ اگر انسان اماناً دیئے گئے کام کا حق ادا کریں گےیعنی زمین پراللہ تعالیٰ کےفراہم کردہ قوانین نافذکریں گےتووہ سرخروہونگے۔بصورتِ دیگریعنی اللہ تعالیٰ کےقوانین نافذکرنے کی بجائے اگروہ اپنے بنائے ہوئےقوانین نافذکرکےخیانت کےمرتکب ہوں گےتوسخت سزاان کا مقدرہوگی۔قرآن میں آیا:

''ہم نے کہا'' تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر میری طرف سے جو کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کیلئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا' اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں' جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے'' (بقرۃ:39)۔

قرآنِ مجید کا اسلوب یہ ہے کہ جو اہم بات ہو اس کو کم از کم دو دفعہ اسی یا تھوڑے بہت مختلف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک اور جگہ پر قوانین کی فراہمی و پیروی کو بیان کیا گیا تو اس طرح:

''اے بنی آدم' یاد رکھو' اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسولؑ آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں تو جو نافرمانی سے بچے گا اور اصلاح کا رویہ اختیار کرے گا اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان سے سرکشی اختیار کریں گے وہی اہلِ دوزخ ہونگے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے'' (اعراف:35-36)۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے قوانین کو نافذ کرنا یا کارِ خلافت کوئی نفلی کام نہیں کہ کرنے پر ثواب ہو اور نہ کرنے پر گناہ نہ ہو۔ یہ فرضِ کفایہ بھی نہیں بلکہ سو فرائض کا ایک فرض ہے جسے نہ کرنا سخت ترین عذاب کا موجب ہے۔ اللہ پاک کے نازل کردہ قانون کو نافذ نہ کرنے والے تو کافر' ظالم اور فاسق قرار پاتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں آیا:

ا۔ ''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں'' (مائدہ:44)۔

۲۔ ''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں'' (مائدہ:45)۔

۲۔ ''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں'' (مائدہ:47)۔

اللہ تعالیٰ کے قانون کو نافذ کرنے سے حکومت تو اللہ تعالیٰ کی قائم ہوتی ہے لیکن یہ بڑا اعزاز اور آزمائش ہے ان سپوتوں کیلئے جو ایسے نظام کو خود آگے بڑھ کر قائم کرتے اور چلاتے ہیں۔ بنابریں حقِ امانت کو بطریقِ احسن ادا کرنے والوں سے ربِ کائنات اس قدر خوش ہوتا ہے کہ خود ان کی نصرت کے درپے ہو جاتا ہے۔ ان کی مدد کرتا ہے تو اس طرح کہ ایک طرف انہیں ثابت قدم رکھتا اور دوسری طرف ان کے مخالفین کی چالوں کو بے اثر و بے ہدف کر دیتا ہے۔ فرمایا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے تو ان کیلئے ہلاکت ہے اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے اس لیے کہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے۔ اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے'' (محمد: 7-9)۔

یاد رہے یہ اپنے اعمال کو رائیگاں کروانے والے وہی لوگ ہیں جو حقِ امانت ادا کرنے اور کارِ خلافت کرنے سے قاصر رہے۔ ان کے برعکس کارِ خلافت کی طرف پیش رفت کرنے والے جب اپنے ایمان و عمل سے اللہ تعالیٰ کے معیار پر پورے اترتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ انہیں دنیا میں منصبِ خلافت عطا کرتا ہے بلکہ خلافت کے ہی نتیجہ میں غلبہء دینِ حق اور برکاتِ دینِ حق بشمول امن' خالص عبادت کے مواقع اور شرک سے بچنے کی سہولت کا وعدہ کرتا ہے۔ فرمایا گیا:

''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے لوگوں کو بنا چکا ہے' ان کے لیے ان کے اس دین کو غالب کرے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے' ان کی حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا' بس وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں'' (نور: 55)۔

''امن'' کو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ مقدسہ میں ایسے جیسے بطور ''بیرومیٹر'' لیا ہے اس لیے کہ ''امن'' ہوتا ہی کسی معاشرے میں اسوقت ہے جب وہاں پر عدل ہو' خوشحالی ہو اور کوئی فرد

محرومیت کا شکار نہ ہو۔ یہاں پر اسلام کی ان برکات کو تیسرے مرحلے میں بیان کیا گیا ہے۔
اس تیسرے مرحلے سے پہلے دوسرے مرحلے یعنی غلبۂ دینِ حق اور غلبۂ دینِ حق سے بھی پہلے ایک اور بنیادی مرحلے یعنی قیامِ خلافت کے مرحلے کا ذکر ہے۔ یہ آیت جسے نام ہی آیۂ استخلاف کا دیا گیا ہے قرآنِ مجید سے جوازِ خلافت کی بنیاد ہے۔ ترتیب جو آیۂ کریمہ بیان کر رہی ہے یہ ہے کہ دینِ اسلام کی برکات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں جب تک کہ دینِ حق بطور غالب قوت موجود نہ ہو اور دینِ حق بطور غالب قوت موجود نہیں ہو سکتا جب تک کہ پہلے نظامِ خلافت قائم نہ ہو۔ یعنی پہلے نظامِ خلافت قائم ہو تو غلبۂ دینِ حق اور غلبۂ دینِ حق ہو تو اسلام کی برکات حاصل ورنہ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ جیسے کہ پہلے بیان ہوا یہ ایسا ہی ہے کہ پھل دار درخت کو پھل تو شاخوں پر لگتے ہیں لیکن شاخیں اس وقت تک معرضِ وجود میں آ ہی نہیں سکتیں جب تک کہ ان سے پہلے تنا نہ ہو اور تنا خود وجود پذیر نہیں ہو سکتا جب تک پہلے جڑ نہ ہو۔ جڑ ہو تو تنا' تنا ہو تو شاخیں' شاخیں ہو تو پھل۔ قرآنِ مجید سے نظامِ خلافت کے جواز کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت کہ نظامِ خلافت ہو تو اسلام کی برکات سے انسانیت بہرہ مند ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ تاریخ شاہد دنیا میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں' دورِ خلافتِ راشدہ میں خلافت قائم تھی تو اس دور کے مسلمانوں کو اسلام کی بے مثل برکات بشمل امن' عدل' اتحاد' خوشحالی' غلبۂ دینِ حق وغیرہ حاصل تھیں۔ آج دنیا میں خلافت کہیں نہیں تو ان برکات کا حصول کیا' برکات 180 درجے برعکس ہو گئیں ہیں۔ امن کی جگہ بدامنی' عدل کی جگہ ظلم' اتحاد کی جگہ فرقہ واریت' خوشحالی کی جگہ پسماندگی و درماندگی' غلبۂ دینِ حق کی جگہ مغلوبیت آج کے مسلمانوں کا مقدر ہے۔ خلافت تھی دورِ خلافتِ راشدہ میں تو توحید تھی یعنی صرف اللہ کا قانون رائج تھا۔ توحید آ جائے تو سب نیکیاں اور بھلائیاں آ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس شرک یعنی اللہ کے قانون کے ساتھ بندوں کے بنائے ہوئے قوانین کو شامل کر لیا جائے تو بھلائیوں کا قلع قمع اور برائیوں کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ نظامِ خلافت کے نہ ہونے کا مطلب ہی شرک کا ہونا ہے اور یہ شرک ہی کی وجہ سے ہے کہ آج جیسا کہ اوپر بیان ہوا'

ہمارے ہاں دینِ حق کی برکات برعکس ہوگئی ہیں۔ ایسا کیوں ہوا ہے مذکورہ آیت میں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ آیۂ استخلاف کا اختتام اس جملے پر ہوا ہے ”جو اس کے بعد کفر (ناشکری) کریں تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں“۔ یعنی جو لوگ نظامِ خلافت کو تیاگ کر ناشکری کا راستہ اختیار کریں اور اپنے آپ کو خلافت سے محروم کرلیں تو ان کی نشو ونما رک جاتی ہے۔ وہ بھلائیوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ قرآن عربی میں نازل ہوا۔ عربی میں فاسق اس درخت کو کہتے ہیں کہ جس کی چھال اتار کر اسے ننگا دھڑنگا کر دیا جائے۔ یاد رہے کسی پودے یا درخت کی خوراک و پانی چھال کے ذریعے سے پتوں میں پہنچتے ہیں جہاں یہ خام خوراک سورج کی روشنی میں پک کر درخت کے رگ و ریشے میں لوٹتی ہے۔ پتے درخت کا کچن ہیں۔ جب چھال اتر جائے تو زمین سے پانی اور غذائی عناصر کی پتوں میں سپلائی منقطع ہو جاتی ہے۔ ایسے درخت کی نشو ونما رک جاتی ہے اور کچھ ہی عرصہ بعد وہ سوکھ کر ایندھن بن جاتا ہے۔

دورِ خلافتِ راشدہ میں جب خلافت کی چھال قائم تھی تو دنیا والوں کو دینِ حق کی برکات میسر تھیں۔ ناشکری کا مرتکب ہو کر جب بعد میں آنے والے مسلمان فاسق بن گئے تو ان کی نشو ونما رک گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دینِ حق کی رحمتیں آج ہمارے ہاں زحمتیں بن کر مقدر بنی ہوئی ہیں۔ بصورتِ موجودہ آپ لاکھ لیبارٹریاں، ادارے، یونیورسٹیاں بنائیں نشو ونما بہر حال رکی رہے گی۔

قرآن میں یہ بھی آیا ”سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو“ (آلِ عمران:103)۔ اس آیت پر تا قیامت عمل نہیں ہوسکتا اگر اسلامی دنیا میں موجود 57 حکمرانوں سے اقتدار صرف ایک حکمران یعنی خلیفۃ المسلمین کے ہاتھ منتقل نہ ہو۔ قرآن میں آیا ”اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں“ (نساء:59)۔ اس آیت پر بھی تا قیامت عمل نہیں ہوسکتا جب تک خلیفۃ المسلمین دنیا میں موجود نہ ہو اس لیے کہ صاحبانِ امر میں جب تک خلیفۂ وقت کو مرکزی حیثیت حاصل نہ ہو، شرعی اولوالامر معرضِ وجود میں آتے ہی نہیں۔ قرآنِ مجید میں یہ بھی آیا ”وہ جو اپنے معاملات آپس کے مشورے

سے چلاتے ہیں" (شوریٰ: 38)۔اس آیت پر بھی تا قیامت عمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ شوریٰ موجود نہ ہو اور شوریٰ موجود نہیں ہوسکتی جب تک خلیفۃ المسلمین موجود نہ ہو۔ ارکانِ شوریٰ نے خلیفۂ وقت ہی کو تو مشورہ دینا ہوتا ہے۔ اجتہاد کے دروازے بند رہیں گے جب تک کہ خلیفہ و خلافت کا نظام موجود نہ ہو۔قرآنِ مجید میں یہ بھی آیا" (مسلمانو) اب دنیا میں وہ بہترین امت تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو" (آلِ عمران: 110)۔اس آیت پر بھی تا قیامت عمل نہیں ہو سکتا جب تک خلیفۃ المسلمین کے وجود سے دوبارہ مرکزیت قائم نہ ہو اور موجودہ مسلم اقوام کو باہم مدغم کر کے پھر امتِ مسلمہ کو بحال نہ کیا جائے۔غرضیکہ اور تو اور خلافت کی عدم موجودگی میں نہ نظامِ صلوٰۃ کما حقہ قائم ہوسکتا ہے اور نہ نظامِ زکوٰۃ۔خلیفۃ المسلمین کی عدم موجودگی میں تو معیاری حج کی ادائیگی ناممکن ہے اس لیے کہ خطبۂ حج تو خلیفۃ المسلمین کا اعزاز ہے۔ بنابریں کیا اس میں کوئی شک ہے کہ خلافت ہو تو دین ورنہ بے دینی۔ دورِ جہالت تھا تو دورِ خلافت نہیں تھا اور جب دورِ خلافت نہ ہو تو دورِ جہالت ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر نبیؑ کو قیامِ خلافت یا اقامتِ دین کا ہی کام کرنے کو دیا گیا۔ چیدہ چیدہ انبیاءؑ کا نام لیکر فرمایا:

"اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمد ﷺ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں۔اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو" (شوریٰ: 13)۔

یعنی اللہ پاک نے انبیاءؑ و رسلؑ کو انسانیت کا امام ہوتے ہوئے وہی...... اقامتِ دین...... کا کام کرنے کو کہا جو انسانیت کو کرنے کیلئے دیا۔کوئی نبیؑ دنیا میں ایسا نہیں آیا جس نے اپنی نبوت کے پہلے لمحے سے لیکر آخری لمحے تک یہی کام نہیں کیا۔ خود رسول ﷺ نے دورِ نبوت کا ایک

ایک لمحہ اسی تگ ودو میں گزارا۔ ہم سمجھ بیٹھے ہیں کہ دین میں نماز، روزے، زکوٰۃ وغیرہ کی بہت اہمیت ہے بلکہ نماز کے ادا کرنے کو ہی آج سارا دین تصور کر بیٹھے ہیں۔ نماز پڑھ لی اور سمجھ بیٹھے کہ بس دین کا حق ادا ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں نماز اور زکوٰۃ کی اسلام میں بہت اہمیت ہے۔ نماز سماجی وتمدنی نظام کو سنوارتی ہے تو زکوٰۃ معاشی نظام کو۔ لیکن اہمیت ان کی ہے تو اس لیے کہ یہ ایک مسلمان کو نظامِ خلافت قائم کرنے اور قائم رکھنے میں بنیادی تربیت کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی خود منزل نہیں ہیں، منزل یعنی قیام و دوامِ خلافت میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ اپنی حقیقی اور معیاری حیثیت سے ادا ہی اس وقت ہوتی ہیں جب خلافت قائم ہو چکی ہو اور مسلمان اقتدار میں ہوں۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے'' (حج: 41)۔

یعنی صرف یہی نہیں کہ نماز اور زکوٰۃ کی اصل ادائیگی ہوتی اس وقت ہے جب نظامِ خلافت قائم ہو اور مسلمانوں کو تمکین فی الارض حاصل ہو بلکہ فریضۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی بھی اس وقت ممکن ہے جب مسلمان دنیا میں بطور غالب قوت موجود ہوں۔ جیسے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ سے ظاہر ہے معروف کو حکماً نافذ کرنا اور نہی کو بالقوۃ منع کرنا ہوتا ہے۔

مذکورۂ آیۂ مبارکہ یعنی شوریٰ کی آیت نمبر 13 میں انبیاءؑ و رسلؑ کو اقامتِ دین و قیامِ خلافت کا کام دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ یہی اقامتِ دین کا کام (اے محمد ﷺ) آپ نے کرنا ہے۔ اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اقامتِ دین اور اقامتِ صلوٰۃ وزکوٰۃ کی ترتیب کیا ہے کہ جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کو عمل پیرائی کیلئے کہا۔ یاد رہے پہلی وحی جو رسول ﷺ پر غارِ حرا میں نازل ہوئی محض تعارفی تھی۔ البتہ دوسری وحی میں جو کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی نہ صرف یہ کہ زندگی بھر کرنے کا پروگرام دے دیا بلکہ ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ جمے جمائے باطل نظاموں کو ملیا میٹ کر

کے نظامِ حق کو قائم کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔حاملین نظامِ باطل ٹھنڈے پیٹوں یہ کام ہونے نہیں دیتے۔مشکل ترین کام ہے اقامتِ دین کا جو انبیاءؑ ورسلؑ کو کرنے کیلئے دیا گیا۔لہٰذا رسول ﷺ کو اس کام کی سنگینی سے آگاہ کرتے ہوئے صبر و ثبات کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی۔صحیح روایات سے ثابت ہے کہ دوسری وحی سورۂ مدثر کی درج ذیل چھوٹی چھوٹی سات آیات پر مشتمل تھی۔

''اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اٹھو اور خبردار کرو۔اور اپنے رب کی کبریائی کو قائم کرو اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔اور گندگی سے دور رہو۔اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کیلئے اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو''۔

یعنی اور ضروری ہدایات کے علاوہ جو کام کرنے کیلئے دیا تو اللہ کی حکومت (کبریائی) قائم کرنے کا اور پھر بتا دیا کہ اس راستہ میں جب مشکلات ومصائب سے واسطہ پڑے تو صبر کا دامن تھامنا اور وہ بھی اپنے رب کی خاطر یعنی ظاہر ہے کام جو کرنے کیلئے دیا جا رہا ہے وہ اللہ کی حکومت قائم کرنے کا ہے۔چونکہ اس دوسری وحی کے موقع پر بھی رسول ﷺ وصولِ وحی سے ابھی پوری طرح مانوس نہ ہوئے تھے لہٰذا اسی طرح اس موقع پر بھی آپ ﷺ چادر لپیٹ کر لیٹ گئے جیسے کہ پہلی وحی کے موقع پر۔اس لیے رسول ﷺ کو ''یاایھا المدثر'' کے الفاظ سے پکارا گیا۔مطلب یہ کہ اے میرے محبوب بندے، تم اوڑھ کر کہاں لیٹ گئے تمہیں تو کارِ عظیم کی تکمیل کیلئے بارِ عظیم سے گزرنا ہے۔

اور تو اور خود رسول ﷺ کو قیامِ خلافت یا اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کا کام بطور چیلنج دیا اور قرآنِ مجید میں بار بار سخت وعید سنائی اللہ کے قانون کو چھوڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنے کی۔ایک جگہ پر فرمایا:

''اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی ومددگار ہوگا اور نہ ہی کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے۔(رعد:37)۔

ایک اور جگہ پر فرمایا:

''(اے محمد ﷺ) تم اس دین کی طرف دعوت دو اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر مضبوطی سے قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ان سے کہہ دو کہ ''اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں'' (شوریٰ:15)۔

پھر قیامِ خلافت کا کام رسول ﷺ کی رحلت کے بعد صرف ان کی امت یا قبل از قیامت آخری امت کو ہی نہ دیا گیا بلکہ اس سے پہلے کسی نہ کسی پیمانے پر سابقہ امتوں کو بھی دیا گیا۔ اہلِ کتاب کے متعلق فرمایا:

''برملا کہہ دو، اے اہلِ کتاب! تم ہرگز اصل پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں'' (مائدہ:68)۔

قرآنِ مجید سے ان واضح احکامات کی روشنی میں کسی کا یہ تصور کرنا کہ دنیا میں اقتدار حاصل کرنے کے درپے ہونا دنیا پرستی ہے سراسر غلطی پر مبنی ہے۔ ہاں اپنے لیے اقتدار حاصل کرنا واقعی دنیا پرستی اور گمراہی ہے لیکن اللہ کے دین کیلئے حکومت کا طالب ہونا عین عبادت اور مقصدِ تخلیقِ انساں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے نازک موقع پر اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی ﷺ کو دعا سکھاتے ہیں تو حصولِ اقتدار کی۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''اور دعا کرو کہ پروردگار مجھے جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے'' (بنی اسرائیل:80)۔

چنانچہ مدینہ پہنچنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نبی کائنات ﷺ کو وہ اسلامی ریاست عطا کر دی جو بالآخر چند ہی سالوں میں پورے عرب پر اللہ کے دین کو غالب کرنے میں مدومعاں ثابت ہوئی۔ اصل میں دنیا سے فتنہ وفساد کا قلع قمع ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اصلاح پسندوں کے پاس سیاسی قوت نہ ہو۔ خود قرآن میں آیا:

''ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کیلئے ہو جائے'' (انفال:39)۔

برائی جتنی چاہے کوئی بغیر قوت پھیلا سکتا ہے لیکن نیکی محض وعظ و تذکیر سے استوار نہیں ہو سکتی۔ یہی بات ہے جس کا خود رسول ﷺ نے اظہار کیا' فرمایا ''اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدِ باب کر دیتا ہے جن کا سدِ باب قرآن سے نہیں کرتا''۔ مذکورہ دعا میں رسول ﷺ سے یہ بھی کہلوایا گیا کہ وہ اقتدار میرے پروگرام کیلئے ہو کسی دوسرے کے پروگرام کیلئے نہیں۔ دوسرے کے پروگرام کیلئے تو مکہ میں بھی آپ ﷺ کو اقتدار ملتا تھا لیکن آپ ﷺ نے دوٹوک انکار کر دیا۔ وہاں جا کر اقتدار کو قبول کیا جہاں وہ خالص خلافت کی شکل میں تھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا مخصوص وجوہات کی بنا پر دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حکومت کو خلافت کا نام دیا گیا لیکن انسانوں کو بار بار یاد دہانی کرائی گئی کہ بظاہر بندوں کی حکومت نظر آنے والی حکمرانی اصل کے اعتبار سے اللہ کی حکومت ہوتی ہے اس لیے کہ کبریائی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو سزاوار نہیں۔ بنابریں قرآنِ مجید اسی کی کبریائی کو بار بار دہراتا ہے۔ روزے کا مقصد بیان کرتے ہوئے یہ تو فرمایا کہ ''لعلکم تتقون'' ...... ''لعلکم تشکرون'' لیکن ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اس طور جو تمہیں ہدایت حاصل ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی ''کبریائی'' کا اظہار و اعتراف کرو۔ وہ لوگ جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کی بجائے اپنی حکومت بطور جمہوریت' آمریت' اشتراکیت وغیرہ قائم و دائم کرنے میں عمریں گزار دیتے ہیں آخرت میں جب وہ عین سزا بھگت رہے ہونگے تو ان کو بتا دیا جائے گا کہ ان کا ایسا انجام اس لیے ہے کہ وہ بھول گئے تھے کہ ''سب تعریف اللہ ہی کیلئے ہے جو زمین اور آسمانوں کا مالک اور سارے جہان والوں کا پروردگار ہے۔ زمین اور آسمانوں میں کبریائی اسی کیلئے ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے'' (جاثیہ:36-37)۔ سورۂ بنی اسرائیل میں آیا ''اس کی کبریائی قائم کرو' کمال درجے کی کبریائی''۔ سورۂ حشر میں آیا: ''سب پر غالب' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا''۔ اسی طرح ایک جگہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف کرایا تو اس

طرح کہ ''العلی العظیم۔...... بزرگ و برتر ذات'' (بقرۃ: 255)۔ دوسری جگہ پر فرمایا: ''الکبیر المتعال...... وہ بزرگ جو ہر حال میں بالاتر رہنے والا ہے'' (رعد: 9)۔ تیسری جگہ پر فرمایا: ''العلی الکبیر...... بالادست اور بزرگ ہے'' (حج: 62)۔

پھر صرف قرآنِ مجید کی تلاوت کے وقت ہی اس کبریا کی کبریائی کے گن نہیں گائے جاتے بلکہ معمول کی زندگی میں کسی نہ کسی صورت میں اعلان ہو رہا ہے تو اسی کا کہ ''اللہ اکبر...... کبریائی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے''۔ بچے کی پیدائش پر جو پہلی حقیقت اس کے ہر کان میں باری باری ڈالی جاتی ہے تو یہ کہ ہم سب پابند ہیں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کے۔ پھر اذان میں' نماز میں کئی کئی بار بلکہ مذبوحہ کو ذبح کرتے وقت دوٹوک اعلان ہوتا ہے تو یہی کہ دنیا کے دھندوں میں کوئی بھول گیا ہے تو پھر یاد کرلے کہ حکمران ہے تو صرف ایک اللہ...... اللہ اکبر۔

سنتِ رسول ﷺ بطور ماخذِ خلافت

قرآنِ مجید کے بعد اسلام کا دوسرا بڑا ماخذ رسول ﷺ کی سنت ہے۔ سنتِ رسول ﷺ اصل میں اللہ تعالیٰ کے مہیا کردہ قانون کی آفیشل تفسیر و تعبیر ہے۔ قرآنِ مجید اصولوں کی کتاب ہے۔ سابقہ ادوار کی طرح کتاب کے ساتھ رسول ﷺ کو بھیجا ہی اس لیے گیا کہ وہ اپنے قول و فعل اور تائید سے ان اصولوں کی تفسیر و تعبیر کردے۔ بصورتِ دیگر یعنی قرآنِ مجید کے الفاظ کی تشریح اگر ہر کہہ و مہہ کی صوابدید پر ہوتی تو سوائے انتشار کے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ کوئی مربوط نظام معرضِ وجود میں آتا ہی نہ۔ نماز کو ہی لے لیں قرآنِ مجید میں اتنا ہی آیا کہ ''اقیمو الصلوٰۃ'' یعنی نماز قائم کرو۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ کیسے قائم کریں' فرمایا ''اسی طرح سے نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھو''۔ چنانچہ نماز جس طرح آج ہمارے ہاں پڑھی جا رہی ہے قرآنِ مجید کے بعد سنتِ رسول ﷺ سے ماخذ ہے۔ کوئی لاکھ کہے کہ وہ ''اہلِ قرآن'' ہے' قرآنِ مجید پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا اس لیے کہ قرآنِ مجید خود سنت کے بغیر نہیں چلتا۔ ایک جگہ پر آیا:

''کہہ دو'' اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو' اللہ تم سے

محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو بخش دے گا۔ اللہ بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے''۔ کہہ دو ''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی''۔ اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا'' (آلِ عمران: 31-32)۔

یعنی اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول ﷺ کی اطاعت نہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کرنے والا۔ یہ اس لیے کہ اللہ کی اطاعت ممکن ہی نہیں رسول ﷺ کی اطاعت کے بغیر۔ اللہ کا اتہ پتہ رسول ﷺ ہی تو دیتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں آیا:

''جو کچھ رسول ﷺ تمہیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دیں اس سے رک جاؤ۔ اللہ سے ڈرو' اللہ سخت سزا دینے والا ہے'' (حشر: 7)۔

ایک اور جگہ پر آیا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرلو'' (محمد ﷺ: 32)۔

بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کی وہ اطاعت بے سود ہے جو رسول ﷺ کی اطاعت کے ذریعہ سے نہ ہو۔ یہی وہ ضابطہ ہے جس کا رسول ﷺ نے خود ایک موقع پر اظہار فرمایا تو اس طرح:

''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی'' (بخاری و مسلم)۔

تاریخی واقعہ ہے رسول ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ وداع کرتے وقت معاذ بن جبلؓ سے پوچھا کہ یمن میں امور کا فیصلہ کرتے ہوئے تمہیں قرآنِ مجید سے راہنمائی نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟ حضرت معاذ بن جبلؓ نے کہا کہ ایسی صورت میں سنتِ رسول ﷺ سے استفادہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر سنتِ رسول ﷺ بھی خاموش ہو تو پھر؟ معاذ بن جبلؓ نے جواب دیا کہ ایسی صورت میں قرآن و سنت پر قیاس کرتے ہوئے خود فیصلہ دوں گا۔

مطلب ان حوالہ جات کا یہ کہ رسول ﷺ کا کوئی فعل' قول یا تائید قانون کی حیثیت رکھتا

ہے' البتہ اس بڑی شرط کے ساتھ کہ وہ واقعی رسول ﷺ سے منسوب ہو۔ ہر وہ حدیث جو قرآن سے مطابقت نہ رکھتی ہو ٹھکرادی جائے گی۔

خلافت کیلئے سنتِ رسول ﷺ سے اس سے بڑا اور کیا ثبوت کہ آپ ﷺ کی پوری زندگی کا حاصل ہے ہی ''قیامِ خلافت''۔ دورِ نبوت کے ایک طرف دورِ جہالت تو دوسری طرف دورِ خلافت، آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے تو دورِ جہالت کا دور دورہ تھا' دنیا سے تشریف لے گئے تو دورِ خلافت تھا۔ زندگی بھر پر محیط رسول ﷺ کا اصل اسوہ کیا ہوا؟ ظاہر ہے ''قیامِ خلافت'' یعنی آنے والے وقتوں میں جب بھی کسی کو دورِ جہالت سے واسطہ پڑے تو اسوۂ رسول ﷺ یہی ہے کہ چین سے نہ بیٹھے جب تک کہ دورِ جہالت کی جگہ دورِ خلافت کو قائم نہ کردے۔ یاد رہے دنیا میں جب دورِ خلافت نہ ہو تو دورِ جہالت ہوتا ہے۔ دورِ جہالت کے ساتھ سمجھوتا کئے رکھنا نہ صرف اسوۂ رسول ﷺ کی ضد ہے بلکہ پرلے درجے کی منافقت ہے' دعویٰ ہوتا ہے دین کا لیکن پیروی ہو رہی ہوتی ہے بے دینی کی۔ یاد رہے حرا و ثور کی ریاضتیں' بدر و حنین کی کاوشیں اور حبش و مدینہ کی ہجرتیں سب ذرائع تھے منزل تھی تو صرف قیامِ خلافت۔

کتبِ احادیث میں سے کسی مستند کتاب کا نام نہیں لیا جا سکتا جس میں قیام و دوامِ خلافت کے متعلق احادیث کا مجموعہ نہ ہو۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری میں ''کتاب الاحکام'' کا پورا حصہ احادیثِ خلافت پر مشتمل ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں ''کتاب الامارت'' اسی لیے وقف ہے۔ ابنِ تاثیر کی کتاب ''جامع الاصول'' کے اندر ایک حصہ ہے جس کا نام ہی ''کتاب الخلافہ'' ہے۔ داؤد شریف' ترمذی شریف' نسائی شریف' مسند احمد' موطہ امام مالک غرضیکہ ہر مجموعۂ احادیث میں مستقل ایک ایک باب خلافت کے متعلق ہے۔ خلافت کے متعلق یہ وسیع خزانہ ہونے کے علی الرغم المیہ یہ ہے کہ دنیائے اسلام حتیٰ کہ علماء کرام اور دانشورانِ امت اہمیتِ خلافت سے بے بہرہ اور قیامِ خلافت سے مفر اختیار کیے ہوئے ہیں۔ منبر و محراب میں بڑی طاقت ہے۔ اگر حاملینِ منبر و محراب قیامِ خلافت کے درپے ہو جائیں تو ''شبانی سے کلیمی دو قدم'' ہے۔ دورِ ملوکیت میں صرف

یہی نہ ہوا کہ اہلِ سیاست اوراہلِ مذہب ریلوے ٹریک کی دولائنوں کی طرح متوازی راستوں پر چل پڑے بلکہ یہ بھی کہ اہلِ مذہب سحرِ ملوکیت کا شکار ہوکر بھول ہی گئے کہ وہ اصل اسوۂ رسول ﷺ سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔صدائیں سنی جانے لگیں کہ نظامِ خلافت کوتو امام مہدی نے آ کر قائم کرنا ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقت کا کونسا موڑ ہے جس پر مسلمانوں کوخلیفۃ المسلمین، اولوالامر، شوریٰ وغیرہ کی ضرورت نہ ہو۔اس وقت توزیرِ آسماں امتِ مسلمہ تک کا کہیں وجودنہیں۔عرصہ ہوا امتِ مسلمہ خودمتحارب اقوام میں بٹ چکی۔قرآن وسنت دنیا سے معدوم نہیں ہو گئے، من وعن موجود ہیں۔کھولئے، پڑھئے، پرکھئے اور بتائیے کہ کیا کوئی ایسا اسلام بھی ہے جو خلیفۃ المسلمین، اولوالامر، شوریٰ اور امتِ مسلمہ کے بغیر ہو۔کاش! علماء امت قرآن خوانی سے قرآن فہمی اور دورۂ حدیث سے غورۂ حدیث کی طرف بھی آئیں۔

سنتِ رسول ﷺ بطور ماخذ خلافت کے سلسلہ میں ہم یہاں صرف چیدہ چیدہ احادیث کا ذکر کرتے ہیں۔سب سے پہلے ان احادیث کا ذکر جن میں ہادیٔ برحق ﷺ نے خلیفۂ وقت کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔اس سلسلے کی پہلی حدیث حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے۔فرمایا:

"تمہارے اندر دورِ نبوت رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔پھر اللہ جب اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔اس کے بعد خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی......" (مسند احمد)

یہ ایک لمبی حدیث کا ابتدائی حصہ ہے جس میں سرورِ کائنات ﷺ نے خود ایسے دور کا ذکر فرمایا جس کی خوبصورتی اور کمال یہ کہ وہ نبوت کے طریق پر ہوگا۔یاد رہے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ ورسلؑ گزر چکے کسی نے ایسے مبارک دور کا ذکرنہیں کیا۔ذکر کیا تو اس کا کہ "میرے بعد نبیؑ آئے گا"۔حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ وغیرہ غرضیکہ کسی ایک نبیؑ نے بھی یہ نہیں کہا کہ میرے بعد خلیفہ یا دورِ خلافت آئے گا۔خلیفۃ المسلمین کی اس سے بڑی فضیلت اور کیا کہ جس جگہ کو سابقہ انبیاءؑ کی آمد کے ذکر سے پر کرتے تھے اس جگہ کو رسولِ آخر الزماں ﷺ نے خلافت سے پر کیا اور خلافت بھی ایسی جو نبوت کے طریق پر ہو۔مکی دورِ نبوت ہو یا مدنی اصل میں

ایک مدت کی انسانی بھول کے بعد پھر اسلام کو نصب کرنے کے ادوار تھے۔ دورِ نبوت میں جزیرۃ العرب کی حد تک اسلام گو ایک غالب حیثیت سے متعارف ہو چکا تھا لیکن اس کے انتظامی، عدالتی، تمدنی، معاشرتی، ثقافتی، تعلیمی، شورائی امور وغیرہ کی تفصیلات طے ہونا ابھی باقی تھیں۔ چنانچہ رسول ﷺ نے نہ صرف اپنی سنت بلکہ اپنے ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کو اپنانا بھی لازم قرار دیا۔ یاد رہے مذکورہ نظاموں کی تفصیلات کو جو بالخصوص خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ سے قرآن وسنت کی روشنی میں طے ہوئیں اسلامی دنیا تو در کنار غیر اسلامی دنیا نے بھی اپنانے میں سعادت سمجھی۔

فضیلت ہی کے متعلق ایک اور حدیث جو معاذ بن جبلؓ اور عبیدہ بن جراحؓ سے یعنی دو جلیل القدر صحابہؓ سے مروی ہے یوں ہے:

''نبوت اور خلافت کا دور اللہ کی رحمت کا دور ہے'' (مجمع الزوائد)۔

یعنی رحمت کا زمانہ یا تو نبوت کا زمانہ ہوتا ہے یا خلافت کا زمانہ۔ نبوت ختم ہو چکی اب تا قیامت خلافت کا دور ہے۔ اس کے کبھی ختم ہونے کا ذکر تو کیا، اس کو ہر لحہ قائم ودائم رکھنے کا حکم ہے۔ اگر خلافت بالفعل موجود ہے تو فرمانِ رسالت کے مطابق یہی دور دورِ رحمت ہے۔ اور اگر خلافت کی بساط لپیٹ دی جائے تو یہ وہ بدقسمت دور ہے کہ انسانیت اللہ کی رحمت کے سائبان سے محروم ہو جاتی ہے۔

ایک اور حدیث میں جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، رسول ﷺ نے سات ایسے آدمیوں کا ذکر فرمایا جن کو قیامت کے دن جب اللہ کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں لے لے گا۔ ان سات خوش قسمتوں میں خلیفۃ المسلمین سرِ فہرست ہوگا۔ (بخاری، مسلم، نسائی)۔

یہ چند احادیث خلیفہ وخلافت کی فضیلت میں بیان ہوئیں لیکن شومیٔ قسمت ہماری دینِ اسلام سے اس قدر دوری کہ ہم مؤذن کی فضیلت کو تو جانتے ہیں۔ نماز میں پہلی صف کی فضیلت کو تو جانتے ہیں۔ درودِ ابراہیمی کی فضیلت کو تو جانتے ہیں۔ حفظِ قرآن کی فضیلت کو تو جانتے ہیں، نہیں

جانتے ہم تو خلافت کی فضیلت کو۔ قرآن وسنت بانگِ دہل اعلان کریں کہ خلافت تو انسان کی تخلیق اوراس دنیا میں بھیجے جانے کا مقصد ہے' ہماری بلا کو۔ مقصدِ حیات بھول کر ہم پگڈنڈیوں پر سرگرداں ہیں۔ اللہ ورسول ﷺ کے نزدیک جو اہم ہمارے نزدیک وہ غیر اہم اور اللہ ورسول ﷺ کے نزدیک جو غیر اہم' ہمارے نزدیک اہم۔ کون نہیں جانتا کہ اللہ کے قوانین کو نافذ نہ کرنے والا اللہ کے نزدیک کافر بھی ہے' ظالم بھی اور فاسق بھی۔ دل دہل جاتا ہے ہادیٔ برحق کی یہ حدیث بیان کرتے ہوئے کہ ہر مرنے والا جہالت کی موت مرتا ہے اگر اس نے خلیفۃ المسلمین کی بیعت نہ کی ہو۔ فرمایا:

''جو شخص اپنا ہاتھ نکال لے اطاعت سے وہ قیامت کے دن اللہ سے ملے گا اس حالت میں کہ کوئی دلیل اس کے پاس نہ ہوگی اور جو شخص مرجاوے اور اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہ ہو تو اس کی موت جاہلیت کی سی ہوگی'' (مسلم)۔

یعنی خلیفۃ المسلمین کی بیعت کیے بغیر مرنے والا اور اس کی اطاعت سے نکل جانے والا ایسے ہی مرتا ہے جیسے وہ دورِ خلافت میں آیا ہی نہ ہو۔ دورِ جہالت میں ہی رہا اور دورِ جہالت میں ہی مرا۔ اس کی موت ابوجہل اور ابولہب کی سی ہوگی۔ ایسی ہی احادیث کا یار لوگوں نے یہ توڑ نکالا کہ وہ بیعت جو اصل میں اللہ اور بندے کے درمیان ہوتی ہے (توبہ:111) اور اللہ کے نمائندے خلیفۃ المسلمین ہی کا اس لیے اعزاز ہے کہ بیعت کرتے وقت اس کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے' ہر ایرے غیرے کا مشغلہ بن گیا۔ بے ملک بادشاہوں کی طرح بے اختیار و بے بس خلفاء کی بھیڑ لگ گئی۔ بزعمِ خویش رشد و ہدایت کے بیشمار سلسلے چل نکلے۔ ساون کے مینڈکوں کی طرح بے شمار گدیاں معرضِ وجود میں آگئیں۔ متبادل انتظام کرلیا' بھول ہی گئے ہم کہ منصبِ خلافت 3 دن اور دو راتوں سے زیادہ خالی رکھا ہی نہیں جاسکتا۔

ایک اور حدیث میں رسول ﷺ نے خلیفۃ المسلمین کو ڈھال قرار دیا۔ فرمایا:

''امام ڈھال ہے جس کے پیچھے لڑتے ہیں مسلمان اور بچتے ہیں مسائل و مشکلات سے۔ پھر اگر وہ حکم کرے اللہ سے ڈرنے کا اور انصاف کرے تو اس کا ثواب ہوگا اور جو اس کے

خلاف حکم دے تو اس پر وبال ہوگا‘‘ (بخاری و مسلم)۔

کس قدر عمدہ مثال فرمائی نبیٔ کائنات ﷺ نے۔ اندازہ لگائیں معرکۂ حق و باطل برپا ہے تلواریں تلواروں سے ٹکرا رہی ہیں۔ ہر مجاہد کے دائیں ہاتھ میں تلوار ہے تو بائیں میں ڈھال ہے۔ ایسے میں اگر آپ ایک ایسے مجاہد کو میدان میں اتاریں کہ جس کے پاس تلوار تو ہے ڈھال نہیں ہے تو ٹھیک ہے اس کا اگر داؤ لگ گیا تو وہ شاید حریف کا کام تمام کردے لیکن جو تلواریں اس پر پڑیں گی ڈھال کی عدم موجودگی میں تو وہ اسے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیں گی۔ نبیٔ کائنات ﷺ نے خلیفۃ المسلمین کو ڈھال سے تشبیہ دے کر دو اور دو چار کی طرح واضح کر دیا کہ وقت کے کسی بھی موڑ پر جب امتِ مسلمہ خلیفۃ المسلمین سے محروم ہوگی تو اقوامِ عالم بے دریغ اس کا خون بہائیں گی۔ یہ خون فلسطین میں بھی بہے گا۔ یہ خون کشمیر میں بھی بہے گا۔ یہ خون افغانستان اور عراق میں بھی بہے گا۔ غرضیکہ میدانِ کارزار کا روپ دھار جائیں گی تو صرف مسلمان سرزمینیں۔ دنیا بھر میں ارزانی ہوگی تو خونِ مسلم کی اور بربادی ہوگی تو عصمتِ مسلم کی۔

اس حدیث پاک سے ایک اور بہت پتے کی بات کا راز کھلا۔ وہ یہ کہ نظامِ خلافت کے ہونے ہی سے مسلمانوں کے مسائل حل ہونگے۔ بدوں خلافت امتِ مسلمہ گھمبیر مسائل سے دوچار ہوگی جیسے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے آج وہ ہے۔ اسی صورتِ حال کو ایک اور حدیث سے واضح کیا گیا۔ فرمایا:

حضرت عمرؓ سے مروی ہے، رسول ﷺ نے فرمایا: ’’خلیفۃ المسلمین زمین میں اللہ کا سایہ ہے۔ اللہ کے بندوں میں سے ہر مظلوم ادارۂ خلافت کی پناہ حاصل کرے گا‘‘۔

یعنی دنیا بھر میں کسی بھی مظلوم کو پناہ ملے گی تو نظامِ خلافت میں۔ اس کی دادرسی ہوگی تو خلیفۃ المسلمین کی موجودگی میں۔ آج پتہ ہے خود مسلمان کس جگہ اور کن اداروں میں فریاد لیکر جاتے ہیں؟ ان ممالک میں کہ جہاں ستاون مسلمان ممالک اگر فریاد لیکر جائیں تو جمہوریت کے دعوے دار ایک عدد ویٹو سے اس کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں یعنی عدل کے دعوے دار اداروں کی بنیاد ہی

بے عدلی اور ظلم پر استوار ہے۔ ایک اور حدیث جس کے راوی ابنِ عباسؓ ہیں، رسول ﷺ نے فرمایا:

''خلیفۃ المسلمین کے بغیر امت کی اصلاح ممکن نہیں''۔

ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا رسول ﷺ نے اس مختصر سی حدیث میں۔ یعنی فرمایا تو یہ کہ جب امت میں بگاڑ آ چکا ہوگا۔ جب مسلمانوں کی گاڑی پٹڑی سے اتر چکی ہوگی۔ وہ پگڈنڈیوں میں سرگرداں ہاتھ پاؤں مار رہی ہوگی ایسے میں مسلمانوں کی بگڑی محض اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے اور خودساختہ منصوبے بنانے سے نہیں بنے گی۔ بنے گی تو صرف نظامِ خلافت کو پھر بحال کرنے سے۔ امتِ مسلمہ کی حالتِ زار کو دیکھ کر ہر ناصح، خواہ وہ عالمِ دین ہو یا سیاستدان، دانشور ہو یا پروفیسر وغیرہ، جو حل تجویز کرتا ہے وہ یہ کہ مسلمان متحد ہو جائیں۔ حل واقعی یہی ہے بڑا کافی اور بڑا شافی لیکن تجویز کنندہ کوئی واضح لائحہ عمل نہیں دیتا کہ اتحاد ہو تو کیسے؟ محض اتحاد کی بات کرنا اور یہ کہنا کہ اتحاد میں بڑی طاقت ہے بالکل بجا لیکن محض اتحاد، اتحاد کے گن گانے یا اتحاد المسلمین سے موسوم کر کے کوئی کمیٹی وغیرہ بنا لینا کیا امتی سطح کے اتحاد کو بحال کر سکتا ہے؟ ایسی کمیٹیاں اور ادارے بنانے سے مزید انتشار تو پھیل سکتا ہے اتحاد تا قیامت قائم نہیں ہو سکتا۔ امتی سطح کا اتحاد صرف اسی ایک طریقہ سے قائم ہو سکتا ہے جو خالقِ کائنات کا وضع کردہ اور نبی کائنات ﷺ کا آزمایا ہوا ہے اور وہ یہ کہ پوری امت کی باگ ڈور اس ایک خلیفہ کے ہاتھ میں ہو کہ جس کی اطاعت بھی اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اور تحت لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو نظامِ زندگی دیا ہے وہ ہے ہی اتحاد کی اعلیٰ ترین صورت۔ نظامِ خلافت سے بڑھ کر کسی اتحاد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول ﷺ کی متعدد احادیث تاکید کرتی ہیں کہ ایک خلیفہ کی موجودگی میں اگر کبھی دوسرا آ دھمکے تو اس کو قتل کر دو۔ صحیح مسلم کی ایک تسلسل میں بیان ہونے والی تین احادیث ملاحظہ ہوں۔ فرمایا:

ا۔ ''قریب ہیں فتنے اور فساد، پھر جو کوئی چاہے اس امت کے اتفاق کو بگاڑنا تو اس کو تلوار سے مارو، خواہ کوئی ہو''۔

۲۔ ’’جو شخص تمہارے پاس آوے اور تم سب ایک شخص پر جمے ہو۔ وہ چاہے تم میں پھوٹ ڈالنا اور جدائی کرنا تو اس کو مار ڈالو‘‘۔

۳۔ ’’جب دو خلیفہ سے بیعت کی جاوے تو جس سے اخیر میں بیعت ہوئی ہو اس کو مار ڈالو۔ (اس لیے کہ اس کی خلافت پہلے خلیفہ کے ہوتے ہوئے باطل ہے)‘‘ (کتاب الامارت)۔

آج ہمارے ہاں امتِ مسلمہ پر کوئی 57 حکمران مسلط ہیں۔ اللہ و رسول ﷺ کے احکامات کی اس قدر مخالفت کہ 57 کی تو کیا بات نبی رحمت ﷺ تو ایک وقت پر دو خلفاء کی اجازت نہیں دیتے اور اس کا طریقہ بتایا تو یہ کہ دوسرے حکمران کو سر اٹھاتے ہی قتل کر دو۔ اس قدر سخت سزا بتائی دوسرے سر اٹھانے والے کی تو اس لیے کہ اس فعل سے امتِ مسلمہ میں تفرقہ پڑتا ہے۔ اور تفرقہ فتنہ اور بڑے فساد کا موجب ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں آیا:

’’جو لوگ منکرِ حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پیدا ہوگا‘‘ (انفال:73)۔

یاد رہے فتنہ و فساد کی قہر مانیاں اس قدر زیادہ ہیں کہ قرآنِ مجید انہیں قتل سے زیادہ مہلک اور ہولناک قرار دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

’’قتل اگر چہ برا ہے لیکن فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے‘‘ (بقرۃ:191)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قتل بڑا ہولناک جرم ہے۔ اس قدر ہولناک کہ بغیر حق کیا ہوا قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ مسلمان کو عمداً قتل کرنے والے کی سزا صرف دوزخ ہے، اس سے کم نہیں۔ لیکن فتنہ اس سے بھی زیادہ ہولناک ہے تو اس لیے کہ یہ اصلاح کی ضد اور ایسی صورتِ حال پیدا کرتا ہے کہ اس میں ایک تو کیا ہزاروں لاکھوں قتل ہو کر بھی جان نہیں چھوٹتی۔ سچ کہا مولانا مودودیؒ نے کہ ’’جب کوئی انسانی گروہ زبردستی اپنا فکری استبداد دوسروں پر مسلط کرے اور لوگوں کو قبولِ حق سے بجبر روکے اور اصلاح و تعمیر کی جائز و معقول کوششوں کا مقابلہ دلائل سے کرنے کی بجائے حیوانی طاقت سے کرنے لگے تو وہ قتل کی بہ نسبت زیادہ سخت برائی کا ارتکاب

کرتا ہے اور ایسے گروہ کو بزور شمشیر ہٹا دینا بالکل جائز ہے‘‘۔

شرک بہت بڑا جرم ہے لیکن تفرقہ وفرقہ واریت اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ چنانچہ حضرت ہارونؑ نے سامری کے پیدا کردہ شرک کو تو برداشت کر لیا لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ ان کی مداخلت کی وجہ سے امت تقسیم ہو جائے۔ فرقہ واریت اس لیے شرک سے زیادہ مہلک ہے کہ فرقہ واریت سے جرم دوہرا ہو جاتا ہے یعنی فرقہ واریت بھی اور ساتھ شرک بھی۔ یاد رہے ہمارے ہاں مذہبی فرقہ واریت بہت بعد کی بات ہے۔ پوری امت کیلئے ایک حکمران کی بجائے متعدد معرضِ وجود میں آ گئے تو سیاسی فرقہ واریت کا دور دورہ پہلے ہوا تو اس سیاسی فرقہ واریت کے نتیجہ کے طور پر مذہبی فرقہ واریت کا ظہور بعد میں۔ سیاسی فرقہ واریت آج ختم ہو جائے اور پوری امتِ مسلمہ ایک خلیفۃ المسلمین کی سربراہی میں آ جائے تو مذہبی فرقہ واریت جلد اپنی موت آپ مر جائے گی۔ رسول ﷺ کے ارشاد کے مطابق اگر ہم امتِ مسلمہ کو ’’جسدِ واحد‘‘ کی صورت میں رکھتے یعنی پوری امت کو ایک حکمران کی سربراہی میں رکھتے تو نہ فرقہ واریت سر اٹھاتی اور نہ فتنہ وفساد اور شرک کا ارتکاب ہوتا۔ یاد رہے کشمیریوں کا مسئلہ صرف کشمیریوں کا نہیں، امتِ مسلمہ کا مسئلہ ہوتا۔ مسئلہ فلسطین بھی اصل میں امتِ مسلمہ کا مسئلہ ہے نہ کہ محض فلسطینیوں کا۔

اجماعِ امت بطور ماخذِ خلافت

اصول تو ویسے یہ ہے کہ جس چیز کا جواز قرآنِ مجید سے ثابت ہو جائے وہ اٹل ہے۔ ان صفحات میں سنتِ رسول ﷺ اور اجماعِ امت کو مزید کھنگالا جا رہا ہے تو اس لیے کہ دیکھا جائے کہ قرآنِ مجید میں بیان کردہ مضمونِ خلافت کو رسول ﷺ اور صحابہؓ نے کس طور لیا۔ یاد رہے ایسے معاملے میں یا ایسی نئی صورتِ حال کہ جس کے متعلق قرآن وسنت میں نص نہ ملے، قرآن وسنت ہی کی روشنی میں ذیلی قانون سازی کرنا ’’اجماعِ امت‘‘ ہے۔ قرآن وسنت کے معانی کو متنازع ہونے کی صورت میں متعین کرنا ’’اجماعِ امت‘‘ ہی کے دائرہ میں آتا ہے۔ نظامِ خلافت میں ’’اجماعِ امت‘‘ کو تیسرے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے اور یہ اجتہاد ہی کی ایک قسم ہے۔ ’’اجماعِ امت‘‘ میں

لفظ ''امت'' کا ہونا خود غمازی کرتا ہے کہ یہ امتی سطح کی ذمہ داری ہونے کی بناء پر شوریٰ کے دائرۂ کار کا معاملہ ہے۔ اجماع کا لغوی معنی ہے اتفاق اور اتفاق کی نوبت آتی ہی اس وقت ہے جب فرد کی بجائے ایک جماعت فیصلہ کرے۔ یہی بات ہے جو حضرت علیؓ نے سعید المسیّب جو رسول ﷺ کی وفات کے بعد مدینہ میں پیدا ہوئے کے ایک سوال کے جواب میں کہی۔ سوال کیا گیا اگر کسی مسئلے پر قرآن و سنت خاموش ہوں تو پھر ہم کیا کریں۔ جواباً حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر آپ کو قرآنِ مجید سے بھی اور سنتِ رسول ﷺ سے بھی راہنمائی نہ ملے تو پھر ایک عالم پر اکتفاء نہ کرنا چاہئے بلکہ مجتہدین کی ایک جماعت اس کا فیصلہ کرے۔ شوریٰ مجتہدین ہی کی جماعت تو ہوتی ہے۔

قیامِ خلافت کے نصاب کے متعلق اجماعِ امت ہے کہ منصبِ خلافت تین دن اور دو راتوں سے زیادہ خالی نہ رہے۔ رسول ﷺ کی رحلت پر ان کا جسدِ مبارک تین دن اور دو راتیں سپردِ خاک نہ کیا گیا اس لیے کہ کبارِ صحابہؓ ثقیفہ بنی ساعدہ میں جمع تھے یہ فیصلہ کرنے کیلئے کہ اب خلیفۃ المسلمین کون ہو؟ انصار کا خیال تھا کہ ہونے والا خلیفہ انصار میں سے ہو جبکہ مہاجرین کی رائے تھی کہ وہ مہاجرین میں سے ہو۔ اسی دوران ایک تیسری تجویز جسے ایوان نے متفقہ مسترد کر دیا' یہ تھی کہ ایک خلیفہ مہاجرین سے اور ایک انصار سے مقرر کر لیا جائے۔ اس تجویز کو دوٹوک رد کیا گیا تو اس لیے کہ قرآن و سنت اس کی اجازت نہیں دیتے۔ یہ اتفاق ہوتے ہی کہ ہونے والا خلیفۃ المسلمین مہاجرین میں سے ہو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ اور حضرت عبیدہ بن جراحؓ میں سے کسی ایک کو خلیفۃ المسلمین بنانے کی تجویز پیش کی۔ ابھی بات آگے نہ بڑھی تھی کہ حضرت عمرؓ نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ بیعت کا آغاز تھا چنانچہ اس کے بعد وہاں پر موجود صحابہؓ نے تو وہیں بیعت کر لی جب کہ باقی کبار صحابہؓ نے اگلے دن مسجد نبوی میں کی۔

نصبِ خلافت کا معاملہ اس قدر اہم تھا کہ بظاہر اس وقت شریعت کے دو احکام کو پسِ پشت ڈالا گیا۔ ایک تو یہ کہ وفات پانے والے کو جلد از جلد دفنا دیا جائے اور دوسرے یہ کہ متوفی کے اعزہ واقربا اس وقت تک کوئی دوسرا کام نہ کریں جب تک رحلت کرنے والے کو دفنا نہ دیا جائے۔

اصل میں اس وقت معاملہ درپیش غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ یاد رہے کوئی بھی نبیؑ اپنے وقت کا خلیفہ بھی ہوتا ہے۔ رحلت فرما جانے والی ہستی ﷺ جس منصب ورتبے کو سنبھالے ہوئے تھی' غیر معمولی نوعیت واہمیت کا حامل تھا۔ معاملہ صرف ہونے والے خلیفۃ المسلمین کے چناؤ کا ہی نہ تھا' اس اہم بات کا فیصلہ کرنا مطلوب تھا کہ منصبِ خلافت زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ خالی رکھا جا سکتا ہے۔ نصاب جو اس طرح طے ہوا بعد میں بھی اس کا حوالہ دیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بعد چنے جانے والے خلیفۃ المسلمین کیلئے جو کمیٹی بنائی اسے یہ بھی تاکید کی کہ وہ یہ فیصلہ تین دن اور دو راتوں کے اندر اندر کرے۔ ثقیفہ بنی ساعدہ میں دو بڑے بڑے فیصلوں پر اجماعِ امت ہوا۔ ایک تو منصبِ خلافت کے خالی رہنے کے نصاب پر اور دوسرے یہ کہ ایک وقت پر پوری امتِ مسلمہ صرف ایک خلیفہ کی سربراہی میں ہو' دو یا دو سے زیادہ خلفاء کی سرکردگی میں کبھی نہیں۔

اسے نالائقی کا نام دیا جائے' بدبختی یا گمراہی کا' ایک مدت سے مقدور بھر مخالفت کئے ہوئے ہے امتِ مسلمہ ان دونوں فیصلوں کی جو نبیٔ کائنات ﷺ کی رحلت کے موقع پر کبارِ صحابہؓ بشمول السابقون الاولون نے کئے۔ کہاں یہ اجماعِ امت کہ منصبِ خلافت تین دن اور دو راتوں سے زیادہ خالی نہ رہے اور کہاں یہ صورتِ حال کہ دورِ خلافتِ راشدہ کے اختتام سے آج تک خالی ہے منصبِ خلافت۔ پھر کہاں اس فیصلے پر اجماعِ امت کہ ایک وقت میں پوری امتِ مسلمہ صرف ایک خلیفہ کی سربراہی میں ہو اور کہاں مسلمانانِ عالم پر آج مسلط ہونا ستاون سربراہان کا۔ کیا جواب ہوگا اس دن جامعۃ الازہر اور دوسرے اونچی کلغی والوں کا جب اللہ پوچھے گا کہ جب دینِ حق کو یوں ملیا میٹ کیا جا رہا تھا تو تم کہاں مر گئے تھے؟ تمہارے سامنے دینِ اسلام کے حصے بخرے ہوتے رہے اور تم یوں لمبی تان کر سوئے رہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں؟ کاش! حاملینِ محراب و منبر جان جائیں کہ ہماری زندگی کا ایک ایک لمحہ گناہگاری میں گذر رہا ہے جب تک ہم نظامِ خلافت کو پھر اس دھرتی کا مقدر بنا کر اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی کا حق ادا نہیں کرتے۔

ظاہر ہے ''قیاس بطور ماخذ خلافت'' کو زیرِ بحث لانے کی ضرورت ہی نہیں۔

لیکچر نمبر 4

نظامِ باطل

نظامِ باطل ہے کیا؟

نظامِ باطل کہا جائے یا دورِ جہالت' بات ایک ہی ہے۔ یعنی وہ نظام جو قرآن وسنت کے خالص احکامات وقوانین پر مبنی نہ ہو۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ایسا نظام جو قرآن وسنت کے خالص قوانین وضوابط پر رواں دواں ہو آج کی دنیا میں زیرِ آسمان کہیں نہیں۔ ہر جگہ یعنی دنیا کے ہر گوشے میں نظامِ باطل کی چہل پہل ہے اور وقت کے موجودہ موڑ پر اس کی دو اقسام ہیں۔ نظامِ باطل کی ایک قسم وہ ہے جو قرآن وسنت کے انکار پر مبنی ہے اور اس وقت پوری دنیائے کفر میں رواں دواں ہے۔ کفار ومشرکین نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ صوابدیدی اختیارات کو بغاوت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اپنے ہاں کے نظاموں کو اپنی خواہشات ومفادات پر استوار کر رکھا ہے۔ نظامِ باطل کی دوسری قسم وہ ہے جو کچھ اسلام' کچھ غیر اسلام' کچھ اللہ ورسول ﷺ کے احکامات اور کچھ اپنی خواہشات و مفادات کے ملغوبے پر مبنی ہے۔ قلم لکھتے جھجک محسوس کر رہا ہے کہ ایسا آدھا تیتر اور آدھا بٹیر کے مصداق نظام اس وقت پوری دنیائے اسلام میں جاری وساری ہے۔ پھر یہ بھی کہ جیسے منافق اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر سے زیادہ قابلِ گرفت ہے' دنیائے اسلام کا اپنایا ہوا ملغوبانا نظام' دنیائے کفر کے اپنائے گئے کافرانہ نظام سے زیادہ مہلک اور زیادہ قابلِ گرفت ہے۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''تو کیا تم کتاب (قرآن) کے کچھ حصوں کو مانتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں' ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو'' (بقرۃ:85)۔

جس ذلت وخواری سے اس وقت مسلمانانِ عالم دوچار ہیں اس کی وجہ کس قدر کھول کر اس آیۂ کریمہ میں بیان فرمادی گئی ہے۔ کتاب کے کچھ حصوں پر عمل پیرا ہونا لیکچر نمبر 2 میں بیان ہو چکا' ہمارے اختیار کردہ دین میں نہ خلیفۃ المسلمین کا وجود ہے' نہ اولوالامر کا' نہ امتِ مسلمہ کا' نہ شوریٰ کا اور نہ بیت المال کا۔ ان تمام قرآنی بنیادوں کو مسمار کرکے مسلم دنیا کے ہر ملک نے اپنے ہاں جو نظام رائج کر رکھا ہے اس میں محض اپنی خواہشات و مفادات کی تکمیل کرنے والے ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ یہ صدور' یہ ڈکٹیٹر' یہ بادشاہ' یہ خودساختہ امراء' یہ پارلیمنٹ' یہ خودساختہ آئینی کتابچے اور دوسرے متبادل انتظامات اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مختلف مسلم ممالک میں اختیار کردہ نظاموں میں کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام کی نسبت تناسب کا تو فرق ہے لیکن ہے ہر مسلم ملک کا نظام کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام پر مبنی۔ اور تو اور یہ درجنوں مسلم ممالک کا وجود خود غیر اسلامی ہے۔ یہ پوری دنیائے اسلام پر ایک خلیفۃ المسلمین کی سربراہی کی بجائے آج کوئی 57 سربراہوں کا مسلط ہونا' کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ نظامِ خلافت قائم ودائم رکھا جاتا تو ایسا نہ ہوتا۔ نظامِ خلافت کو بحال کردیا جائے ہر چیز موزوں (In Order) اور اسلامی ہوجائے۔ اس دنیا کی ذلت ورسوائی سے بھی نجات مل جائے اور آخرت کے شدید ترین عذاب کی بھی نوبت نہ آئے۔

نظامِ باطل اور اسوۂ رسول ﷺ

جب دنیا میں نظامِ باطل رواں دواں ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسوۂ رسول ﷺ کیا ہے؟ ایسی صورتِ حال کی' ظاہر ہے' اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح کی۔ نظامِ باطل کو نظامِ حق اور دورِ جہالت کو دورِ خلافت میں بدلا۔ ''فاتبعونی'' اور ''اطاعنی'' کے مطالبات ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں چھوڑتے ہیں کہ نظامِ جہالت جس سے ہمیں سابقہ پڑا ہوا ہے کو نظامِ خلافت میں بدلا جائے۔ ''فقد اطاع اللہ'' کا حصول ''من یطع الرسول'' کی شرط پوری کیے بغیر ممکن نہیں اور اطاعتِ رسول ﷺ اس کے سوا اور ہے کیا کہ دورِ جہالت سے سمجھوتہ نہ کیا اور چین نہ لیا جب تک کہ اسے دورِ خلافت میں بدل نہ دیا۔

ایک دن آنا ہے۔ ہر فرد نے اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ اللہ پوچھے گا میرے بندے! تو نے وہ کام کیوں نہ کیا جو میرے رسول ﷺ نے کیا۔ بندہ عرض کرے گا' باری تعالیٰ! میں نے بہت نمازیں پڑھیں' فرض ہی کا کیا نفلی روزوں کی بھرمار کردی' زکوٰۃ وصدقات دیتا رہا۔ حج بھی میں نے کیا' عمرے تو بہت کیے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے' بندے! کیا میرے رسول ﷺ دنیا میں گئے تو نمازیں پڑھ کر اور روزے وغیرہ رکھ کر واپس آ گئے۔ یاد ہے تم کو' انہوں ﷺ نے اور ان کے ساتھیوںؓ نے محنتیں کیں' قربانیاں دیں' مصائب ومشکلات کے پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑے' شب و روز چین نہ لیا جب تک کہ نظامِ جہالت کو نظامِ خلافت میں بدل نہ دیا۔ بندے! تو مجھے صرف ایک سوال کا جواب دے کہ تو نے مسنون زندگی کیوں نہ گزاری؟

قرآن وسنت کے اوراق پلٹیں' مسنون زندگی گزارنی ہے تو آج کے مسلمانوں کیلئے صرف ایک راستہ ہے کہ موجودہ نظامِ جہالت کو نظامِ خلافت میں بدلا جائے۔ جب رواں دواں نظام کو بدلنا ہے تو اس کے دو راستے ہیں۔

پہلا راستہ یہ کہ موجودہ نظامِ باطل سے بقدرِ استطاعت اجتناب کیا جائے۔ اس کا حصہ نہ بن کر اسے بدلنے کی کوشش کی جائے۔ یہ وہی طریقہ ہے جو انبیاءؑ بشمول نبیؑ کائنات ﷺ نے اختیار کیا۔ اللہ کا اقرار کرنے سے پہلے طاغوت کا انکار کیا۔ دنیا میں کوئی نبیؑ ایسا نہیں آیا جس نے مروجہ معاشرے کی پیروی کی ہو۔ خود معاشرے کے پیچھے لگنے کی بجائے اس نے معاشرے کو اپنے پیچھے لگانے کی سر توڑ اور بھرپور کوشش کی۔ اگر آدمی باطل معاشرے کی پیروی کرے اور ساتھ نماز' روزے وغیرہ کا اہتمام کرے تو اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بھانبڑ اس وقت مچتا ہے جب باطل نظام سے سمجھوتہ نہ کیا جائے اور اسے بدلنے کی تگ ودو کی جائے۔ ایک آدمی کی عادات کو بدلنا کارِ دارد اور پھر جمے جمائے نظاموں کو بدلنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہوتا ہے۔ ہمت شکن مصائب اور دل دہلا دینے والی تکالیف سے واسطہ پڑنا لازمی ہے۔ قرآن اس کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ ایک جگہ پر فرمایا گیا:

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا' حالانکہ تم

پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے' جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ وقت کا رسول ﷺ اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی...... اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے'' (بقرۃ:214)۔

ایک اور جگہ پر آیا:

''الف۔ل۔م' کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ''ہم ایمان لائے'' اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟'' (عنکبوت:1-3)۔

اصل میں بہتے دریا کے بہاؤ کے موافق تیرنا آسان ہوتا ہے' جان پر اس وقت بنتی ہے جب بہاؤ کے مخالف تیرا جائے۔ باطل نظام سے سمجھوتہ کیئے رکھنا' خواہ اس کے ساتھ قیام و سجود کی بھر مار ہو باطل نظام کے لیے بڑا ساز گار ہوتا ہے۔ ایسے میں کیا مجال اس کے ماتھے پر شکن تک پڑے۔

قریش کے وفود ابو طالب کے ذریعہ بار بار آئے کہ بھتیجے کو سمجھاؤ وہ کچھ لے دے کر معاملہ کر لے۔ قرآن اس کا ذکر کرتا ہے۔ فرمایا گیا:

''پس اے نبی ﷺ' جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ وہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو وہ بھی مداہنت کریں'' (قلم:8-9)۔

مخالفین اسلام نے یہ بھی چاہا کہ اگر ان کی خواہشات کو سمو کر دینِ حق میں کچھ تبدیلیاں کر لی جائیں تو وہ محمد ﷺ کے باقی دین کو بسر و چشم قبول کر لیں گے۔ قرآن میں آیا:

''اور جب انہیں ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ (آخرت میں) ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ اے محمد ﷺ' ان سے کہو مجھے یہ حق نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر

لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے‘‘(یونس:15)۔

رسول ﷺ نے ان کی ہر پیشکش کو بتکرار جھٹلایا۔ ایک دفعہ تو مشرکین پیشکشوں کا ایک پرکشش پیکج لیکر آ گئے۔ اس میں سرِ فہرست پیشکش یہ تھی کہ اگر محمد ﷺ ان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں تو وہ انہیں اپنا حکمران بنا لیتے ہیں۔ کیسے کرتے رسول ﷺ باطل کے ساتھ سمجھوتہ‘ کسی نبیؑ سے یہ امید رکھنا کہ وہ باطل کے ساتھ ایک قدم چل پڑے گا‘ ایسا سوچنے والے کی محض حماقت کا مظہر ہے۔ یہی وہ موڑ ہے جس پر نبیِ کائنات ﷺ کے سامنے دو متبادل راستے تھے۔ ایک سہولتوں کا راستہ تھا تو دوسرا مشکلات کا۔ ایک تن آسانیوں اور تن پروری کا راستہ تھا تو دوسرا ہجرت و غزوات کا۔ ایک مروجہ معاشرے کے پیچھے چلنے کا راستہ تھا اور دوسرا معاشرے کو اپنے پیچھے لگانے کا۔ پوری تاریخ شاہد ہر نبیؑ نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ نبیِ کائنات ﷺ نے بھی یہی دوسرا راستہ اختیار کیا اس لیے کہ ایسا کیے بغیر باطل نظام نہیں بدلا کرتے۔ جب بھی کسی نے نظام بدلنا ہے‘ ضروری ہے کہ اس سے بقدرِ استطاعت اجتناب کیا جائے۔ مسنون طریقہ یہی ہے۔

ہم نے محض ’’اجتناب‘‘ کا نہیں ’’بقدرِ استطاعت اجتناب‘‘ کی اصطلاح کا استعمال کیا۔ یعنی رواں دواں نظامِ باطل کے ساتھ چلنے سے انکار کرنا تو لازم ٹھہرا لیکن یہ اجتناب اسی حد تک کیا جانا ضروری ہے جس حد تک کہ کسی کے بس میں ہو۔ مثال کے طور پر باطل نظام کی ملازمت سے اجتناب ہے تو لازم لیکن کوئی متبادل روزگار کے قابل نہ ہو یا اسے روزگار نہ ملنے کا خدشہ ہو تو وہ اجتناب نہ کرے۔ البتہ اسے ایک مجبوری سمجھ کر کرے اور موقع ملتے ہی اس سے دستبردار ہو جائے۔ کوشش اس کی نظام کو بدلنے کیلئے رہے یعنی وہ ان لوگوں کا بھرپور ساتھ دے جو نظام بدلنے میں مصروف ہوں۔ یاد رہے نبیِ رحمت ﷺ اور صحابہؓ اسی خانہ کعبہ میں عبادت کرتے رہے جہاں مشرکینِ عرب نے 360 بت سجا رکھے تھے۔ انجام کار اللہ تعالیٰ نے بت پرستوں کو تو مشرکین قرار دیا اور وہ جو مجبوراً اس خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے جنہیں اس نظام سے نفرت تھی اور جو ٹھانے بیٹھے تھے کہ موقع ملتے ہی کعبۃ اللہ کو اس گندگی سے پاک کر دیں گے اللہ تعالیٰ انہیں ’’السابقون

الاولون'' قرار دیتا ہے یعنی وہ لوگ جنہوں نے نظام بدلنے میں مسابقت کی۔ دونوں گروہ...... مخالفینِ اسلام اور اسلام والے اسی خانہ کعبہ میں عبادت کرتے تھے جو باطل زدہ تھا۔ زمین و آسمان کا فرق پڑ گیا ان کے انجام میں تو اس لیے کہ ایک گروہ کو اللہ تعالیٰ مشرکین یعنی وہ جن کی بخشش نہیں قرار دیتا ہے اور دوسرے گروہ کو السابقون الاولون یعنی وہ جن کو اسی دنیا میں جنت کی بشارت دی گئی کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ اتنا بڑا فرق پڑا تو اس لیے کہ پہلا گروہ خانہ کعبہ کے باطل نظام کا کسٹوڈین تھا جب کہ دوسرا اس نظام میں بکراہت وقت گزاری کر رہا تھا اور کوشاں تھا کہ ایک دن وہاں کے نظام کو ہر غیر اللہ آلودگی سے پاک کر دے گا۔ ایسا ہی ہوا وہ وقت آیا جب نبیؐ کائناتﷺ ان جھوٹے خداؤں کو اپنی چھڑی سے گرا رہے تھے۔

تو ایک طریقہ تو باطل نظام بدلنے کا وہی جسکا ذکر ہوا' دوسرا طریقہ یہ کہ باطل نظام بدلنے والے نظام کا حصہ بن کر اسے بدلنے کی جدوجہد کریں۔ یعنی وہ طریقہ کہ جسے کسی نبیؑ نے اختیار نہیں کیا۔ غیر مسنون اس لیے کہ رسولﷺ نے بضد اس طریقے کو اختیار کرنے سے انکار کیا۔ کیوں انکار کیا؟ بڑا سوال ہے۔ بڑے ہی غور وخوض کا متقاضی۔ ایک فقرے میں اس کا جواب دیا جائے تو یہ کہ ''اس طریقے کو اپنانے والے نظام کو بدل نہیں پاتے بلکہ دھیرے دھیرے دھیمے دھیمے باطل نظام انہیں بدل دیتا ہے''۔ بدیر یا سویر وہ جو بڑے جوش و ہوش سے نظام کو بدلنے کے درپے ہوتے ہیں آہستہ آہستہ خود باطل نظام کے موافق بلکہ رسیا ہو جاتے ہیں۔ اس قدر رسیا کہ شعوری اور لاشعوری طور پر اس کے گن گانا شروع کر دیتے ہیں۔ محنتیں بھی کرتے ہیں۔ قربانیاں بھی دیتے ہیں۔ اخلاص کے بھرپور مظاہرے بھی کرتے ہیں لیکن' شومیٔ قسمت' نظامِ باطل کے زہر سے بچ نہیں پاتے۔ مجبوری کی آڑ میں ایسی دلدل میں پھنس جاتے ہیں کہ قرآن وسنت کی نصوص تک توڑتے چلے جاتے ہیں۔

نظامِ باطل کے تضادات

نظامِ باطل میں کونسی خرابی ہے کہ کسی نبیؑ نے بھی اس سے سمجھوتہ نہیں کیا' بلکہ بھرپور

کوشش کی کہ اسے اولیں فرصت میں نظامِ حق سے بدل دیا جائے۔ انبیاءؑ و رسلؑ کی بعثت اور کتبِ سماوی کی تنزیل کا مقصدِ واحد تھا ہی نظامِ باطل کا قلع قمع کر کے اس کی جگہ نظامِ حق کو برپا کرنا۔ خود نبیٔ کائنات ﷺ نے جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا' دورِ نبوت کا ایک ایک لمحہ نظامِ باطل کو نظامِ خلافت کے بدلنے میں لگایا تو کیوں؟ اس لیے کہ نظامِ باطل غیر فطری' غیر متوازن' غیر صالح اور غیر عادلانہ ہونے کی وجہ سے ایسا ناسازگار ماحول پیدا کرتا ہے کہ انسان اللہ کی غلامی سے نکل کر بندوں کی غلامی میں آجاتا ہے اور یوں اس کی زندگی تضادات کا مجموعہ اور اجیرن رہتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم ذیل میں چند تضادات کا ذکر کرتے ہیں (نظامِ باطل کے مضر اثرات کا بیان تو ہم' انشاء اللہ' لیکچر نمبر 6 میں کریں گے)۔

ہماری یہ تحریر انسانیت کی سطح کی ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ اس آفاقی تحریر کو مقامی و شخصی حالات سے ملوث نہ کریں۔ لیکن بات سمجھانے کی خاطر ہمیں ذیل میں ملکی و مقامی سطح کے حالات کو بیان کرنا پڑ رہا ہے۔ ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

دوسرے کئی مسلم ممالک میں بھی ایسا ہوا لیکن ہم یہاں پر صرف ملکِ عزیز پاکستان کی بات کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں سالہا سال سے نظامِ باطل کا حصہ بن کر اور الیکشنوں کا راستہ اختیار کر کے یہاں پر اسلامی نظام قائم کرنے کیلئے متعدد دینی جماعتیں کوشاں ہیں۔ وہ جو ''اسلامی نظام' اسلامی نظام'' کا داعیہ لیکر باطل نظام کا حصہ بنے تھے' آج ''جمہوریت' جمہوریت'' کا راگ الاپ رہے ہیں۔ بھول گئے کہ جمہوریت...... جمہور کے خود ساختہ آئین و قانون پر مبنی نظام ہی تو باطل نظام ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کیا جمہوریت کو قائم کرنے اور جمہوری اداروں کو مستحکم کرنے کیلئے بنایا گیا تھا؟ جمہوریت تو ہندوستان میں آج بھی ہے۔ بلکہ بھارت کی جمہوریت ذرا زیادہ خالص ہے۔ ایسے میں کس حکیم نے کہا تھا کہ خون کے دریا عبور کرو اور سرزمینِ پاکستان پہنچ کر جمہوریت کو نافذ کرو؟ قرآن و سنت گواہ سب خرابیوں کی جڑ بندوں کی بندوں پر حکومت ہے۔ اس میں کیا شک نظامِ خلافت کو بھی بندے ہی چلاتے ہیں۔ اصل میں بات قانون کی ہے۔ جس کا

قانون رائج ہو حکومت اس کی ہوتی ہے۔ نظامِ خلافت کو بھی بندے ہی رواں دواں رکھتے ہیں لیکن قانون اللہ کا ہوتا ہے۔ اور وہ آفاقی قانون خلیفۂ وقت پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جس طرح کہ ایک عام شہری پر۔ جمہوریت' آمریت' اشتراکیت وغیرہ ایک ہی سکے کے مختلف رخ ہیں۔ اگر نظام فردِ واحد کے بنائے ہوئے قوانین پر مبنی ہو تو اسے آمریت کہتے ہیں۔ کسی طبقے یا گروہ کے خود ساختہ قوانین پر مبنی نظام کو اشتراکیت کہتے ہیں۔ تمام عوام (جمہور) بگڑ جائیں اور وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین لاگو کر کے نظام چلائیں تو اسے جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔ تمام کافرانہ ممالک میں اس وقت انسان ساختہ زیادہ تر یہ تینوں نظام جاری و ساری ہیں۔ کس قدر بھول...... کفار و مشرکین بھی جمہوریت پسند' مسلمان بھی جمہوریت پسند...... چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

نظامِ خلافت عبادت ہے اس لیے کہ یہ اللہ کا وضع کردہ اور رسول ﷺ کا آزمودہ نظام ہے۔ اس کے مقابلہ میں آمریت' اشتراکیت' جمہوریت جیسے نظام بغاوت ہیں اس لیے کہ یہ بندوں نے اپنی خواہشات و مفادات کی تکمیل میں رواں دواں کر رکھے ہیں۔ یہ انسان ساختہ نظام بغاوت تو ہیں ہی' کفر' ظلم' فسق اور شرک بھی ہیں۔ حرام ہوتی ہے وہ چیز جس میں کفر' ظلم' فسق اور شرک پیوست ہو۔ بنابریں جمہوریت حرام ہے۔ آمریت حرام ہے' اشتراکیت حرام ہے۔

ہم نے اوپر ذکر کیا کہ نظامِ باطل کا حصہ بن کر نظام کو بدلنے کا داعی بظاہر مجبوراً سہی پے در پے قرآن و سنت کی نصوص توڑتا چلا جاتا ہے۔ اور وہ بھی دھڑلے سے اس لیے کہ ساتھ ساتھ جشن بھی مناتا جاتا ہے۔ بے دریغ سرمایہ لگاتا ہے۔ دعوتیں بھی کرتا ہے' مٹھائیاں بھی بانٹتا ہے۔ نظامِ باطل کی سرگزشت مکمل نہیں ہو گی جب تک اس سارے عمل (Process) کا کچا چٹھا نہ کھولا جائے۔ جو مسلمان MNA یا MPA کی خواہش لیکر موجودہ باغیانہ نظام کا حصہ بنتا ہے' حصولِ منزل کی خاطر اس کو کس کس قرآن و سنت کی نص کو توڑنا پڑتا ہے؟ آئیں' بادلِ نخواستہ کچھ پراگندہ نوردی کر لیں۔

مثال کے طور پر قومی اسمبلی کا رکن بننے والا امیدوار سب سے پہلے امیدواری کے فارم

پر کرتا ہے اور اس پر اپنے دستخط ثبت کرتا ہے۔ ایسا کر کے معصومیت میں وہ ایک بڑی چھلانگ لگاتا ہے۔ ایسی چھلانگ لگانے کا مطلب ہے وہ نظامِ باطل کے لیے مہرِ قبولیت ثبت کرتا ہے۔ جب کہ مسلمان ہونے کے ناطے اس پر فرض تھا کہ طاغوت کا انکار اور اللہ کا اقرار کرتا۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے'' (بقرۃ: 256)۔

لیکن جب ایم این اے شپ کا امیدوار نظامِ باطل کو قبول کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ نظامِ حق کو رد کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اللہ کا انکار تو طاغوت کا اقرار کرتا ہے۔ پھر جب یہ امیدوار اپنی کامیابی کی کمر شکن مہم چلاتا ہے تاکہ کسی طور اسے عہدہ مل جائے تو وہ اس دوسری نص کو توڑتا ہے جس میں رسولِ رحمت ﷺ نے فرمایا ''ہم نہیں عہدہ دیتے اسے جو عہدے کو مانگتا اور تانگتا پھرے''۔ اسی انتخابی مہم (Compaign) میں جب وہ سرمایہ کاری کرتا ہے تو بہانگِ دہل اس تیسری نص کو توڑتا ہے جو قرآنِ مجید میں بیان ہوئی تو اس طرح:

''ان کے نبی نے ان سے کہا کہ ''اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے ''ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے''۔ نبی نے جواب دیا ''اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اسے دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے'' (بقرۃ: 247)۔

اس آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ بڑے واضح انداز میں سرمائے کو بطور معیارِ اہلیت رد کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں تقریباً واحد معیارِ اہلیت ''سرمایہ'' ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ غریب لاکھوں خوبیوں کا مالک ہو، عوامی نمائندہ بننے کی اس لیے نہیں سوچ سکتا کہ سرمایہ کاری نہیں کر سکتا۔ آگے چلیں، اسی مہم کے دوران وہ چوتھی نص توڑتا ہے تو اس وقت جب خودساختہ خوبیاں

اور مخالف کی خود ساختہ خرابیاں بیان کرتا ہے۔اسی دوران وہ برادری ازم‘ قرابت اور دوستی کے جذبات ابھار کر طبقاتی تقسیم پیدا کرتا ہے۔ پھر جیسے کہ ہم آگے ذکر کریں گے یہ انتخابی مہم اصل میں مہا جوئے کی ایک شکل ہے یعنی اس دوران جوا کھیلا جاتا ہے اور دل کھول کر۔ متعدد مخالفین کو اکثر و بیشتر مقروض بنا کر جو امیدوار کامیاب ہو جاتا ہے وہ پیشتر اس کے کہ ایک چھت کے نیچے مرد و خواتین کی گپ شپ میں شامل ہو کر متواتر کئی نصوص توڑے‘ حلف اٹھاتا ہے۔اس حلف کو بنظرِ غائر دیکھیں اس میں قرآن وسنت کے الفاظ تک نہیں اور وہ شاید اس لیے کہ ایک غیر مسلم نے بھی منتخب ہو کر وہی حلف اٹھانا ہوتا ہے۔ حلف میں وہ اس آئین کے تحفظ کا بوجھ اٹھاتا ہے جس میں ایک بھی شق قرآن وسنت کے خلاف ہو تو اس کے تحفظ کے حلف کا کوئی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا۔ایک شق کے غیر اسلامی ہونے کی تو کیا بات‘ جس آئین کے تحفظ کا حلف اٹھایا جاتا ہے اس میں غیر اسلامی دفعات‘ اسلامی دفعات سے کہیں زیادہ ہیں۔ہم ذیل میں اس کتابچے میں شامل چند غیر اسلامی دفعات کا ذکر کرتے ہیں تا کہ باطل نظام کی قلابازیاں اور اٹکل پچوا جاگر ہو:

طرزِ انتخاب

کسی بھی نظام میں طرزِ انتخاب کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اس لئے کہ معرضِ وجود میں لائے جانے والے نظام کی یہ پہلی اینٹ ہے۔ اگر یہ پہلی اینٹ ٹیڑھی لگ جائے تو تا ثریا دیوار کج ہی جائے گی۔قرآن وسنت کو تو یہ طرزِ انتخاب وضع کرتے وقت درخورِ اعتناء ہی نہ سمجھا گیا‘ اپنی خواہشات اور رسمِ زمانہ کی پیروی کرتے ہوئے اس میں ’’ہر بالغ فرد‘ ایک ووٹ‘‘ کے اصول کو اپنایا گیا۔ اسلامی تاریخ کے ورق الٹیے‘ بار بار الٹیے‘ چاروں خلفاء راشدین میں سے کسی ایک کا انتخاب بھی اس اصول کے مطابق نہ ہوا۔آخر کیوں؟ اس لئے کہ قرآنِ مجید اس اصول کے برعکس مستقل ایک اور اصول دیتا ہے۔قرآنِ کریم میں بار بار آیا ’’اکثر الناس لا یعلمون ......لوگوں کی اکثریت ہمیشہ جاہل ہوتی ہے‘‘۔ بالفاظِ دیگر جس نظام کی اٹھان لوگوں کی اکثریت کے بل بوتے پر ہو گی‘ وہ نظام لازماً جاہلانہ ہو گا۔اسلام میں حقِ رائے دہی صرف اربابِ حل و عقد یعنی پہلے سے

موجود اولی الامر کو حاصل ہے اور بس۔ خود امیدوار کھڑے ہو کر اپنے حق میں ووٹ مانگتے پھرنا اور اپنی تعریف خود کرتے پھرنا باطل نظام کی پرورش کرنے کا ایک اور ذریعہ ہے۔ اسلام پہلے ہی قدم پر اس بھیانک روش کا قلع قمع کرتا ہے۔ رسولؐ کا ارشادِ گرامی ہے:

''نہیں دیتے عہدہ ہم اسے جو خود مانگتا اور تانکتا پھرے''(مسلم)

ہمارے ہاں کا مروجہ طرزِ انتخاب تو ویسے ہی قمار بازی کی ایک بھیانک اور وسیع تر شکل ہے۔ جوئے کی فقہی تعریف یہ ہے کہ ایسا کھیل جس میں چند جوئے باز سرمایہ لگاتے ہیں۔ پورے لگائے گئے سرمایہ کا فائدہ ایک جوئے باز لے اڑتا ہے' باقی تمام ہاتھ ملتے گھر لوٹتے ہیں۔ یہی تو ہمارے ہاں انتخابات میں ہوتا ہے۔ ایک حلقے میں چند افراد سرمایہ لگاتے ہیں۔ پورے لگائے گئے سرمائے کا فائدہ منتخب ہونے والا قمار باز لے اڑتا ہے' باقی تمام ہاتھ ملتے گھر لوٹتے ہیں۔ تھڑے پر جوا کھیلنے والے قمار بازوں اور انتخاب لڑنے والے جوابازوں میں البتہ ایک فرق تو یہ ہوتا ہے کہ تھڑے پر کھیلنے والے معمولی سرمایہ لگاتے ہیں جب کہ انتخابات لڑنے والے لاکھوں کی سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ تھڑے پر جواء کھیلنے والوں کو پولیس آ پکڑتی ہے جب کہ انتخابی قمار بازوں کو حکومتِ وقت خود ہر سہولت میسر کرتی ہے تا کہ وہ جی بھر کر کھیلیں۔ پھر تھڑے پر چھوٹے پیمانے پر قمار بازی کرنے والوں کے خلاف علماء کرام فتویٰ صادر کرتے ہیں جب کہ انتخابی قمار بازی علماء کرام خود کھیلتے ہیں۔

اولی الامر

73ء کے آئین کے مطابق کوئی بھی غیر مسلم رکنِ شوریٰ' رکنِ کابینہ اور رکنِ عدلیہ ہو سکتا ہے' صرف صدر اور وزیرِ اعظم کے لئے مسلمان ہونا لازمی ہے۔ ایسا بھی رسمِ زمانہ کی نقالی اور انسانی خواہشات کی پیروی میں کیا گیا ہے۔ اسلامی احکامات کے مطابق ہر وہ مسلمان اولوالامر کا حصہ ہے جو کسی ایسی اسامی پر تعینات ہو کہ جہاں پالیسی امور طے ہوتے ہوں یا سماجی طور پر وہ ایک فائز مقام ہو۔ شوریٰ' عدلیہ' کابینہ کے اولوالامر ہونے میں کوئی کلام ہے ہی نہیں۔ ربِ

کائنات تو مومنوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ ''اولی الامر منکم ......یعنی اولوالامر مسلمانوں میں سے ہونے چاہیئے'' بالخصوص ارکانِ شوریٰ کیلئے تو مجتہد ہونا لازمی ہے۔ بتایا جائے کہ درج ذیل حکم کیا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے یا نہیں؟

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں' پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ و رسولؐ کی طرف پھیر دو اگر واقعی تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر'' (نساء:59)۔

ایک طرف اللہ تعالیٰ کا غیر مسلموں کو اولوالامر میں شامل نہ کرنے کا حکم' دوسری طرف اپنی خواہشات کی پیروی میں 73ء کے آئین میں غیر مسلموں کو اولوالامر میں شامل کرنے کا قانون' بتایئے طاغوت اور کیا ہوتا ہے؟ کیا یہی قصور نہیں تھا نامراد فرعون کا؟ کس قدر ڈھٹائی؟ ڈوب مرنے کا مقام ہے ان حضرات کیلئے جنہوں نے طاغوتی دستاویز پر آج سے کوئی تیس سال پہلے مہرِ تصدیق ثبت کی اور آج تک اس عظیم حادثاتی غلطی کو دہرائے جا رہے ہیں۔

قرآنی معیارِ اہلیت

قرآن جب انتخابات کی بات کرتا ہے تو اس کے لئے پانچ اوصاف پر مشتمل معیارِ اہلیت بھی دیتا ہے۔ بڑا اہم کام ہے عوامی نمائندوں کے لئے معیارِ اہلیت مقرر کرنے کا۔ اسلام اس بارے میں کیسے خاموش رہ سکتا تھا؟ پانچ اوصاف یعنی ایمان (نور:55)' تقویٰ (حجرات:13)' صلاح (نور:55)' علم اور جسم (بقرۃ:247) پر مشتمل معیارِ اہلیت خود قرآن میں دیا گیا۔ ہمارے ہاں کے مروجہ طریقِ انتخاب جسے 73ء کے آئین کی پشت پناہی حاصل ہے کی دفعات 62 اور 63 میں گو معیارِ اہلیت دینے کی بودی سی کوشش کی گئی ہے لیکن وہ اسقدر نا قابلِ عمل ہے کہ عملاً صرف ایک ہی اہلیت وجہ کامیابی بن کر رہ گئی ہے اور وہ اہلیت ہے ''سرمایہ داری'' یعنی سرمایہ کاری کرنے کی استعداد۔ ربِ کائنات کو پتہ تھا کہ عیار لوگ سرمائے کے بل بوتے پر لوگوں کو رام کرنے کی جسارت

کریں گے لہٰذا اس نے جس آیۂ مبارکہ میں علم اور جسم جیسے دو اہم اوصاف کو قرآنی معیارِ اہلیت کا حصہ بنایا اسی میں سرمایہ داری و سرمایہ کاری کو معیارِ اہلیت بنانے کی نفی کر دی۔ ملاحظہ ہو قرآن:

''ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے ''ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے''۔ نبی نے جواب دیا ''اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسے منتخب کیا ہے اس لئے کہ اسے علم اور جسم کی اہلیتیں فراوانی سے عطا کی ہیں......'' (بقرۃ: 247)۔

عورت کی سربراہی

اسلام کے معاشرتی و سیاسی نظام میں چھوٹے سے چھوٹا انتظامی یونٹ ''گھر'' ہے۔ یہ یونٹ چھوٹا تو ہے لیکن اس قدر بنیادی کہ کوئی بھی معاشرہ و تمدن بالآخر گھروں کے مجموعے سے بنتا ہے۔ جیسی اینٹ ویسی دیوار کے مصداق جیسا یہ بنیادی یونٹ ہو گا ویسا ہی معاشرہ معرضِ وجود میں آئے گا۔ اسلام نے بنابریں اس یونٹ کی ہیئت و کارکردگی کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ خود قرآنِ مجید میں جتنی ہدایات گھریلو زندگی کے متعلق ہیں کسی اور یونٹ کے متعلق نہیں۔ پتے کی بات جو یہاں کی جانی مطلوب ہے، یہ ہے کہ اسلام اس چھوٹے سے چھوٹے یونٹ کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ میں نہیں، نہ صرف مرد کے ہاتھ تھماتا ہے بلکہ اس تھمانے کی مصلحت بھی بیان کرتا ہے۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں......'' (نساء: 34)۔

ظاہر ہے جب اسلام چھوٹے سے چھوٹے انتظامی یونٹ کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ نہیں تھماتا تو وہ پورے ملک کی قیادت کو صنفِ نازک کے سپرد کرنے کا کیسے روادار ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا حکم تو سپریم ہے، خود ساختہ آئین کے مصنفین اگر سوچتے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی جب اپنے گھر کی قیادت اپنی بیوی کے سپرد کرنے پر آمادہ نہیں تو پورے ملک کی سربراہی اس کے ہاتھ

دینے کی حماقت کیوں؟

آئین کے مصنفین تو ظاہر ہے اپنی خواہشات کے اور رسمِ زمانہ کی پیروی کر ہی رہے تھے' حسرت تو ان علماء کرام اور دینی سیاسی جماعتوں پر ہے جو فریب میں آ کر رسول ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کو بھی گول کر گئیں کہ وہ قوم تباہ ہوگئی جس نے اپنی باگ ڈور عورت کے ہاتھ تھما دی۔ اس ایک غیر اسلامی قدم یعنی عورت کی سربراہی کی گنجائش پیدا کرنے سے خود ساختہ آئین کے وہ حصے جو سربراہِ مملکت (The President) اور وفاقی حکومت (The Federal Govt.) پر مشتمل ہیں سب غیر اسلامی قرار پاتے ہیں۔

دو سربراہان

اسلامی حکومت میں سربراہ کی حیثیت' مشروط سہی' مطاع کی ہوتی ہے۔ سربراہِ وقت کی اطاعت اسی طرح لازم کہ جس طرح اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت۔ مطاع کو اگر دو یا زیادہ عہدوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ایسے عہدے دار اسی طرح باہم متصادم ہو جاتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ اگر دو الٰہ ہوتے تو کائنات کا نظام کبھی نہ چل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر دی گئی سورۂ نساء کی آیت نمبر 34 میں مرد کو قوام بناتے وقت ایک وجہ یہ دی گئی ہے کہ کسی بھی انتظامی یونٹ میں ایک کو افضل (سربراہ) بنانا بہر حال لازمی ہے۔ خود ساختہ آئین میں دو سربراہوں...... ایک سربراہِ مملکت (صدر) اور دوسرا سربراہِ حکومت (وزیرِ اعظم) کی پروویژن اس قدر غیر اسلامی ہے کہ اس نے پورے آئین کو اسلام کے خلاف کھڑا کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں آئے دن صدر اور وزیر اعظم کی باہمی چپقلش نے تو تجربے سے بھی ثابت کر دیا ہے کہ مطاع کو منقسم نہیں ہونا چاہیئے۔ یاد رہے دورِ خلافتِ راشدہ کا اختتام ہوا ہی تو اس وقت جب ایک خلیفہ کی موجودگی میں دوسرے خلیفہ کی بیعت ہونے لگی۔ خلافتِ وقت کا دو سربراہوں میں بٹ جانا اسلامی تاریخ کا وہ عظیم حادثہ ہے کہ جس سے اتری ہوئی گاڑی آج تک پٹڑی پر نہیں چڑھ پائی۔ کس قدر پتے کی بات بتا دی ہوئی ہے ہادیٔ برحق نے' فرمایا:

’’جب دو خلیفہ سے بیعت کی جاوے تو جس سے آخر میں بیعت ہوئی ہو اس کو مار ڈالو‘‘۔(اس لئے کہ اس کی خلافت پہلے خلیفہ کے ہوتے ہوئے باطل ہے)۔(مسلم)

یوں خود ساختہ آئین کا وہ حصہ جو صدر‘ وزیراعظم بلکہ پروِنشیل گورنمنٹس‘ گورنروں‘ صوبوں اور فیڈریشن کے باہمی تعلقات وغیرہ پر پھیلا ہوا ہے تمام غیر اسلامی قرار پاتا ہے۔

مجلسِ شوریٰ (The Parliment)

رسمِ زمانہ نے آئین کے مصنفوں کو مجلسِ شوریٰ کے ساتھ بریکٹ میں (The Parliment) لکھنے پر مجبور کیا ورنہ اسلامی شوریٰ کو پارلیمنٹ سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ مشرق کو مغرب سے۔ دونوں کے فرائضِ منصبی ہی میں 180 درجے کا فرق ہے۔ مروجہ پارلیمنٹ ایک قانون ساز ادارہ ہے جس میں بندوں کی کی ہوئی قانون سازی (جو محض ارکانِ پارلیمنٹ کی خواہشات پر مبنی ہوتی ہے) کے مطابق کاروبارِ حکومت اور کاروبارِ زندگی چلتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی شوریٰ‘ خلیفۂ وقت جس کا حصہ ہوتا ہے‘ کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں۔ وہ قانون سازی نہیں کر سکتے‘ قانون سازی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ ’’ان الحکم الا للہ‘‘۔ شوریٰ کا اصل‘ بلکہ اگر واحد فرضِ منصبی کہا جائے تو مضائقہ نہیں‘ ہر اس معاملہ میں قرآن وسنت کی روشنی میں اجتہاد کر کے خلیفۂ وقت کو مشورہ دینا ہوتا ہے کہ جس کے بارے میں خلیفۃ المسلمین کو براہِ راست قرآن وسنت سے ہدایات نہ ملیں۔ اجتہاد کی اس پرویژن سے ہی قرآن وسنت وہ درجہ اختیار کرتے ہیں کہ جسے قرآن ہی میں ’’الیوم اکملت لکم دینکم‘‘ کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ سینکڑوں ایسے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ جن کے متعلق براہِ راست قرآن وسنت سے ہدایات نہیں ملتیں۔ اسلام میں اجتہاد کی پرویژن ایسے ہی موقع کے لئے ہے۔

دو ایوان

خود ساختہ آئین کا وافر حصہ دو ایوانوں یعنی قومی اسمبلی اور سینٹ کے لئے مختص ہے

حالانکہ اسلام میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں اس لئے کہ جس کیفیت وصورتِ حال کے لئے سیکولر دنیا میں یہ دوایوانی پارلیمنٹ بنائی جاتی ہے وہ اسلام میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ رسمِ زمانہ کی نقالی میں ہمارے ہاں بھی قومی اسمبلی کا وجود تو مختلف صوبوں کی آبادی کے متناسب ارکان پر مشتمل ہے جب کہ سینٹ میں تمام چھوٹے بڑے صوبوں سے لئے گئے ارکان کی تعداد برابر ہے۔ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ ارکانِ قومی اسمبلی کسی بڑے صوبے سے تعلق رکھتے ہوئے اپنی اکثریت کی بناء پر کسی دوسرے صوبے کو نفع یا نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اسلام میں فیصلے (نہ کہ قانون سازی) جب کرنے ہی قرآن وسنت کے مطابق ہیں تو علاقے' زبان یا کسی اور بنیاد پر کسی کے نفع یا نقصان پہنچانے کا امکان ہی کہاں کہ دوایوانوں کی ضرورت پڑے۔ اسلام میں تو یہ بھی ضروری نہیں کہ خلیفۂ وقت ارکانِ شوریٰ کی اکثریت کی رائے پر عمل کرے۔ اگر خلیفۃ المسلمین کو تمام ارکانِ شوریٰ کے مقابلہ میں صرف ایک رکنِ شوریٰ کی رائے قرآن وسنت کے قریب تر محسوس ہو تو وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ یہ تو محض ایک رکن کی رائے ہے۔ ترجیح قرآن وسنت کو ہے نہ کہ اکثریت کی رائے کو۔ مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پوری شوریٰ کی رائے کو ٹھکرا دیا۔ وقت نے ثابت کیا کہ ان کا فیصلہ ہی قرآن وسنت سے قریب تر تھا۔

اسلام کی رو سے البتہ دوایوان کا ہونا اس طور جائز بلکہ ترجیح کا حامل ہے کہ ایک ایوان مرد حضرات کے لئے مختص ہو تو دوسرا خواتین کے لئے اور ہر دو کی اہمیت ووقعت یکساں ہو۔ اس سے ایک تو مخلوط مجلس' جو شریعت کی صریحاً خلاف ورزی ہے' کا انعقاد ختم ہو جائے گا اور دوسرے خواتین کھل کر بہتر انداز میں اپنی رائے اور فیصلے کا اظہار کر پائیں گی۔ شوریٰ کی اصل روح یہی ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل

73ء کے آئین میں مجلسِ شوریٰ کے علاوہ اسلامی نظریاتی کونسل کا وجود تو اسلام کے ساتھ ایک سنگین مذاق ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اور جیسا کہ شوریٰ کے نام ہی سے عیاں ہے' شوریٰ کا اصل کام اجتہاد کرتے ہوئے خلیفہ کو مشورہ دینا ہے۔ اجتہاد' ظاہر ہے وہ کر سکتا ہے جس کا

نہ صرف قرآن وسنت پر کلی عبور ہو بلکہ وہ عالمی امور سے بھی پوری طرح آگاہ ہو۔اسی لئے تو عوامی نمائندوں کیلئے قرآنی معیارِ اہلیت میں ایک شرط ''علم'' کی ہے۔کس قدر غیر اسلامی ہے 73ء کا آئین کہ اَن پڑھ تک کو رکنِ شوریٰ ہونے کی اجازت دیتا ہے۔یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی کالج میں لیکچرر تو اَن پڑھ کو تعینات کر دیا جائے اور پھر اس کمی کو پورا کرنے کیلئے اہل افراد کی ایک علیحدہ ٹیم بنا کر خواہ مخواہ کالج کے بجٹ پر بوجھ ڈالا جائے۔کیا یہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی 180 درجے مخالفت نہیں جسمیں کہا گیا ہے کہ ''امانتیں (عہدے) اہل افراد کے سپرد کرو'' (نساء:58)۔

وفاقی شرعی عدالت

شرعی عدالت کی 73ء کے آئین میں پروِیژن سے تو سو فیصد عیاں ہے کہ اس آئین کو بنایا ہی گیا اسلام کا مذاق اڑانے کیلئے ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت شرعی ہے تو کیا پاکستان میں کوئی غیر شرعی عدالت بھی مطلوب ہے؟ عدالت اور غیر شرعی' چہ بوالعجبی ؟ انسان جب قانون سازی کرے گا تو ایسی قانون سازی کا تضادات کا مجموعہ ہونا لازمی ہے۔

طریقِ قانون سازی

قانون سازی اور بندوں سے ''ان الحکم الا للہ'' کی کھلم کھلا خلاف ورزی تو ہے ہی' بیچارے رحمت کا ہاتھ کانپ رہا ہے اس طریقِ قانون سازی کو تحریر میں لاتے جو 73ء کے جمہوری آئین میں درج ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

قانون سازی یا متبادل قانون سازی کی تحریک خواہ عدالت کی طرف سے ہو' اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے یا کسی رکنِ شوریٰ کی طرف سے' دو صورتوں سے دوچار ہوتی ہے۔پہلی صورت تو یہ کہ حکومتِ وقت ایسی ترمیم یا قانون سازی کو دل سے قبول نہیں کرتی۔ایسا ہو تو حیلے بہانے بیل کبھی منڈھے نہیں چڑھتی اس لئے کہ حکومتِ وقت کے پاس ٹالنے کے اَن گنت طریقے ہوتے ہیں۔تجربہ شاہد ہے وہ ٹالتی ہی چلی جاتی ہے۔اگر پارلیمنٹ میں معاملہ آ ہی جائے تو چونکہ

پارلیمنٹ میں حکومتِ وقت کی اکثریت ہوتی ہے لہٰذا معاملہ وہی بن جاتا ہے کہ کب گوندھا جائے' کب پکایا جائے اور کب کھانے کی نوبت آئے؟ یاد رہے 1973ء کے آئین کے کئی قوانین عدالتوں سے غیر شرعی قرار پائے اور ان کو تبدیل یا ترمیم کرنے کی سفارش کے باوجود آج تک ترمیم نہیں کر پائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حکومتِ وقت بھی ترمیم یا نئی قانون سازی کے حق میں ہوتی ہے اور دل و جان سے ترمیم کرنا چاہتی ہے لیکن خود ساختہ آئین میں ترمیم کیلئے دو تہائی اکثریت کا ہونا لازمی ہے۔ یاد رہے کہ تاریخِ پاکستان میں کم ہی ایسا ہوا ہے کہ حکومتِ وقت کو دو تہائی اکثریت حاصل ہو اور یہ دو تہائی اکثریت کا میسر نہ ہونا صدیوں پر بھی محیط ہو سکتا ہے۔ ایسے میں مطلوبہ ترمیم کا کیا حشر ہوگا؟ یہی نہ کہ عدالتیں بھی' حکومتِ وقت بھی حتیٰ کہ پوری قوم بے بس ہوگی۔ ترمیم نہیں کر پائے گی خواہ عدالت میں آئین کے جس حصے کو بدلنا ہے' وہ غیر شرعی قرار پا چکا ہو۔ اللہ تعالیٰ کل کو میدانِ حشر میں پوچھے گا کہ خود ایک دفعہ/شق کو غیر شرعی قرار دینے کے بعد تم اس کے ساتھ کیوں چمٹے رہے؟ ظاہر ہے' جواب یہی ہوگا کہ ہمارے ہاتھ دو تہائی اکثریت نہ ہونے کی وجہ سے بندھے تھے۔ بتایئے' اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ عذر کیا قابلِ قبول ہوگا؟ اللہ تو یہی کہے گا کہ تم کو کس حکیم نے کہا تھا کہ ہاتھ باندھنے والا کتابچہ خود تیار کر کے اسے آئینِ مملکت قرار دے دو۔ میرے عطا کردہ ازلی و ابدی آئین کو مہجور و مفلوج کر کے یہ خود ساختہ آئین بنانے کی تم نے جسارت و حماقت کی ہی تو کیوں؟ یہی تو وہ موقع ہوگا جب اپنی امت کی کبھی شکایت نہ کرنے والے نبی ﷺ پکار اٹھیں گے تو یوں:

''اے اللہ! میری قوم نے اس قرآن کو مہجور کئے رکھا'' (فرقان:30)۔

بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرض کیجئے کہ حکومتِ وقت کو پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت حاصل ہے اور وہ اس قابل ہے کہ مطلوبہ ترمیم کر سکے۔ لیکن ''زلف کو سر ہونے تک'' مزید کئی مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جن کا ذکر تک کرنا مناسب نہیں۔ بندے اور اللہ و رسول ﷺ کے احکامات کی منظوری دیں' طاغوت اور کیا ہوتا ہے؟

لیکچر نمبر 5

نظامِ خلافت قائم ہو آج تو کیسے؟

ایک مسلمان ریفرنس کا پابند ہے، من مرضی یا شتر بے مہار کی سی زندگی نہیں گزار سکتا۔ ریفرنس قرآن وسنت ہے اور بس۔ مسلمانی ہے ہی یہی کہ چھوٹے سے چھوٹا کام مثلاً پانی کا گھونٹ بھی پیا جائے تو مسنون طریقے سے پیا جائے۔ پیغمبرؑ کو کتاب کے ساتھ بھیجا ہی اس لئے جاتا ہے کہ وہ احکاماتِ الٰہی کی الٰہی تعبیر عملاً کر کے دکھا دے۔ بصورتِ دیگر تو کسی بھی حکم کی متعدد تعبیریں کی جانے اور بنابریں اشتباہ میں پڑنے کا امکان ہے۔ ہم عصرِ حاضر کے مسلمان، طے شدہ ترتیب و ترکیب کے مطابق، صرف قرآنی احکامات کے پابند ہی نہیں، اسوۂ رسول ﷺ کے بھی پابند ہیں۔

جب لازم ٹھہرا کہ ہم مسلمانوں نے کوئی بھی کام کرنا ہے تو مسنون طریقے سے کرنا ہے تو نظامِ خلافت قائم کرنے کیلئے بھی مسنون طریقے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔ غلط فہمی کی بنا پر کچھ لوگ یہ فرض کر بیٹھے ہیں کہ جیسے نظامِ خلافت قائم کرنے کا کوئی مسنون طریقہ ہے ہی نہیں۔ حیرانگی کی بات ہے کہ ایسے حضرات یہ نہ سوچ پائے کہ پانی پینے، کھانا کھانے، سونے جاگنے، خریدنے، بیچنے، لڑنے، صلح کرنے وغیرہ غرضیکہ ہر ہر کام کیلئے تو مسنون طریقہ ہے تو طریقِ قیامِ خلافت ہی کیا اتنا غیر سنجیدہ اور غیر اہم کام ہے کہ اس کا کوئی مسنون طریقہ نہیں۔ حالانکہ نظامِ خلافت یا بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کی فی الارض حکومت قائم کرنے کا کام تو مقصدِ بعثت نبوت اور مقصدِ تخلیقِ آدم ہے۔ دورِ نبوت کے ایک طرف دورِ جہالت تو دوسری طرف دورِ خلافت۔ اسوۂ رسول ﷺ کیا ٹھہرا، ظاہر ہے کہ نظامِ خلافت کا قیام۔ پھر یہ بھی کہ جس دین کی تکمیل کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے اعلان کروایا وہ مکمل کیسے ہوا اگر قیامِ خلافت کے طریقِ کار سے عاری ہو؟ آئندہ صفحات میں پیش کی گئی گزارشات سے، انشاء اللہ، دو اور دو چار کی طرح واضح ہو جائے گا کہ قرآن وسنت میں قیامِ خلافت کا مربوط، منضبط اور دوٹوک مسنون طریقہ موجود ہے۔

حصولِ اقتدار لازمی

ہمارے ہاں ایک اور غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حصولِ اقتدار اور کارِ سیاست دنیا دارانہ کام ہے جس سے علماءِ کرام اور دانشوارانِ امت کو اجتناب کرنا چاہیئے۔ یہ غلط سوچ دورِ ملوکیت میں اس لئے پیدا کی گئی کہ ملوک نہیں چاہتے تھے کہ ان کی من مانیوں میں قرآن وسنت کی پابندیاں حائل ہوں۔ اس کا حل انہوں نے یہ ڈھونڈا کہ دینِ حق کو سیاست اور مذہب کے دو علیحدہ علیحدہ دوائر میں تقسیم کر دیا۔ انہوں نے خود تو سیاست و اقتدار کی مسند سنبھال لی جبکہ دینی رجحانات رکھنے والے عناصر کو اہلِ مذہب قرار دے کر مدرسوں اور دارالعلوموں کی طرف دھکیل دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اہلِ سیاست سیکولر نظام کے قریب تر ہوتے چلے گئے جبکہ اہلِ مذہب درس وتدریس اور گنتی کی چند رسوماتِ عبودیت میں منہمک ہو گئے۔ آج دینِ حق کا وجود زیرِ آسماں مفقود ہے۔ جس دین کو آج کے ہم مسلمان اختیار کئے ہوئے ہیں وہ اس دین سے یکسر مختلف ہے جو رسول ﷺ امت کے سپرد کر کے گئے تھے۔ سپرد کردہ دین میں خلیفۃ المسلمین، اولوالامر، شوریٰ، امت وغیرہ کا وجود تھا، ہمارے اختیار کردہ دین میں نہیں۔ امتِ مسلمہ بھی درجنوں اقوام کا روپ دھار چکی۔ یعنی ہمارا اختیار کردہ دین اس مردے کی مانند ہے جس میں بظاہر تمام اعضاء و جوارح تو موجود ہوتے ہیں، نہیں ہوتی تو روح۔ سیاست و مذہب کی یہ تقسیم ہمارے لئے اسی طرح سود مند ہونے کی بجائے مضر ہو گئی ہے جس طرح پانی جیسا انتہائی سود مند مشروب آکسیجن اور ہائیڈروجن میں منقسم ہو کر برعکس صفات کا حامل ہو جاتا ہے۔ پانی آگ کو بجھاتا ہے جبکہ آکسیجن دوسری چیزوں کو جلانے میں مددگار ہوتی ہے اور ہائیڈروجن گیس خود جلتی ہے۔

حاملینِ نظامِ خلافت صرف مقتدر ہی نہیں ہوتے بلکہ ایسے مقتدر جس کی نظیر کسی دوسرے نظام میں نہیں ملتی۔ اسلام امامتِ سیاست (امامتِ کبریٰ) اور امامتِ صلوٰۃ (امامتِ صغریٰ) کو اس خلیفۃ المسلمین میں مجتمع کرتا ہے جس کی اولوالامر میں مرکزی حیثیت ہوتے ہوئے مشروط سہی، اسی طرح اطاعت لازم جیسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت۔ خلیفۃ المسلمین

پوری اسلامی دنیا کا حکمران بھی ہوتا ہے تو دارالخلافہ کی مرکزی مسجد کا خطیب وامام بھی۔ اسلام غلبۂ دینِ حق کو لازم قرار دیتا ہے لیکن یہ غلبہ اس وقت تک حاصل ہی نہیں ہوتا جب تک کہ پہلے خلیفہ و خلافت کا وجود نہ ہو یا نظامِ خلافت کی طاقت میسر نہ ہو۔ خلافت نام ہے اللہ کی حکومت کا اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی حکومت صرف مقتدر ہی نہیں ایسی مقتدر ہوتی ہے جس کے پائے کی کوئی دوسری طاقت نہیں ہوتی۔ ایسا ہی ہو تو حق بحق دار رسید کی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول ﷺ نے اپنے دورِ نبوت کا ایک ایک لمحہ نظامِ خلافت قائم کرنے میں لگایا۔ سلسلۂ نبوت ختم ہونے پر یہ کام اب امتِ مسلمہ کے فرائض میں اولیں حیثیت کا حامل ہے۔ نظامِ خلافت قائم کرنے کا مطلب اصل میں اللہ تعالیٰ کے اقتدار کو قائم کرنا ہے' کسی انسان کا اپنا ذاتی اقتدار نہیں۔

حصولِ اقتدار کا انوکھا طریقِ کار

دنیا میں انقلاب لانے کے چار طریقے معروف ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک طاقتور گروہ کسی کمزور گروہ پر قابو پا کر اقتدار حاصل کر لے۔ کسی بیرونی حملہ آور کا اقتدار پر قابض ہو جانا اسی طریقے کی مثال ہے۔ فوج کا سویلین حکومت کو چلتا کر کے خود قابض ہو جانا بھی اسی کی مثال ہے۔ دوسرا طریقہ بذریعہ سازش اقتدار حاصل کرنے کا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان پر اور اسرائیل کا فلسطین پر قابض ہو جانا اسی طریقے کی مثالیں ہیں۔ تیسرا طریقہ بذریعہ سٹریٹ پاور یا عوامی بغاوت اقتدار حاصل کرنے کا ہے۔ انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس اسی کی مثالیں ہیں۔ چوتھا طریقہ بذریعہ انتخابات اقتدار حاصل کرنے کا ہے۔ یاد رہے انبیاء نے ان چاروں طریقوں میں سے کسی کو بھی اختیار نہ کیا' انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کو بروئے کار لا کر انقلاب لانے کا ہے۔ آیئے دیکھیں کس قدر یکتا و منفرد طریقِ کار ہے یہ!

تین باتوں کا ادراک ضروری

تفصیلات بعد میں پہلے تین بنیادی باتیں نوٹ کر لیں۔ رسول ﷺ کے لائے

ہوئے انقلاب کو کما حقہ نہیں سمجھا جا سکتا جب تک ان تین باتوں کا آغاز ہی میں ادراک نہ کر لیا جائے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہجرت مدینہ پر یہ انقلاب وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ اس کے بعد مدنی دورِ نبوت اور دورِ خلافتِ راشدہ میں جو جدوجہد ہوئی اور حقیقتاً بھرپور ہوئی وہ استحکام و وسعتِ انقلاب اور غلبۂ دینِ حق کے لئے تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے تو ایک پناہ گزین کی حیثیت میں نہیں' بطور حکمران وارد ہوئے۔ مدینہ کی نوزائیدہ و نوخیز اسلامی ریاست' خواہ کتنی ہی چھوٹی تھی ایک خودمختار ریاست تھی اور رسول ﷺ اس کے فرمانروا تھے۔ دوسری بات جس کا ادراک بہت ضروری ہے یہ ہے کہ نظامِ خلافت کا انعقاد کوئی جزوی نہیں کلی تبدیلی ہے۔ جزوی اصلاح (Patch Work) کی قطعاً اجازت نہیں۔ ''ادخلوا فی السلم کافہ'' سے کم تر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاخ تراشی وغیرہ سے کام نہیں بنتا' شجرِ خبیثہ کو جڑ سے اکھاڑ کر شجرِ طیبہ کو نئے سرے سے کاشت کرنا ہوتا ہے۔ تیسری بات جو ذہن میں ازبر ہونی چاہئے یہ ہے کہ مجموعی طور پر یہ انقلاب دو ادوار میں منقسم ہے' دورِ قیامِ خلافت اور دورِ دوامِ خلافت۔ دورِ قیامِ خلافت وہ دور ہے جس کے اختتام پر یہ عظیم انقلاب وقوع پذیر ہوا اور دورِ دوامِ خلافت وہ دور ہے جس میں اس لائے ہوئے انقلاب کو استحکام و وسعت نصیب ہوئی۔ بالفاظِ دیگر مکی دورِ نبوت' قیامِ خلافت کا دور ہے تو مدنی دورِ نبوت بشمول دورِ خلافت راشدہ دوامِ خلافت کا دور ہے۔ قیامِ خلافت اور دوامِ خلافت کے ان ادوار کو اس لئے ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہر دور میں اپنائی گئی حکمتِ عملی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ آج کی دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کرنے والے نوٹ کر لیں کہ انہیں دوامِ خلافت سے پہلے قیامِ خلافت کا مرحلہ درپیش ہے۔ ان دونوں ادوار میں اپنائی گئی حکمتِ عملیوں کو اگر باہم گڈمڈ کر دیا جائے تو اسلامی انقلاب کا کوئی سوال نہیں۔ قیامِ خلافت اور دوامِ خلافت میں اپنائے گئے مسنون طریقِ کار کا ذکر ہم یہاں پر علیحدہ علیحدہ کرتے ہیں۔

قیامِ خلافت کا مسنون طریقِ کار

قیامِ خلافت اور دوامِ خلافت کی جدوجہد کا فرق

قیامِ خلافت اور دوامِ خلافت میں اپنائے گئے طریقِ کار میں کم از کم دو نمایاں فرق ایسے ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔

ا۔ دعوت بلا تشدد

پہلا نمایاں فرق یہ ہے کہ مکی دورِ نبوت یا دورِ قیامِ خلافت میں جہاد بالسیف نہیں ہوا۔ تلوار کا استعمال تو درکنار کسی مسلمان نے کبھی کسی دشمن کو تھپڑ تک نہیں مارا بلکہ گالی تک نہیں دی۔ قوتِ بازو کا استعمال قطعاً ممنوع ٹھہرا۔ مسلمانوں نے مار ضرور کھائی اور حقیقتاً خوب کھائی لیکن خود کسی کو نہیں مارا۔ کمینگی کا مقابلہ شرافت سے کیا اور بدی کا جواب نیکی بلکہ بہتر نیکی سے دیا۔ دورِ قیامِ خلافت میں اقدام کا کوئی سوال نہیں۔

خفیہ دعوت کے دور میں ایک دفعہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ہاتھوں کسی حملہ آور دشمن کے سر میں معمولی سی چوٹ آ گئی تو نبی رحمت ﷺ نے اسے ساتھیوں کی تربیت میں کمی گردانا اور بلا تاخیر دارِ ارقم کو مسلمانوں کے لئے اجتماع و تربیت کا مرکز بنایا۔ دورِ دعوت میں ہی ایک دفعہ ایک شخص رسول ﷺ کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ صدیقِ اکبرؓ خاموشی سے اس کی گالیاں سنتے رہے اور نبی رحمت ﷺ بھی اس موقع پر مسکراتے رہے۔ آخر کار جب صدیقِ اکبرؓ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو انہوں نے بھی جواباً قدرے ترش بات کہہ دی۔ رسول ﷺ کو اچھا نہ لگا (لگتا بھی کیسے یہ تو قیامِ خلافت کا دور تھا) اور وہاں سے تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی پیچھے ہو لئے اور راستے میں ہی جا کر عرض کی کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ جب تک وہ مجھے گالیاں دیتا رہا آپ ﷺ مسکراتے رہے اور جب میں نے جواب دیا تو آپ ﷺ ناراض ہو گئے؟ فرمایا کہ جب تک تم خاموش تھے' ایک فرشتہ تمہاری طرف سے اس کا جواب دیتا رہا مگر جب تم

بولے تو فرشتے کی جگہ شیطان آ گیا' میں شیطان کے ساتھ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

یاد رہے وہ جہاد جو دورِ مکی میں ہوا محض بالقلب اور باللسان تھا' بالقوۃ ہوا ہی اس وقت جب مدینہ میں ایک اسلامی ریاست' غیر اسلامی ریاستوں کے مقابلہ میں معرضِ وجود میں آ گئی۔

۲۔انقلاب بلا انتخاب

جیسا کہ ہم نے اوپر انقلاب بذریعہ انتخابات غیر مسنون قرار دیا ہے' دورِ قیامِ خلافت اور دورِ دوامِ خلافت کا دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ دورِ قیامِ خلافت میں انتخابات کا کوئی سوال نہیں۔ یہ امر بعض لوگوں کے ذہن میں الجھاؤ پیدا کرتا ہے اس لئے کہ وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اسلام میں انتخابات تو ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں انتخابات ہیں لیکن یہ انتخابات اسلامی نظام کو لانے کیلئے نہیں' اسلامی نظام لانے کے بعد اسے چلانے کے لئے ہیں۔ مکی دورِ نبوت میں اگر انتخابات کے ذریعہ تبدیلی لائی جاتی تو انقلاب کبھی واقع نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر دورِ خلافتِ راشدہ یعنی دورِ دوامِ خلافت میں انتخابات نہ ہوتے تو بنی بگڑ جاتی۔ ملوکیت اصل میں داخل ہوئی اس وقت جب انتخابات نہ ہوئے۔

یہ دو نمایاں فرق تو دورِ قیامِ خلافت اور دوامِ خلافت میں حدِ فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب ہم دو ایسے پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں جن پر عمل تو ہر دو ادوار میں لازمی ہے لیکن دورِ قیامِ خلافت میں ان کی اہمیت قدرے زیادہ ہے۔ بالفاظِ دیگر ان پر عمل کئے بغیر بھی اسلامی انقلاب نہیں آ سکتا۔

ا۔دعوت الی اللہ ہی نہیں' طاغوت سے اجتناب بھی

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا دورِ قیامِ خلافت میں جب طاقت کا استعمال ممنوع ہے تو ایک لحاظ سے انقلاب کا وقوع محض دعوت و تبلیغ ہی سے ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ وعظ و نصیحت کرتے جاؤ اور ایک دن انقلاب برپا ہو جائے گا تو وہ بھول کا ہی نہیں ''بڑی بھول'' کا شکار ہے۔ حقیقت میں دعوت الی اللہ سے بھی پہلے اجتنابِ طاغوت لازم ہے۔ انقلاب کا یہ وہی طریق و فلسفہ ہے جو لا الہٰ الا اللہ میں صدفی صد مضمر ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ جب کہتے ''لا الہٰ الا اللہ تفلحوا''

تو حقیقت میں پورا فلسفۂ اسلامی انقلاب ان کے سامنے رکھ دیتے۔ ہر نو مسلم کو یہ انقلابی کلمہ پڑھایا ہی اس لئے جاتا ہے کہ جو تبدیلی اسلام معاشرے میں برپا کرنا چاہتا ہے وہی ہر فرد میں۔ خلافت معاشرے میں بعد میں قائم ہوتی ہے ہر ہر ایمان لانے والے میں پہلے۔ چار الفاظ کے اس کلمے میں ''الا اللہ'' بعد میں ہے اور ''لا الہ'' پہلے۔ اجتناب طاغوت پہلے ہے اور دعوت الی اللہ بعد میں۔ نظامِ باطل سے ممکنہ بائیکاٹ پہلے ہے تو نظامِ حق کی دعوت بعد میں۔ دعوت الی اللہ اور اجتنابِ طاغوت کا اس قدر چولی دامن کا ساتھ ہے کہ قرآن میں اسے بار بار مختلف اسلوب میں بیان کیا گیا۔ ایک جگہ پر آیا:

''ہم نے ہر امت میں ایک رسولؑ بھیجا اور اس کے ذریعہ سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے اجتناب کرو'' (النحل:36)۔

ایسی آیات کی رو سے لازمی ٹھہرا کہ اسلامی انقلاب لانے کیلئے دعوت و اصلاح اور اجتناب و برأت کا کام ساتھ ساتھ ہو۔ ضروری ہے کہ داعیانِ حق اس نظامِ باطل کا ممکنہ حد تک خود حصہ نہ بنیں جسے وہ نظامِ عدل وقسط میں بدلنا چاہتے ہیں۔ ممکنہ حد تک اس لئے کہ رسول ﷺ خود ایک عرصہ تک اسی خانہ کعبہ میں نماز ادا کرتے رہے جس میں کہ 360 بت براجمان تھے۔ اسوۂ رسول ﷺ پر ایک سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے تو یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ نبیؐ کائنات ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں نے اس نظام سے کہ جسے وہ بدلنا چاہتے تھے باصرار کنارہ کشی کی۔ اجتناب کی تاریخی مثال قریش سے ہے کہ سردارانِ قریش نے نبیؐ رحمت ﷺ کو چند رعایتوں کے حصول کی خاطر اپنا بادشاہ بنانے کی پیشکش کی لیکن آپ ﷺ نے یہ کہہ کر اس پیشکش کو ٹھکرا دیا کہ:

''اگر سورج میرے دائیں ہاتھ اور چاند میرے بائیں ہاتھ پر بھی رکھ دیا جائے تو میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ اسے کامیاب فرما دے یا میں اس راہ میں ہلاک ہو جاؤں''۔

اس ٹھکرانے کی وجہ یہی تھی کہ اسلام کو یہ تک قبول نہیں کہ حق کی اگر ننانوے باتیں مان لی جائیں تو باطل کی کم از کم ایک بات مان لی جائے۔ ظاہر ہے مفاہمت و مصالحت کی صورت میں ایسا

ہونا ناگزیر تھا۔ یہی بڑی وجہ تھی کہ رسول ﷺ نے جب ہجرت کی تو حبشہ کی بجائے مدینہ جانے کو ترجیح دی حالانکہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی اس وقت مسلمان ہو چکے تھے۔ ایسا کرنے میں یعنی حبشہ کی طرف ہجرت کرنے میں جو رکاوٹ تھی وہ یہی تھی کہ نظامِ حق اور نظامِ باطل کا ایک قدم بھی ساتھ چلنا ممکن نہ تھا۔ نبوت و بادشاہت میں کیا جوڑ؟

مشرکینِ مکہ نے لاکھ کوشش کی کہ اللہ کے رسولؐ ان کے ساتھ ''کچھ دو کچھ لو'' کا معاملہ کرلیں۔ قرآن میں آیا ہے۔

''پس اے نبی ﷺ جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ وہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو وہ مداہنت کریں'' (القلم:8-9)۔

آخر جب اللہ کے رسول ﷺ نے نظامِ باطل کے ساتھ چلنے سے یک قلم انکار کر ڈالا تو قریشِ مکہ کم از کم مطالبہ (Minimum Demand) لے کر آ گئے۔ ابو طالب کی وساطت سے انہوں نے چاہا کہ ''آپ ﷺ کا بھتیجا ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم اسے اس کے دین پر چھوڑ دیتے ہیں'' وہ جس معبود کی عبادت کرنا چاہے بخوشی کرے' ہمیں اس سے کوئی تعرض نہیں مگر وہ ہمارے معبودوں کی مذمت نہ کرے اور یہ کوشش نہ کرتا پھرے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں'' رسول ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور قریش کے سرداروں سے فرمایا ''آپ لوگ یہ سورج دیکھ رہے ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں' آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح یہ سورج آپ لوگوں سے اپنی روشنی روک لینے پر قادر نہیں اسی طرح میں بھی اس کام کو چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں''۔ یاد رہے ہجرت حقیقت میں مروجہ باطل نظام سے بائیکاٹ کی آخری اور حتمی صورت تھی۔ ان حقائق سے نتیجہ جو نکلا تو یہ کہ اسلامی انقلاب نہ انتخاب (Ballot) سے آتا ہے نہ جہاد بالسیف (Bullet) سے۔ آتا ہے تو محض دعوت الی الخیر اور اجتناب بالطاغوت سے۔

۲۔ عداوت و مخالفت

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک آدمی کی ایک عادت کو بدلنا جوئے شیر لانے کے مترادف

ہے۔ پھر ایک معاشرہ اور معاشرہ بھی وہ جو ہم عصر دنیا میں نچلی ترین سطح پر ہو کی ہئیت و ترکیب کو کلیۃً بدل دینا تو لاکھ گنا مشکل ہوتا ہے۔ جمے جمائے نظام کب گوارا کرتے ہیں کہ کوئی جب چاہے انہیں ادھیڑ بکھیر کر رکھ دے۔ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا جو انبیاءؑ کو درپیش رہا ہے۔ سب سے بڑی مشکل جو حائل رہی ہے وہ یہ کہ حاملین نظام باطل اسے نظامِ حق سمجھ کر اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا کہ وہ نظام جو انہیں آباؤ اجداد سے ملا ہے کس طور ناقص ہے۔ ایسی ہی صورتِ حال سے رسول ﷺ اور ان کے ساتھیوںؓ کو واسطہ پڑا۔ جتنے بھی مشرکین کے وفود ابوطالب کے پاس آئے وہ انہیں زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتے تھے کہ وہ کیسے اس شخص کو برداشت کریں جو ہمارے معبودوں کی برائی کرتا ہے' ہمارے دین میں عیب نکالتا ہے' ہماری جماعت میں پھوٹ ڈالتا ہے' ہماری عقلوں کو حماقت قرار دیتا ہے اور ہمارے باپ دادا کو گمراہ ٹھہراتا ہے؟

بگڑے اور بھپرے ہوئے کفار و مشرکین سے نیکی کروانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا لیکن انتہائی کٹھن کام تو ان سے بدی کا چھڑوانا تھا۔ معاملہ محض ایک اللہ کو مان لینے کا ہوتا تو شاید وہ مان لیتے کیونکہ پہلے ہی کسی حد تک وہ اسے مانتے تھے لیکن یہ ان کو قطعاً گوارا نہ تھا کہ وہ ان بتوں کو توڑ دیں جنہیں وہ خداؤں کی حیثیت دیئے بیٹھے تھے۔ مشرکین کے سینوں سے شرک کا پودا کاٹ کر توحید کا پودا لگانا خود مشکلات کو دعوت دینا تھا۔ پھر بڑے بڑے تیرتھوں اور مزاروں کے سرپرستوں کو کب گوارا تھا کہ کوئی ان کی گدیوں اور سجادہ نشینیوں کو چیلنج کرے۔ سردارانِ قریش سوچ تک نہ سکتے تھے کہ کوئی انہیں ان کی سرداریوں' قبیلہ پرستیوں اور شاہ زوریوں سے دست بردار کردے۔ پھر ان کے لئے اللہ کی توحید کو تو ماننا مشکل تھا ہی' اس سے بہت زیادہ مشکل اپنے ہی شہر اور محلے کے ایک شخص کی رسالت کو ماننا تھا۔ قرآن ان کی نفسیات کو یوں بیان کرتا ہے:

''اور یہ ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص آخر تم جیسا ہی ایک بشر تو ہے۔ پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے'' (الانبیاء:3)۔

''کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر ذکر نازل کیا گیا'' (ص:8)۔

پھر من مانیوں‘ شہوت رانیوں اور مادر پدر آزادیوں کے دلدادہ مشرکین کو یہ بھی کب گوارا تھا کہ وہ قرآن جیسے ضابطے میں کسے جائیں۔ ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی جب انہیں خبر دی گئی کہ ایک اَن دیکھی طاقت ہر لمحہ ہر فرد کے ساتھ ہے۔ آخرت پر ایمان لانا‘ حشر و نشر‘ جزا اور سزا اور جنت و دوزخ کا تصور انہیں کسی طور قبول نہ تھا۔ ایسا عقیدہ تو ان کی سرشت و خصلت پر شدید وار تھا۔ انہیں قطعاً گوارا نہ تھا کہ وہ کسی ایسے ضابطے کو مان لیں جو ان کے ہاتھ باندھ کر رکھ دے۔ یہی وجہ تھی کہ رسول ﷺ کے خلاف جتنے ہتھکنڈے ان کے پاس تھے ان میں سے مؤثر ترین حشر و نشر اور جزا اور سزا کا استہزاء کرنا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے:

”ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص کہ جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہوگا تو اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے۔ نا معلوم یہ شخص اللہ کے نام پر جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہو گیا ہے“ (سبا: 7-8)۔

ایک اور مشکل جس کا مشرکینِ مکہ کو سامنا تھا یہ تھی کہ ان کے اپنے بھائی بند‘ بیٹے‘ بیٹیاں اور رشتے دار‘ گھر بار اور ہر رشتہ تیاگ کر ایک ایک دو دو کر کے بتدریج مدعیانِ انقلاب کے کیمپ میں جا رہے تھے۔ عجیب اور متحیر کن صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی کہ ان کے اپنے جگر کے ٹکڑے ان سے برسرِ پیکار ہو رہے تھے۔ زیرِ فلک تو جیسے مشرکین کی شامت آ گئی وہ کیسے برداشت کرتے کہ کوئی اٹھے اور یوں ان کے مفادات کا قلع قمع کر دے۔ چنانچہ ہر مفاد پرست اسلامی انقلاب کے راستہ میں بھاری پتھر بن گیا۔ مذہبی پیشواؤں اور پجاریوں کو گدیوں کی‘ سرداروں کو اپنی سرداریوں کی‘ سود خواروں اور ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کی‘ نسل پرستوں کو اپنی نسل پرستی کی‘ رسوم پرستوں کو رسوم پرستی کی‘ بت پرستوں کو بت پرستی کی‘ اجداد پرستوں کو اپنی اجداد پرستی کی‘ غرضیکہ ہر مفاد پرست کو اپنے مفاد کی فکر لاحق ہو گئی۔ نیندیں حرام ہو گئیں‘ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ وہ جو آپس میں لڑا کرتے تھے اس نئی تحریک کی مخالفت میں سب متحد ہو کر آہنی دیوار بن گئے۔ ظاہر ہے مخالفت میں جس قدر شدت تھی‘ مخالفت کا مقابلہ کرنے والوں میں اتنی ہی بلکہ اس سے بڑھ کر

برداشت واستعداد کی ضرورت تھی۔

مقابلہ میں کون تھے؟ رسول ﷺ کے علاوہ گنتی کے چند ہاتھ بندھے نفوسِ قدسیہ جنہیں کسی کے خلاف ہاتھ اٹھانا تو درکنار' سخت لہجے میں جواب دینے کی اجازت نہ تھی۔ پھر اسلامی تحریک میں شامل ہونے والے اولیں افراد میں سے اکثر و بیشتر یا تو غلام' لونڈیاں اور موالی تھے اور یا پھر خانوادۂ قریش کے نوخیز چشم و چراغ۔ دونوں طرح کے یہ طبقات خودمختار نہیں' کسی نہ کسی طور سرپرستوں کے محتاج تھے۔ ان سرپرستوں نے اپنے زیردستوں کو اپنی سرپرستی سے کھسکتے دیکھا تو تلملا اٹھے۔ مظالم ڈھائے تو اتنے کہ ظلم کرنے والے کبھی کبھار خود نادم ہوتے۔ حضرت بلالؓ حضرت خبابؓ ' حضرت عمارؓ اور ان کے والدین وغیرہ کی داستانِ الم رہتی دنیا تک کے کفر کو شرماتی رہے گی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت خالد بن سعیدؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ کو بار بار پیٹا گیا۔ اپنے گھربار اور گلی محلوں کو آسانی سے کون چھوڑتا ہے؟ لیکن اس دور میں تو مسلمانوں کو دو دفعہ ہجرت کر کے حبشہ جانا پڑا۔

خود رسول ﷺ پر کوڑا اچھینکا جاتا۔ ان کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے۔ سجدہ میں جاتے تو ان پر گندگی اور جانوروں کی اوجھڑی ڈال دی جاتی۔ گلے میں کپڑا ڈال کر یوں مروڑا جاتا کہ آنکھیں نکل آتیں۔ طائف کے بازاروں میں انہیں لہولہان کیا گیا' مسلمانوں کا مقاطعہ کر کے دو چار دس دن نہیں مسلسل تین سال انہیں شعب ابی طالب میں محصور کیا گیا۔ اس پر بھی جب مخالفین کو کامیابی نہ ہوئی تو چھچھوری اور ذلیل حرکتوں پر اتر آئے۔ حضرت زینبؓ کو طلاق دلوانے کی کوشش کی۔ آپ ﷺ کے صاحبزادے کی وفات پر اظہارِ مسرت کیا۔ رسول ﷺ کی دو بیٹیوں کو ابو لہب کے دو بیٹوں سے طلاق دلوا دی۔

جب یوں کرتے بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو تحریکِ اسلامی کے خلاف بھرپور جھوٹ کی مہم شروع کر دی۔ ہر اس قبیلے کے پاس جاتے جہاں نبیٔ کائنات ﷺ بغرض دعوت و تبلیغ پہنچتے یہ تاثر دینے کے لئے کہ یہ ہم میں سے اچھا بھلا آدمی تھا لیکن (نعوذ باللہ) اب اس کا دماغ چل گیا

ہے۔قرآن کی آواز سنتے ہی شور مچاتے۔قرآن کو الٹے معنی پہناتے۔نبیٔ کائنات ﷺ کو دبی زبان میں کچھ کا کچھ کہہ جاتے۔صبح ایمان لاتے شام کو مکر جاتے' اللہ کے رسول ﷺ کو ساحر و مجنون قرار دیتے۔جب کسی طور دال گلتی نظر نہ آئی تو داعی حق ﷺ کو ہی ختم کرنے پر تل گئے تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔غرضیکہ انہوں نے کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جس سے کہ اسلامی انقلاب کا راستہ رک سکتا تھا۔زیرِ فلک اسلام کی مخالفت میں جو کچھ ان کے بس میں تھا کر گزرے۔

نصرتِ ایزدی حاصل ہوئی تو نویدِ انقلاب

اسلامی انقلاب کے دشمنوں کو گمان تھا کہ شاید وہ انضباطی کاروائیوں اور متشددانہ ہتھکنڈوں سے انقلابِ نبوی ﷺ کا راستہ روک لیں گے۔ان پگلوں کو کیا خبر کہ اسلامی انقلاب کا راستہ ازل سے ہے ہی یہی۔''زلزلوا'' اور ''متیٰ نصر اللہ'' کے مراحل کے بغیر وہ مرحلہ آتا ہی نہیں جسے قرآن ''الا ان نصر اللہ قریب'' کا نام دیتا ہے۔

ایک طرف مخالفین نے اپنی تمام توانائیاں' ذرائع اور وسائل اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں صرف کر دیں تو دوسری طرف مسلمانوں کی جانفروشیاں اور قربانیاں رنگ لائیں۔سمعیہؓ کی شہادت' بلالؓ و خبابؓ کو دی گئیں اذیتیں' حبشہ کی طرف ہجرتیں' شعبِ ابی طالب کی بھوک و ننگ بس ایک ہی غرض کیلئے تھیں کہ کسی طرح نصرتِ ایزدی حاصل کی جائے۔طائف میں خود بعد از بزرگ توئی ﷺ کا خون بہا تو ہوا کا رخ ہی نہیں تاریخ کا رخ تو اسی وقت بدل گیا۔رہی سہی کسر ہجرتِ مدینہ نے پوری کر دی۔جب اللہ کے بندے اس لئے گھر بار سے محروم کر دیئے گئے کہ وہ کہتے تھے ''اللہ ہمارا رب ہے'' تو نصرتِ ایزدی نہ رک سکی۔بارش کی طرح چھم چھم برسی۔ہجرتِ مدینہ بظاہر تو بڑا دل دوز واقعہ لیکن حقیقتاً اسلامی انقلاب کی نوید تھا۔انقلاب آیا اور ببانگِ دہل آیا۔

یعنی قرآنِ مجید خبر دیتا ہے کہ کم از کم دو طریقے ایسے ہیں کہ جنہیں اختیار کرنیوالوں کو اللہ تعالیٰ اپنی نصرت سے نوازتا ہے۔پہلا طریقہ یہ ہے کہ کچھ اللہ کے بندے اس قدر تن من دھن اللہ کی راہ میں لگا دیں کہ ''جاھدوا فی اللہ حق جہادہ'' کی شرط پوری ہو جائے۔ایسا کرتے ہوئے ان

کے وسائل ختم ہونے کو ہوں لیکن منزل ابھی کچھ فاصلے پر ہو تو باقی سفر میں اللہ کی نصرت شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر پہل بہرحال بندوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ نصرتِ ایزدی جواب کے طور پر آتی ہے۔ قرآن میں آیا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا'' (محمد:7)۔

نصرتِ ایزدی حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسلام کی طرف دعوت دینے والے کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہ کریں' ہاں ان پر زیادتی ہو تو صبر کریں یعنی زیادتی کا جواب بھی زیادتی سے نہ دیں۔ اس طور پر' ظاہر ہے' وہ مظلومیت کے شکار قرار پاتے ہیں۔ مظلوم کی آہ بے اثر نہیں جاتی۔ مکی دورِ نبوت میں چند نفوسِ قدسیہ جب ظلم کا شکار ہوئے حتیٰ کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ کو چل دیئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں قتال کی اجازت دیتے ہوئے اس مدد کا ذکر یوں فرمایا:

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی تھی کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے'' (حج:39)۔

دعائے خلیل کی بدولت مکہ شہرِ امن تھا۔ اللہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حرمت پر حرف آئے' قیامِ خلافت کا دور...... بغیر اقدام و تشدد کا دور تو یہیں مکمل کیا۔ دوامِ خلافت کا دور...... اقدام و قتال کے دور میں سردارانِ قریش کو مکہ کی سرزمین سے نکالا تو اس طرح کہ پھر انہیں واپس جانا نصیب نہ ہوا۔ اسلامی انقلاب کا جو راستہ اختیار کیا گیا اسے کامیاب ہونا ہی تھا کیونکہ وہ ربِ کائنات کا وضع کردہ تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ آج اسلامی انقلاب وقوع پذیر نہ ہو بشرطیکہ وہی مسنون طریقہ اختیار کیا جائے۔

جس طرح آج ہمیں ملکی نظامِ باطل کے علاوہ امریکہ جیسی سپر طاقتوں کی مزاحمت کا سامنا بھی ہے' تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں مصلحین کو ایسی جابر و قاہر طاقتوں سے پالا پڑتا رہا ہے۔ خود نبیِ کائنات ﷺ اور ان کے ساتھیوں ؓ کو دورِ نبوت میں فارس و روم جیسی بڑی بڑی طاقتوں کا سامنا تھا۔ ظاہر ہے ایسی مہیب طاقتوں پر غلبہ تبھی ممکن ہے کہ مقابلے میں ان سے بھی عظیم تر قوت ہو۔ یہ خلاء اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہی پر ہو سکتا ہے اور یہی حکمت مضمر ہے اللہ تعالیٰ کی نصرت

حاصل کر کے انقلاب لانے میں۔مکی دورِ نبوت اسی مدد کے حصول کی جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوگئی تو سارا مسئلہ ہی حل ہوگیا۔آج بھی بہت سے مصلحت اندیش ڈراتے ہیں کہ اندرونی و بیرونی مہیب طاقتوں سے ٹکرانا اپنے آپ کو پاش پاش کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ایسے ہی مواقع پر مسلمانوں کو جو راستہ اختیار کرنے کیلئے کہا گیا ہے تو یہ:

''اور ہرگز نہ دبو کفار و منافقین سے' کوئی پروا نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ کرو اللہ پر' اللہ ہی اس کیلئے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کردے'' (احزاب:48)۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمانا یہ کہ کوئی سپر طاقت زیرِ آسمان ہے تو ہوا کرے۔اس کے پاس بڑی فوج' دور مار میزائل' کمپیوٹر کا دفاعی نظام اور ایٹم بم وغیرہ سہی لیکن دنیا کے لوگو تمہیں کیا معلوم کہ جب کوئی اپنے رب کو اپنا مددگار بنالے تو مخالفانہ نظام ویسے ہی مفلوج و معطل ہو جاتا ہے۔ یقین نہ آئے تو نمرود سے' فرعون سے بلکہ دور کی کیا بات مشرکینِ مکہ ہی سے پوچھ لو کس طرح مفلوج و مغلوب ہوئے ان کے بڑے بڑے مہیب نظام۔ہجرت کی رات رسول ﷺ خوفناک محاصرین کا محاصرہ توڑ کر نکل جاتے ہیں' خون کے پیاسوں کی تمام تیاریاں اور عیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔قرآن خود گواہی دیتا ہے تو اس طرح:

''وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ منکرینِ حق تیرے خلاف تدبیریں کر رہے تھے کہ تجھے قید کردیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کردیں۔وہ اپنی چالیں چل رہے تھے تو اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور (جانے رہو) اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے'' (انفال:3)۔

غارِ ثور میں دشمن عین دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن ہی کی زبان میں ''کمزورترین گھر'' مکڑی کے جالے کا قلعہ بنادیا۔سرورِ عالم ﷺ نے اس موقع پر جو الفاظ فرمائے وہ اسلامی طرزِ انقلاب کا مرکزی راز ہے۔فرمایا ''غم نہ کر' اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔یعنی جس فریق میں ربِ کائنات خود شامل ہو چکا اسے مات کرے گا تو کون؟ اللہ تعالیٰ کا فرمانا تو یہ:

''اس وقت اللہ نے اپنے طرف سے سکونِ قلب نازل فرمایا اور اپنے نبی ﷺ کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے۔اور کافروں کا بول نیچا کردیا۔اور اللہ کا بول تو اونچا ہی

ہونے کو ہے۔ اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے" (توبہ:40)۔

لاریب' آج بھی اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کو بروئے کار لانے کا مسنون طریقہ اختیار کیا جائے۔ نصر اللہ اور فتح لازم و ملزوم ہیں (صف: 13' (نصر:1)۔ نظامِ باطل جب یوں بے بس و مفلوج ہو جائے اور زمامِ کار مصلحین کے ہاتھ آ جائے تو یہ وقت ہے جب دوامِ خلافت کا دور شروع اور انتخابات کا انعقاد ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ بھی قرآن و سنت کے دیئے ہوئے طریقے سے جس کی ایک شکل آگے آ رہی ہے۔

قیامِ خلافت کے متعلق گزارشات ختم کرنے سے پہلے دو غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔ ایک غلط فہمی تو یہ کہ کہا جاتا ہے کہ رسول ﷺ اور صحابہؓ کے مقابل غیر مسلم تھے جب کہ آج ہمیں مسلمانوں سے واسطہ ہے۔ اصل میں افراد سے مقابلہ نظامِ باطل کے قلع قمع کیلئے ہوتا ہے۔ اگر نظامِ باطل ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کے مخالفین و معاونین غیر مسلم ہیں یا برائے نام مسلمان۔ جس نظام سے آج ہمیں واسطہ ہے یہ بھی کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام کا آمیزہ ہے اور جو نظام اس وقت تھا وہ بھی اسلام و غیر اسلام کا ملغوبہ تھا۔ اس وقت حج اور عمرے کی کوئی نہ کوئی شکل موجود تھی۔ چار مہینے کی حرمت کو تمام قبائلِ عرب تسلیم کرتے تھے۔ ختنہ' غسلِ جنابت' جانوروں کو ذبح کرنا' مردوں کو دفن کرنا' نکاح' طلاق' قصاص' دیت وغیرہ کی شکلیں کسی نہ کسی طور موجود تھیں۔ بالفاظِ دیگر آج کی طرح "کفر ملا اسلام" تو بدستور موجود تھا' کمی اگر تھی تو خالص دینِ حق کی۔

دوسری بات جو کہی جاتی ہے تو یہ کہ اس وقت تو رسول ﷺ خود موجود تھے جب کہ آج مابعدِ رسالت کا دور ہے۔ دراصل یہ ایسا ہے کہ کوئی یہ کہے کہ آج دین پر عمل کرنا یا مثال کے طور پر نماز پڑھنا اس لئے ضروری نہیں کہ رسول ﷺ ہم میں نہیں۔ قرآن و سنت کی پیروی کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ تا قیامت جو بھی کام بھی کیا جائے مسنون طریقے سے کیا جائے۔ مسنون طریقہ سے کیا جائے تو کامیابی و کامرانی لازم ہے' شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن میں آیا:

"جو شخص اللہ و رسولؐ کی پیروی کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی" (احزاب:71)۔

دوامِ خلافت کا مسنون طریقِ کار

یاد رہے چاروں خلفاء راشدین کا انتخاب تو ہوا لیکن قدرے مختلف طریقے سے۔ تاہم طریقہ ہائے انتخاب میں قرآن وسنت پر مبنی چند مشترکہ اصولی ضوابط اختیار کئے گئے جو یوں ہیں:۔

۱۔ کوشش کی گئی کہ قیادت اہلِ امانت کو سونپی جائے اور اس قرآنی ضابطے کی حرف بہ حرف پیروی ہو جو یوں ہے کہ ''مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو......'' (النساء:58)۔

۲۔ حقِ حکمرانی صرف ایک سربراہ یعنی خلیفہ کو سونپا گیا باوجودیکہ اسلامی مملکت کی حدود بے حد وسیع ہو گئیں۔ آج اسلامی دنیا پر ایک خلیفہ کا حقِ حکمرانی چھین کر اگر 57 حکمران مسلط ہیں تو سب کے سب غاصب اور واجب القتل ہیں اس لئے کہ رسول ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ ''جب دو خلیفہ سے بیعت کی جائے تو جس سے اخیر میں بیعت ہوئی ہو اسے قتل کرو (اس لئے کہ اس کی خلافت پہلے خلیفہ کے ہوتے ہوئے باطل ہے)'' (مسلم)۔ بالفاظِ دیگر اسلام جب ایک سے دو خلفاء ہونے ہی کی اجازت نہیں دیتا تو متعدد حکمرانوں کا کیا سوال؟

۳۔ ولی عہد بنانے کی قطعی ممانعت

۴۔ امیدوار کھڑا ہو کر کسی کو بذریعہ کنونسینگ اپنے حق میں کرنے کی دوٹوک نفی۔ ہادیٔ برحق ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے ''خدا کی قسم ہم نہیں دیتے عہدہ اس شخص کو جو اس کی درخواست کرے اور جو اس کی حرص کرے'' (مسلم)۔ یاد رہے آج کی دنیا میں اس دھرتی کے مکینوں کو کسی سیلاب، کسی زلزلے اور کسی ایٹم بم سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا کہ رسول ﷺ کے اس ارشادِ مبارک سے انحراف سے۔ آج دنیا میں جس قدر ظلم واستحصال، فتنہ وشر، بدامنی و بے چینی، سفارش ورشوت، اقرباء پروری و دہرا معیار، جدی دشمنیاں اور ہارس ٹریڈنگ وغیرہ ہیں ان سب کا سرچشمہ ایک فرد کا دوسرے فرد کے ووٹ کا محتاج ہو جانا ہے۔

۵۔ خلیفہ کا انتخاب محض اربابِ حل وعقد کی رائے سے ہوا' امت کے ہر فرد نے ان انتخابات میں حصہ نہ لیا۔ اصل میں قرآن کے مطابق دنیا میں وقت کے ہر موڑ پر لوگوں کی اکثریت ہمیشہ جاہلوں کی ہوتی ہے (اکثر الناس لا یعلمون) لہٰذا جس نظام کی اٹھان لوگوں کی اکثریت پر ہو اس میں ہمیشہ جاہل ہی آگے آئیں گے۔ ''الناس'' یعنی مسلموں اور غیر مسلموں دونوں کا انتخاب میں حصہ لینا تو درکنار اسلام تو اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور وہ پوری مسلم آبادی کو بھی اس بکھیڑے میں نہیں ڈالتا کہ وہ انتخابات میں حصہ لے' چناؤ کا بوجھ وہ صرف اربابِ حل وعقد پر ڈالتا ہے۔ یاد رہے اسلام میں خلیفہ کی جگہ خالی ہونے کے تین دن کے اندر اندر اسے پر کرنا ہوتا ہے اور ایسا تبھی ممکن ہے کہ صرف اربابِ حل عقد' جو حقیقت میں عوام کے معتمد ہوتے ہیں' اس مرحلہ کو سر کریں۔

٦۔ اہل اور قابل ترین قیادت کو آگے لانے کے لئے قرآنی معیارِ اہلیت' جو پانچ اوصاف' ایمان (النور: 55)' تقویٰ (الحجرات: 13)' صلاح (النور: 55)' علم اور جسم (البقرۃ: 247) پر مشتمل ہے' کی پابندی کی گئی۔

۷۔ ایک دفعہ منتخب ہو جانے والی قیادت کو ہٹانا درج ذیل صرف تین صورتوں میں جائز ٹھہرا ورنہ تا حیات قائم دائم۔

☆ وفات پا جانے کی صورت میں

☆ از خود معذرت کر لینے کی صورت میں

☆ قرآنی معیارِ اہلیت میں سے کسی ایک یا کئی اہلیتوں میں کمی آنے کی صورت میں۔

دورِ خلافتِ راشدہ میں مؤخر الذکر دونوں صورتوں کی نوبت نہ آئی لہٰذا پہلی ہی صورت کو اختیار کیا گیا۔

۸۔ اہلِ اقتدار تو بہر حال حزبِ اقتدار' باقی پوری امت حزبِ اختلاف تھی۔ کوئی بھی امتی کسی بھی وقت قیادت کا احتساب کر سکتا تھا۔ آج کی طرح کی متحارب حزبِ اقتدار و

حزب اختلاف کا کوئی وجود نہ تھا۔

۹۔ منتخب ہونے کی صورت میں خلیفۂ وقت پر درج ذیل دو مزید قدغنوں کی پابندی لازمی تھی۔

☆ ترجیحاً اوسط سطح کے شہری کی بود و باش اختیار کرنا۔

☆ دارالخلافت کی مرکزی مسجد کا خطیب و امام ہونا۔

زمانی و مکانی ضروریات کے پیشِ نظر نوعیت کے اعتبار سے طریقِ انتخاب قدرے مختلف تو ہوسکتا ہے لیکن شرعاً وہی طرزِ انتخاب جائز ہوگا جو مندرجہ بالا شرعی حدود کا پابند ہو ورنہ ناجائز' خواہ ایک ہی شرط کی خلاف ورزی کیوں نہ ہو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کو اسی لئے دورِ خلافتِ راشدہ کا حصہ سمجھا جاتا ہے کہ کچھ عرصہ انحراف کے بعد ان کے دور میں ایک دفعہ پھر ان شرائط کی پابندی کی گئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کیا کوئی ایسا طرزِ انتخاب وضع کر لینا ممکن نہیں کہ جس کے ذریعہ قرآن و سنت پر پورا اترنے والی قیادت ہی آگے آئے۔ ایسا کرنا سو فیصد ممکن ہے۔ ذیل میں ہم پاکستان کو بطور مثال لے کر ایک ایسے ہی طرزِ انتخاب کا ذکر کرتے ہیں۔

مجوزہ طرزِ انتخاب

جب معیاری لوگ آگے لانے ہوں تو ضروری ہے کہ وہ ادارہ یا معیار جو اہل لوگوں کی نشاندہی کرے' ایک ہی ہو۔ دارالسلام (اسلام کی مملکتِ واحدہ) کی سطح پر ایسا واحد ادارہ الیکشن کمیشن ہی ہوسکتا ہے یعنی ہر صوبہ میں صوبائی الیکشن کمیشن تو دارالسلام کی سطح پر وفاقی الیکشن کمیشن۔ پہلے مرحلے میں چونکہ صوبائی امراء کا انتخاب مطلوب ہے لہٰذا ہر صوبے میں مثال کے طور پر پاکستان (پاکستان' دارالسلام کا ایک صوبہ ہوگا) میں پاکستان کا الیکشن کمیشن حسبِ ضرورت یا مثال کے طور پر پچاس الیکشن پینل بنائیگا۔ ہر پینل تین ایسے افراد پر مشتمل ہوگا جن کی شرافت اور دیانتدارانہ شہرت مسلمہ ہو۔ یاد رہے اسلامی تعلیمات کے مطابق ایسے نیک

سیرت انسان وقت کے ہر موڑ پر موجود ہوتے ہیں۔ الیکشن پینلوں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ پورے پاکستان کو مناسب سائز کے حلقوں میں تقسیم کرلیا جائے (حلقے کا سائز موجودہ قومی اسمبلی کے حلقوں کے برابر بھی ہوسکتا ہے)۔ ہر حلقہ کے لئے مقرر کردہ الیکشن پینل اپنے حلقہ میں سات دن مختلف ریسٹ ہاؤسوں، یونین کونسل کے دفتروں یا دوسری مناسب جگہوں پر اس پروگرام کے تحت قیام کرے کہ جس کا پہلے سے اخبارات واشتہارات کے ذریعہ اعلان کیا جائے۔ اس ساری سعی کا مقصد یہ ہے کہ متعلقہ پینل حلقے کے لوگوں سے اس قدر قریب تر رابطہ قائم کرے کہ گویا اہالیانِ حلقہ کا ہی حصہ بن جائے۔ اپنے قیام کے دوران متعلقہ آبادی میں سے بہ مشورہ عوام ایسے لوگوں کی خفیہ فہرست تیار کی جائے کہ جو قرآنی معیارِ اہلیت کے حامل ہوں۔ فہرست تو پہلے ایسے تقریباً 150 افراد (مردوں) کی تیار کی جائے لیکن کانٹ چھانٹ اور کراس چیکنگ کے بعد اسے 100 افراد تک محدود کردیا جائے۔ اس طرح سات دنوں میں 50 پینل پچاس حلقوں کی فہرستیں تیار کرلیں گے۔ اسی حساب سے کم وبیش 150 حلقوں کا سروے تقریباً تین ہفتوں میں مکمل ہوجائے گا۔ سروے مکمل ہونے کے سات دن کے اندر اندر صوبائی الیکشن کمیشن انہی ممبرانِ پینل کی خدمات سے استفادہ کرتے ہوئے ہر حلقہ کی فہرست میں شاملِ کردہ 100 افراد کو متعلقہ حلقہ ہی میں کسی ایک جگہ پر برائے مشورہ طلب کرے۔ ضروری نہیں کہ ایسے تمام اجتماعات پورے صوبے میں ایک ہی دن ہوں۔ لیکن اگر ہوں بھی تو کوئی حرج نہیں۔

مشورہ کے اغراض ومقاصد بتانے کے بعد بلائے گئے افراد میں سے ہر ایک کو 100 افراد کی تیار کردہ فہرست کی ایک کاپی مہیا کی جائے اور اسے فہرست میں دیئے گئے افراد میں سے مطلوبہ (پاکستان کی صورت میں مثلاً دس) افراد کو جن کو کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ قرآنی معیارِ اہلیت پر بدرجہ اتم پورے اترتے ہیں خفیہ طور پر ٹک کرنے کو کہا جائے۔ جو شخص اپنے نام کو بھی ٹک کرے اس کے مشورے کو نہ صرف مسترد کردیا جائے بلکہ اسے کسی بھی عہدے کے لئے نااہل قرار دیا جائے۔

اس طرح سے جو شخصیت سب سے زیادہ ٹک ہوا سے متعلقہ صوبہ کی طرف سے وفاقی شوریٰ کا رکن ہونے کی سعادت ہو۔ جو دوسرے نمبر پر آئے اسے صوبائی شوریٰ کا رکن گردانا جائے۔ باقی ٹک شدہ افراد میں سے مطلوبہ تعداد کو زونل شوریٰ کا رکن بنایا جائے۔ اس کے لئے ہر صوبے کو ایک کروڑ آبادی پر مشتمل زونوں میں تقسیم کیا جائے۔ ہر زون کی انتظامیہ علیحدہ اور ایک گورنر کی سربراہی میں ہو (اس مرحلے پر پاکستان کے غالباً 17 زون بنانا ہوں گے) اگر کوئی منتخبہ شخص معذرت کرلے تو ظاہر ہے پھر فہرست میں ٹک کردہ اگلے فرد کو لیا جائے گا۔

امیر المؤمنین کا چناؤ وفاقی شوریٰ کے ارکان آپس میں اسی طرح بغیر کسی رکنِ شوریٰ کے امیدوار کھڑا ہونے کے خفیہ رائے دہی سے کریں۔ صوبائی امراء کا چناؤ صوبائی شورائیں کریں اور زونل گورنروں کا انتخاب زونل شورائیں کریں۔ وفاقی وزراء کا انتخاب خلیفۂ وقت اور صوبائی وزراء کا چناؤ صوبائی امراء کی صوابدید پر ہو۔ نیز ملکی سطح پر ایسے انتخابات پوری تاریخ میں صرف ایک ہی دفعہ ہوں۔ کسی رکنِ شوریٰ کی سیٹ خالی ہونے کی صورت میں صرف متعلقہ حلقہ میں دوبارہ انتخاب ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا تجویز کردہ طرزِ انتخاب جملہ اسلامی تقاضوں کو پورا کرتا ہے' تاہم حرفِ آخر نہیں۔ قرآن وسنت کی شرائط کی پابندی کرتے ہوئے طرزِ انتخاب میں حسبِ ضرورت ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ طرزِ انتخاب نہ صرف سستا' آسان' مختصر وقت میں اور معمولی عملہ سے مکمل ہونے والا ہے بلکہ مروجہ انتخابی شور شرابے' گروہی و جماعتی محاذ آرائیوں اور برادریوں کی مخاصمتوں سے بھی قطعی پاک ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دارالسلام' صوبائی اور زونل سطح پر انتخاب صرف ایک ہی دفعہ درکار رہے' پھر کبھی نہیں۔ اس کا یہ بھی طرۂ امتیاز کہ صرف اہل اور امانتدار افراد ہی قیادت پر متمکن ہو سکتے ہیں' ووٹر کی محتاجی کا کوئی سوال نہیں۔ دور دراز کا ایک غریب دیہاتی بھی ذاتی اہلیت کی بنا پر عوامی نمائندہ اور حکمران منتخب ہو سکتا ہے۔

لیکچر نمبر 6

نظامِ خلافت نہ ہونے کے مضر اثرات

اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کیا کہ انسان کوعین زمین پر بھیجتے وقت تاکید کی کہ زمین پر پہنچ کر الٰہی ہدایات وقوانین کی پیروی کرنا (بقرۃ:39)' صرف یہی نہ کیا کہ نبی کائنات ﷺ کو دوسری ہی وحی میں دورِنبوت میں جو کرنے کا کام دیا تو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی وحاکمیت قائم کرنے کا (مدثر:3)' صرف یہی نہ کیا کہ حصولِ غلبۂ دین کو دوسرے مرحلے پر رکھا' پہلے مرحلے پر رکھا تو قیامِ خلافت کو (نور:55) بلکہ اس اشرف المخلوقات کی پیدائش کا مقصد قرار دیا تو جیسے پہلے بیان ہوا''قیامِ خلافت'' کو۔ ایسا کیا گیا تو اس لیے کہ نظامِ خلافت اگر دنیا میں رواں دواں نہ ہو تو قرآن وسنت کے بیشتر احکامات پر کما حقہ' عمل ہو ہی نہیں سکتا بلکہ اس صورت میں انسانی زندگی محض مجبوریوں کا گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ہے۔

سلسلۂ نبوت ختم ہونے کے بعد ایک اہم فریضہ اب امتِ مسلمہ کے ذمہ ہے کہ وہ رہتی دنیا تک دینِ حق اور دینِ حق کی برکات وثمرات کو ہر انسان تک پہنچائے۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے'' (آلِ عمران:110)۔

صد حیف امتِ مسلمہ نے اپنے آپ کو''خیرِ امت'' کے منصبِ جلیلہ سے نیچے گرایا تو اس قدر کہ خود امتِ مسلمہ کا وجود آج زیرِ آسمان کہیں نہیں۔ نتیجہ اس کا نکلا تو یہ کہ چہ جائیکہ امتِ مسلمہ دوسری اقوام کیلئے ہدایت واصلاح کا فرضِ منصبی ادا کرتی خود اغیار سے ڈکٹیشن لینے پر مجبور ہے۔ واقعات کی دنیا میں آج مسلمانانِ عالم خود تو ذلت وخواری سے دوچار ہیں ہی پوری انسانیت کو اسلام کی برکات سے محروم کیے ہوئے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ:

گنوادی ہم نے اسلاف سے جو میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

یہ سودا بڑے خسارا کا ہے۔ نظامِ خلافت قائم و دائم رہتا تو ایسا نہ ہوتا۔ نظامِ خلافت کو گنوا کر ہم نے کیا کھویا' ذیل میں چند مضر اثرات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے یہی نوٹ فرمائیں کہ اسلام میں نماز' زکوٰۃ' امر بالمعروف و نہی عن المنکر ...... چار امور اس قدر اہم ہیں کہ ربِ کائنات نے ان امور کو فرض قرار دے رکھا ہے۔ لیکن غور فرمائیں' دوبارہ غور فرمائیں یہ چاروں اہم امور' پوری تفصیلات کے ساتھ ادا ہوتے ہی اس وقت ہیں جب مسلمانوں کو تمکین فی الارض حاصل ہو۔ (حج: 41)۔

آج ہمارے ہاں نمازیں بھی پڑھی جا رہی ہیں' زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ہو رہی ہے اور اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض کی ادائیگی بھی کسی درجے ہو رہی ہے لیکن یہ سب فرائض آج بطور رسم ادا کیے جا رہے ہیں۔ ان کی اصل ادائیگی نظامِ خلافت کی موجودگی ہی میں ہو سکتی ہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے:

صلوٰۃ

قرآنِ مجید میں ایک ایسی آیۂ مبارکہ کا ذکر آیا ہے جسے مفسرین نے آیۂ تمکین فی الارض کا نام دیا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ آیتِ مقدسہ:

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں زمین میں اگر ہم اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے'' (حج: 41)۔

اس آیۂ مبارکہ میں امتی سطح کے چار فرائضِ منصبی یعنی نماز' زکوٰۃ' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر آیا ہے۔ فرمایا گیا کہ ان چاروں کی ادائیگی کما حقہٗ' ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کو تمکین فی الارض حاصل ہو یا دوسرے لفظوں میں نظامِ خلافت قائم ہو۔ سوال پیدا ہوتا

ہے کہ نظامِ خلافت کے بغیر فریضۂ نماز کیوں کماحقہٗ ادا نہیں ہوتا۔ دراصل قرآنِ مجید میں نماز پڑھنے کا نہیں نماز قائم کرنے کا ذکر ہے۔ یعنی صلوٰۃ خود ایک نظام ہے جس میں خلیفۃ المسلمین کو خود دارالخلافہ کی مرکزی مسجد میں امامت و خلافت کے فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں اور دنیا بھر کے آئمہ مساجد کو خلیفۃ المسلمین کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اصل میں اسلام عوام کے مسائل کو حل کرنے کیلئے ان کو زحمت نہیں دیتا کہ وہ حکمرانوں کے دروازے کھٹکھٹاتے پھریں بلکہ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں کم از کم پانچ وقت خود حکمرانوں کو عوام میں لاتا ہے تاکہ ترجیحاً لوگوں کے مسائل سونے سے پہلے پہلے حل ہوں۔ خلیفۃ المسلمین تو مقتدر ہوتے ہوئے اپنے اردگرد علاقے کے مسائل حل کرتا ہے لیکن ہر مسجد میں اس علاقے کے اعلیٰ ترین افسر کو بطور امامِ صلوٰۃ خلیفۃ المسلمین کی نمائندگی کرتے ہوئے یہی فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں تاکہ ہر علاقے کے عوام کو اپنے مسائل حل کروانے کی سہولت میسر ہو۔ یہ ہے مطلب ''قیامِ صلوٰۃ'' کا۔ ظاہر ہے یہ نظام معرضِ وجود میں تبھی آسکتا ہے یا دوسرے لفظوں میں قیامِ صلوٰۃ کا فریضہ تبھی کماحقہٗ ادا ہوسکتا ہے کہ نظامِ خلافت بالفعل موجود ہو۔

یہ تو ہوئی قرآنِ مجید کی بات لیکن سنتِ رسول ﷺ بھی یہی ہے۔ گو نماز معراج کے موقع پر فرض ہو چکی تھی لیکن مکی دورِ نبوت میں نہ مسجد بنی نہ جماعت کا التزام ہوا۔ مسجد بنی تو مدینہ پہنچ کر اس وقت جب نظامِ خلافت قائم ہو چکا۔ کس قدر اہم ہے قیامِ خلافت کا نظام!

زکوٰۃ

ہم نے ہر چیز کا متبادل انتظام کرلیا ورنہ اس میں کیا شک کہ فریضۂ زکوٰۃ کی کماحقہٗ ادائیگی کے لئے بیت المال کا وجود لازمی ہے۔ بیت المال کے نظام کا مطلب ہے کہ مرکزی بیت المال دارالخلافہ میں تو اس کی شاخیں پوری اسلامی دنیا میں موجود ہوں۔ ظاہر ہے بیت المال تو درکنار خود دارالخلافہ معرضِ وجود میں آتا ہے تو اس وقت جب نظامِ خلافت رواں دواں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ بھی فرض ہوئی تو مدینہ پہنچ کر اس وقت جب نظامِ خلافت قائم ہو چکا۔ قرآن وسنت

دونوں سے عیاں ہے کہ فریضۂ زکوٰۃ کما حقہٗ ادا ہوسکتا ہے تو اس وقت جب نظامِ خلافت قائم ہو۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اصل میں امر بالمعروف خود ایک فریضہ ہے تو نہی عن المنکر بھی خود ایک فریضہ ہے۔ قرآنِ مجید نے اکثر و بیشتر ان دونوں فرائض کو اکٹھے بیان کیا ہے۔ بنابریں یہ یوں جیسے ایک ہی فرض کے دو حصے ہوں۔ قرآن وسنت میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت اتنی کہ صلوٰۃ وزکوٰۃ کی طرح اس کی ادائیگی فرد پر بھی واجب ہے' معاشرے پر بھی اور عالمی سطح پر بھی۔ ایک فردِ مومن کے اوصاف بیان کرتے ہوئے قرآن مجید میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو انفرادی سطح پر ادا کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے (توبہ: 112)' معاشرے کی سطح پر بھی (ال عمران: 104) اور امت کی سطح پر بھی (ال عمران: 110)۔ خود نبی کائنات ﷺ کے ارشادِ مبارک کے الفاظ اس بارے میں اتنے محکم اور پرزور ہیں کہ دل کانپتا ہے اس فریضے کی عدم ادائیگی کی صورت میں' فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری زندگی ہے (اے امتِ مسلمہ!) تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک ایسے (خطرناک) عذاب میں مبتلا کر دے گا کہ اس سے نجات پانے کیلئے تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو گے مگر وہ تمہاری دعاؤں کو قبول نہیں کرے گا'' (ترمذی۔ مسندِ احمد)۔

اس حدیثِ پاک کے الفاظ (امر یعنی حکم کرو اور نہی یعنی روکو) نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ فریضہ اسی وقت کما حقہٗ ادا پا سکتا ہے کہ جب کرنے والا مقتدر ہو یعنی اس قابل ہو کہ وہ بزورِ معروف کا حکم اور نہی سے روک سکے۔ ایک گھر کا سربراہ اپنے گھر والوں کو تو اس کا پابند بنا سکتا ہے' پڑوس والوں کو نہیں۔ امتی سطح یا عالمی سطح پر بھی یہ فریضہ کما حقہٗ ادا پا سکتا ہے تو اس وقت جب نظامِ خلافت قائم ہو یا دوسرے لفظوں میں فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ادائیگی کے لئے بنیادی ضرورت (Pre-Requisite) یہ ہے کہ نظامِ خلافت موجود ہو اور

مسلمان دنیا میں بطور غالب قوت ہوں۔ مغلوبیت کی صورت میں نہ حکم دیا جا سکتا ہے اور نہ روکا جا سکتا ہے۔

بیعت کیلئے خلیفۃ المسلمین کا وجود ضروری

قرآن وسنت زیرِ آسماں صرف خلیفۃ المسلمین یا اس کی زندگی میں اس کی طرف سے بیعت لینے کی اجازت دیتے ہیں' کسی دوسرے کو نہیں۔ بیعت اصل میں ایک معاہدہ ہے بظاہر بندے (خلیفۃ المسلمین) اور بندے کے درمیان لیکن اصل میں اللہ اور بندے کے درمیان۔ اس معاہدے میں بندہ اپنی جان اور اپنا مال اللہ کے سپرد کرتا ہے اور اللہ اسے جان اور مال کے معاوضے میں جنت عطا کرتا ہے۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مرتے اور مارتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے توراۃ اور انجیل اور قرآن میں اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکا لیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے'' (توبہ: 111)۔

یاد رہے یہ سودا (بیع) اس معنی میں نہیں ہے کہ انسان کو یہ اختیار مل گیا ہے کہ وہ اپنی قوتوں' صلاحیتوں' جانوں اور مالوں کا اس طور مالک ہو گیا ہے کہ اسے اتھارٹی دے دی گئی ہے کہ وہ ان کو جیسے چاہے استعمال کرے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اسے اتھارٹی دے دی گئی ہے کہ وہ ان مقبوضات کو جو اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور امانت ہیں اور جس میں امین یا خائن بننے کی آزادی اس نے انسان کو دے رکھی ہے انسان برضا ورغبت نہ کہ مجبوراً اسے اللہ کی چیز مان لے اور وقت آنے پر اللہ کو لوٹا دے۔

اللہ کی طرف سے صرف ایک ہستی ہے جو ایسا سودا کرنے کی مجاز ہے اور وہ ہستی ہے خلیفۃ المسلمین کی جو اصل میں اللہ کی جانب سے امورِ خلافت سرانجام دے رہا ہوتا ہے اور بیعت

لیتے وقت جس کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔(فتح:10)

خلافت کی جگہ ملوکیت آئی تو اسی چور دروازے کے ذریعہ سے۔ دورِ خلافت میں اصول تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا انعقاد یا دوسرے لفظوں میں حکومت بیعت کے ذریعہ سے قائم ہوتی تھی جبکہ ملوکیت میں حکومت کے ذریعہ سے بیعت ہونے لگی۔ یہ ہمالہ قد تبدیلی تھی جس نے مستقبل کے پورے نقشے کو بدل دیا۔ اسی موڑ پر امتِ مسلمہ تین گروہوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک گروہ وہ تھا جس نے حکمرانِ وقت کی بیعت کر لی گو کہ وہ ملوکیت کی شکل میں تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جس نے ایسی درباری بیعت سے اجتناب کیا اور اپنے ہی میں سے کسی صالح، متقی اور مخلص آدمی کی بیعت متبادل انتظام کے طور پر کی۔ ان دونوں گروہوں نے جو بھی کیا نیک نیتی (In good faith) سے کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ عنقریب خلافتِ راشدہ پھر استوار ہو جائے گی اور یوں ان سمیت امت پھر پٹڑی پر چڑھ جائے گی۔ ایک تیسرا گروپ بھی تھا جس نے خلافت سے ملوکیت کی تبدیلی کو قبول ہی نہ کیا اور مزاحمت کی ٹھانی۔ اسی سلسلہ میں کئی خروج بھی ہوئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پہلا اور تیسرا گروہ تو معدوم ہو گئے۔ دوسرے گروہ کی بگڑی ہوئی صورت آج بھی ہمارے ہاں سلسلوں اور گدیوں کی شکل میں موجود ہے۔ اسی گروہ کے پیشواؤں کو مشائخ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم نے اسے بگڑی ہوئی صورت قرار دیا، ایک تو اس لیے کہ وہ کام جو ایک وقت پر نیک نیتی سے کیا گیا، وقت گزرنے کے ساتھ ایک پیشہ اور دکانداری کا روپ دھار گیا۔ اس گروہ کی کچھ اچھائیاں بھی ہیں لیکن مجموعی طور پر اس کی بے اعتدالیاں بلکہ بداعمالیاں حاوی ہیں اس کی اچھائیوں پر۔ اس کا سب سے بڑا نقصان جو امتِ مسلمہ کو ہوا ہے وہ یہ کہ جب بیعت کا متبادل انتظام ہو گیا تو امت بھول ہی گئی کہ اس ہستی کو اپنے نظامِ زندگی میں واپس لایا جائے جس کو ہی بیعت لینے کی اتھارٹی حاصل ہے یعنی خلیفۃ المسلمین۔ خلیفۃ المسلمین کو واپس لانے یا بالفاظِ دیگر بحالیٔ نظامِ خلافت کا تصور مزید پسِ منظر میں چلا گیا جب مشائخ خود خلیفہ گر بن گئے۔ ہر گدی یا سلسلے سے منسلک درجنوں خلفاء کوئی کسی محلے کا، کوئی کسی بستی کا اور کوئی کسی علاقے کا۔ دیکھا دیکھی مذاق بن گیا منصبِ خلافت تو

اس حدتک کہ انگریز نے جب محسوس کیا کہ مسلمانوں کو خلیفہ سے بڑی الفت ہے تو اس نے حجام کو خلیفہ کا لقب دے دیا۔قرآن وسنت کی رو سے مشائخ کو بیعت لینے کی کوئی اتھارٹی نہیں اس لیے کہ یہ اس پوزیشن میں نہیں کہ کسی کو جان اور مال کے عوض جنت کی گارنٹی دے سکیں۔ان کو تو خود پتہ نہیں کہ آخرت میں ان کا حشر کیا ہونے والا ہے۔نافرمانی ہے اللہ تعالیٰ کی جو شاید ان سے مسلسل نادانی سے ہو رہی ہے۔

فریضۂ شہادت علی الناس

انسانیت کی سطح پر دنیا میں دو گروہ ہمیشہ رہے ہیں۔انسانوں کا ایک گروہ وہ جو مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوا اور دوسرا گروہ وہ جو غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہوا۔دونوں گروہوں کے ہر فرد کا حساب کتاب آخرت میں ایک ہی پلیٹ فارم پر ہونا ہے۔لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہاں جوابدہ ہونے کیلئے ہر دو گروہ کے ہر فرد کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا رب چاہتا کیا ہے؟ انتخاب و ارادہ اور سزا و جزا کا نظام صرف اسی صورت میں معنی خیز ہوسکتا ہے جب ہر انسان کو یہ اطلاع مل جائے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ اس دنیا میں اسے بھیجنے کا مقصد کیا ہے؟ اس کا آغاز کیسے ہوا اور اس کی انتہا کیا ہے؟ کون سے کام اچھے ہیں اور کون سے برے؟ اچھے کام کرنے سے اسے کیا انعام ملے گا اور برے کاموں کا کیا انجام ہوگا؟ کوئی بتانے والا اسے جنت اور دوزخ کے احوال سے آگاہ کرے اور کوئی باخبر اسے بتادے کہ اس دنیا کا قیام عارضی ہے اور آخرت کا قیام دائمی۔ پھر چونکہ روزِ محشر کا حساب کتاب ہر انسان کیلئے یکساں نوعیت کا ہوگا لہٰذا سب سے پہلے اس دنیا میں وارد ہونے والے انسان کا ان تمام باتوں کو جاننا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بعد میں آنے والے کسی انسان کا۔ان میں سے کسی کے پاس یہ عذر نہ ہو کہ اسے تو ان حقائق سے کسی نے آگاہ ہی نہیں کیا۔

ایک وقت تک انسانی تاریخ میں یہ رسالت یعنی انسانوں کو مذکورہ حقائق سے آگاہ کرنے کا کام انبیاءؑ و رسلؑ کرتے رہے ہیں۔سلسلۂ نبوت منقطع ہونے پر بالخصوص غیر مسلمان

گھرانوں میں پیدا ہونے والوں تک یہ پہنچانے کا کام امتِ وسط یعنی ان انسانوں پر ڈالا گیا ہے جو مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے اور جنہیں پیدائشی وہ ماحول میسر ہوا کہ وہ مذکورہ حقائق سے از خود آگاہ ہوئے۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک ''امتِ وسط'' بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہو'' (بقرۃ:143)۔

قرآنِ مجید نے اس پہنچانے کے کام کو ''شہادت علی الناس'' کی اصطلاح سے موسوم کیا ہے۔ یہ اس لیے کہ ایک شخص سے دوسرے شخص تک الٰہی ہدایات وقوانین پہنچانے کے دو ممکنہ ذرائع ہیں۔ ایک قول سے اور دوسرے فعل سے۔ ذرائع ابلاغ کی گونا گونی سے قول سے پہنچانا تو آج بہت آسان ہو گیا۔ لیکن بذریعہ قول پہنچانے والوں یعنی مسلمانوں کیلئے اسلام ایک بڑی کڑی شرط عائد کرتا ہے اور وہ یہ کہ قول سے پہنچانے والے خود اس پر بالفعل عمل پیرا بھی ہوں۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں'' (صف:2-3)۔

یعنی مثال کے طور پر اگر کسی نے کسی دوسرے کو نماز پڑھنے کی بالقول تاکید کرنی ہو تو ضروری ہے کہ وہ تاکید کرنے والا پہلے خود نماز کا پابند ہو۔ کسی نے کسی دوسرے کو مسنون طریقے سے پانی پینے کی ہدایت کرنی ہو تو لازمی ہے کہ پہلے وہ خود مسنون طریقے سے پانی پینے کا پابند ہو۔ اسی طور جب امتِ مسلمہ کیلئے یہ ''شہادت علی الناس'' کا کام بطور فرضِ منصبی قرار دیا جا چکا تو اس کیلئے بطور پیشگی ضرورت (Pre-Requisite) لازمی ٹھہرا کہ جس دینِ حق کو اس نے دنیا والوں تک پہنچانا ہے، بالقول پہنچانے سے پہلے وہ خود اس دین یعنی اسلام کو بالفعل قائم کیے ہوئے ہو۔ دینِ اسلام کو بالفعل قائم کرنا ہی نظامِ خلافت ہے۔ ''شہادت'' کا مطلب ہے گواہی یعنی ایسا نظام دنیا میں بطور گواہ عملاً موجود ہو تا کہ اس کی برکات اور فوائد و فیوض خود دنیا والے بچشمِ سر دیکھ

سکیں۔ نظامِ خلافت نہ ہونے کی وجہ سے یہ فرضِ منصبی آج امتِ مسلمہ سے نہیں ہو رہا۔ سوختہ بختی قطعاً نہیں ہو رہا۔

غلبۂ دینِ حق

سابقہ لیکچروں میں دورِ حاضر کے مسلمانوں کا دنیا میں مغلوب ہونا اور دنیا کی قیادت کا اہل کفر و شر کے ہاتھ میں ہونا کافی زیرِ بحث آ چکا۔ نظامِ خلافت موجود ہو تو دینِ حق موجود ہوتا ہے۔ نظامِ خلافت کی عدم موجودگی میں بے دینی کی ایک شکل ہے جسے آج ہم اسلام سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہیں۔ قرآن بڑے دوٹوک انداز میں پتہ دیتا ہے کہ دینِ حق کی سرشت میں ہے کہ اسے دنیا میں بطور غالب قوت ہی موجود ہونا ہوتا ہے۔ فرمایا گیا:

''اور اللہ کا بول تو اونچا رہنے والا ہے'' (توبہ: 40)۔

مغلوب ہی رہیں گے دنیا میں مسلمان جب تک یہ نظامِ خلافت کو بحال کر کے اسے رواں دواں نہیں رکھتے۔ غلبۂ دینِ حق تو ویسے ہی دوسرا مرحلہ ہے جس کی تبھی باری آتی ہے کہ قبل قیامِ خلافت کا پہلا مرحلہ سرانجام ہو۔ (نور: 55)

سود، شرک، فحاشی

سود، شرک اور فحاشی تین عالمگیر بیماریاں ہیں۔ یہ عالمی طاقتوں کی پیدا کردہ ہیں اس لیے کہ دنیا کی قیادت ان کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ جو ان تینوں بیماریوں کا قلع قمع چاہتے ہیں۔ اہلِ شر کہ جن کے ہاتھ میں دنیا کی قیادت ہے اپنے تمام ذرائع اور تمام توانائیاں شر کو عام کرنے میں صرف کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے میں مسلمان ہونے کے ناطے سود سے نفرت کرتا اور اس سے آخری حدود تک بچنا چاہتا ہوں لیکن میری یہ خواہش، ایک سہانی خواہش ہی رہے گی جب تک دنیا کی قیادت اہلِ خیر کے ہاتھ میں نہیں آ جاتی۔ پوری دنیا اس وقت سودی نظام میں جکڑی ہوئی ہے۔ مجھے اسی باطل کے نظام میں ہی رہ بسنا ہے۔ ٹھیک ہے میں بینک میں اپنی بچت جمع نہ کراؤں یا

کراؤں تو کرنٹ اکاؤنٹ وغیرہ میں کرا کر کسی حد تک تو میں سود سے بچ سکتا ہوں لیکن اس کا کیا جائے کہ جس قلم سے میں لکھ رہا ہوں اس میں سود ہے۔ اس لیے کہ تمام مصنوعات کسی نہ کسی فیکٹری میں بنتی ہیں اور آج کے دور میں کونسی فیکٹری ہے جو سودی نظام سے ماوراء ہو۔ تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی سود میں ملوث ہوں اور وہ اس لیے کہ سسٹم میں سود ہے اور یہ سودی نظام باطل عالمی طاقتوں کا برپا کردہ ہے۔ میں مجبور ہوں' سود سے نہیں بچ سکتا اس لیے کہ موجودہ حالات مجھے جکڑے ہوئے ہیں۔ نظامِ خلافت نہیں تو نظامِ جہالت کا دور دورہ ہے۔ بنابریں **"I am victim of the system"** میں سود سے نہیں بچ سکتا۔

اسی طرح شرک اتنی بڑی اخلاقی بیماری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے' اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے اللہ بخشنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا'' (نساء:116)۔

جیسے کہ اوپر ذکر ہوا نظامِ خلافت نہ ہو تو ''پورے کے پورے اسلام میں داخل ہونے'' کی صورت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ کوئی لاکھ کوشش کرے زیادہ سے زیادہ یہ صورت بن سکتی ہے کہ کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام۔ یہ کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام ہی تو شرک ہے۔ نظامِ خلافت کی عدم موجودگی میں تو آج کے مسلمان اغیار کی ڈکٹیشن لینے پر مجبور ہیں۔ یہ تو ''مہا شرک'' ہے جس میں دنیا بھر کے مسلمان ملوث ہیں۔

فحاشی' عریانی' بے حیائی' بے غیرتی بلکہ بے حمیتی سے کون سا انسان ہے کہ جو بچا ہوا ہو؟ دنیا بھر کے ذرائع وابلاغ صبح وشام لگے ہوئے ہیں یہ بداخلاقیاں پھیلانے...... آپ ٹی وی نہ رکھیں' اخبار نہ پڑھیں' آپ کی پرواز دور تک نہ ہو لیکن مسجد تک جاتے ہوئے جو طوفانِ بدتمیزی کھلے بانہوں آپ کو دعوتِ گناہ دے رہا ہوتا ہے' کیا ہے کوئی ایسی عینک جو آپ کو امڈتے آتے اس طوفانِ حیا سوزی سے بچا سکے؟

بس مجبوری ہے' مجبوری ہے کی رٹ لگائے ہم قبر میں چلے جائیں گے۔ نظامِ خلافت ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔

اجتہاد کے دروازے بند

خلافتِ راشدہ کے مبارک دور کو منقطع کر کے ملوک نے ڈیرے آ جمائے تو انہیں کمر توڑ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی وہ وقت تھا جب علماء امت نے سرکاری شوریٰ کو درباری مولویوں کا گٹھ جوڑ قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔ متبادل انتظام کے طور پر فقہائے اسلام کے متعدد مکتبۂ فکر معرضِ وجود میں آئے جن میں حنفی' مالکی' شافعی اور حنبلی ہمارے ہاں کافی معروف ہیں۔ ان فقہی گروہوں نے گرانقدر کام کیا' جو نظامِ خلافت قائم ہونے والی شوریٰ کیلئے انمول خزانہ ثابت ہوگا۔ بایں ہمہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فقہی مکتبۂ فکر نظامِ خلافت کی اصل شوریٰ کے نہ ہونے سے متبادل انتظام کے طور پر معرضِ وجود میں آئے۔ دینِ حق سے یہ انحراف تھا لہٰذا وقت گزرنے کے ساتھ یہ گرانقدر کام بھی متعدد مذہبی طبقات اور فرقوں کی تخلیق کا باعث بنا۔ خلافتِ راشدہ کا نظام اگر قائم دائم رہتا تو ان متعدد مکتبہ ہائے فکر کا ظہور ہی نہ ہوتا اور اجتہاد کا کام امتی سطح پر قرآنی شوریٰ سے ہی سرانجام ہوتا رہتا۔ آج ایسی شوریٰ کا وجود نہیں تو اجتہاد کے دروازے بند ہیں۔ مختلف دارالعلوموں کی سطح پر یہ مفتی حضرات کی ضرورت نہ پڑتی۔ فتووں سے فتوے نہ ٹکراتے۔

جہاد

وقت کے موجودہ موڑ پر مختلف جہادی گروہوں' تنظیموں اور لشکروں کو جو قتال و جہاد کرنا پڑ رہا ہے یہ ''مجبوری'' کا راستہ ہے۔ اس کی حیثیت ایسی ہی ہے کہ کسی کے سامنے اس کی بہن' بیٹی یا بیوی وغیرہ کو کوئی جبراً چھین کر بھاگنے کی کوشش کرے تو اس کے پاس چار و ناچار اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ اس کا بھرپور دفاع کرے' خواہ اس کی جان جاتی رہے۔ ناقابلِ فہم تصور ہے

کہ مسلم ہو اور جان کو آن پر قربان نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے خزانے بڑے وسیع ہیں' قتال و جہاد کرنے والوں کیلئے اس کے پاس بہت کچھ دینے کو ہے اور راہِ جہاد میں جانیں دینے والے' انشاء اللہ' روزِ محشر سرخرو ہونگے۔ لیکن کوئی یہ نہ بھولے کہ نظامِ خلافت کی عدم موجودگی میں یہ قتال و جہاد کا متبادل راستہ ''مجبوراً'' آج کے مسلمانوں کو اختیار کرنا پڑا' ورنہ شرعی قتال و جہاد کیلئے درج ذیل دو شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ شرعی قتال و جہاد صرف ملکوں کی سطح (State to State) پر کیا جانا ضروری ہے' نجی لشکروں اور پرائیویٹ تنظیموں کی سطح پر نہیں۔

۲۔ شرعی قتال و جہاد صرف خلیفۂ وقت یا اس کی زندگی میں اسی کے نمائندے کے ایماء اور اجازت پر ہوسکتا ہے' ہر آدمی کو اپنی سطح پر جہادی گروہ بنا کر ایسے کرنے کی اجازت نہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے مکی دورِ نبوت جسے اوپر قیامِ خلافت کے دور سے موسوم کیا گیا میں قیامِ نظامِ خلافت کی جدوجہد تو ہوئی اور حقیقت میں بھرپور ہوئی لیکن قتال والا جہاد نہیں ہوا۔ اس وقت تک مسلمان ہونے والوں کو اذیتیں دی گئیں' زیرِ آسماں بے مثل مارا پیٹا گیا لیکن کسی مسلمان نے کفار و مشرکین میں سے کسی کو تھپڑ تک نہیں مارا' تھپڑ مارنا تو درکنار مسلمانوں نے ترش کلامی سے اجتناب کیا۔ کمینگی کا مقابلہ شرافت اور بدی کا مقابلہ نیکی سے کیا۔ دشمنانِ اسلام نے تو ''بے صبری'' کا مظاہرہ بھرپور کیا' مسلمانوں نے ''صبر'' کا دامن تھامے رکھا۔ یاد رہے جیسے پہلے ذکر ہو چکا جب نبیٔ کائنات ﷺ کو دوسری ہی وحی میں دنیا میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی و حاکمیت کو قائم کرنے کا حکم دیا تو اسی وحی کے آخری آیۂ مبارکہ یعنی ساتویں آیت میں یہ تاکید بھی کر دی کہ ''اپنے رب کی خاطر صبر کرنا'' اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ تبدیلیٔ نظام جان جوکھوں کا کام ہے۔ بڑے مشکل اور بھیانک مراحل آئیں گے۔ دل دہل جائیں گے اور مومنین ہلا مارے جائیں گے۔ غزوۂ خندق میں ایک ایسا مرحلہ آیا جسے قرآنِ مجید بیان کرتا ہے تو

اس طرح کہ ”اس وقت ایمان والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے“ (احزاب:11)۔

لیکن یادرہے یہ کشت وخون والے مراحل مدینہ میں پیش آئے جب ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست دنیا بھر کی بڑی بڑی مملکتوں کے مقابلے میں معرضِ وجود میں آگئی۔ مکہ میں ایسا نہ ہوا تو اس لیے کہ ابھی اسلام کی ریاست معرضِ وجود میں نہ آئی تھی۔ قیامِ خلافت کے دور میں ”کفوا ایدیکم“ کا راستہ اختیار کیا گیا‘ ظلم کے مقابلے میں صبر کا راستہ اختیار کیا گیا۔ اسلامی ریاست کے وجود پذیر ہوتے ہی اس پابندی کو اٹھالیا گیا اور ابتدا ہی میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف قتال کی اجازت دے دی بلکہ ایسا کرنے کی وجہ کو بھی بیان کیا۔ قرآنِ مجید میں اس کا ذکر آیا۔ فرمایا گیا:

”اجازت دے دی گئی (قتال کی) ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے۔ کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ”اللہ ہمارا رب ہے“۔ (حج:39)۔

مظلوم اور اللہ کے درمیان کوئی دیوار نہیں ہوتی۔ مظلوم کی مدد ربِ کائنات اس طور کرتا ہے جیسے کہ یہ اس پر واجب ہو۔ مکی دورِ نبوت کے مسلمانوں سے زیادہ اور کون زیادہ مظلوم ہوگا جنہیں اپنے وطن اور اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ ہجرتِ مدینہ نظامِ باطل سے انقطاع کی آخری صورت تو تھی ہی اللہ تعالیٰ کی نصرت کو حاصل کرنے کا اعلیٰ ترین ذریعہ بھی تھی۔ قرآنِ مجید میں ایسے ہی مواقع کیلئے آیا:

”جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کیلئے بہت جگہ اور بسر اوقات کیلئے بڑی گنجائش پائے گا‘ اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ کی طرف ہجرت کے لیے نکلے‘ پھر اسے موت آجائے اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوگیا‘ اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے“ (نساء:100)۔

وقت آیا مکی دورِنبوت میں تشدد کے مقابلہ میں صبر کرنے والوں پر کہ نہ صرف عرب وعجم جیسی وسیع وعریض جگہ انہیں رہنے کو ملی بلکہ نصرتِ ایزدی بھی ان کے شاملِ حال ہوگئی۔قرآنِ مجید میں آیا:

''یاد کرو وہ وقت جبکہ تم تھوڑے تھے۔ زمین میں تجھ کو بے زور سمجھا جاتا تھا۔تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کردی۔اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا۔ شاید کہ تم شکر گزار بنو''(انفال:26)۔

سورۂ حج جو ہجرتِ مدینہ کے کچھ ادھر کچھ اُدھر' یا کچھ مکی دور کے آخری ایام میں اور کچھ مدنی دور کے آغاز میں نازل ہوئی میں اس بات کا ذکر کہ ''اجازت دے دی گئی قتال کی'' کیا برملا اس کو واضح نہیں کرتا کہ مکی دورِنبوت میں قتال کی اجازت نہ تھی حالانکہ مسلمانوں پر حملے ہو رہے تھے۔ وجہ اس کی صرف یہی تھی کہ قتال والے جہاد کا ہونا ملکوں کی سطح کا کام ہے اور بنابریں جونہی مدینہ میں اسلامی مملکت معرضِ وجود میں آگئی قتال کی اجازت دے دی گئی۔مکہ میں قتال کی اجازت نہ تھی تو اس لیے کہ اسلامی ریاست کا ابھی وجود نہ تھا اور نظامِ خلافت قائم نہ تھا۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ اسلامی ریاست کے صوبے تو اَن گنت ہو سکتے ہیں' پوری دنیائے اسلام' خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں مملکتِ واحدہ کی صورت میں رہنے کی پابند ہے۔آج اسلامی دنیا کا کوئی 57 مما لک میں منقسم ہونا خود قرآن وسنت سے انحراف ہے ورنہ مثال کے طور پر کشمیر کا مسئلہ صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں پوری دنیائے اسلام کا مسئلہ ہوتا۔اور یہ بھی کہ جب پوری دنیائے اسلام کا مسئلہ ہوتا تو اول تو یہ اور اس قبیل کے دوسرے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے اور اگر ہوتے تو دنوں بلکہ گھنٹوں میں حل ہوتے سالہا سال وبالِ جان نہ بنتے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آج ہمارے بھائی جو مجبوراً قتال کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں' ایسا

جہاد بند کردیں، البتہ ہم یہ کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ وہ اس ہستی کو لانے کی بھی متوازاً کوشش کریں جس کے ایما و اجازت سے ہی قتال والا جہاد ہوتا ہے اور جسے نبیؐ کائنات ﷺ کے ارشاد کے مطابق ڈھال کی حیثیت ہوتی ہے۔ بلکہ جس کی موجودگی میں ہی امت کے جملہ مسائل حل ہوتے ہیں۔فرمایا گیا:

''امام ڈھال ہے جس کے پیچھے مسلمان لڑتے ہیں (کافروں سے) اور اس کے ہوتے ہوئے بچتے ہیں مسائل سے۔ پھر اگر وہ حکم کرے اللہ سے ڈرنے کا اور انصاف کرے تو اس کو ثواب ہوگا اور جو اس کے خلاف حکم دے تو اس پر وبال ہوگا'' (مسلم۔ کتاب الامارت)۔

خرابی ہمارے اپنے گھر میں ہے جس کی وجہ سے دشمنانِ اسلام کو موقع مل گیا کہ وہ منتشر اجتہادی جتھوں میں شامل ہمارے نوجوان عنصر کی تھوڑے اور بے ہتھیار ہونے کی بنا پر بآسانی نکاسی کرتے رہیں اور وہ بھی مسلمانوں کی اپنی سرزمینوں میں تاکہ کل کو مجتمع ہو کر وہ دشمن کے لیے خطرہ نہ بن سکیں۔ یہ گھر کی خرابی ایک ہی صورت میں دور ہو سکتی ہے کہ نظامِ خلافت رواں دواں ہو۔

اتحاد

ہم پہلے ذکر کر آئے کہ اتحاد کی اعلیٰ ترین صورت پوری دنیائے اسلام کے ذرائع و وسائل کا ایک خلیفۃ المسلمین کے ہاتھ میں مجتمع ہونا ہے۔آج کفار و مشرکین تو متحد ہیں لیکن سوختہ بختی، مسلمان ہیں کہ منتشر۔اس وقت سے ہم مسلمان فطری اتحاد و یگانگت سے محروم ہیں جب سے فطری نظام......نظامِ خلافت کو گنوا چکے ہیں۔جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا مسلمان تا قیامت درج ذیل آیۂ کریمہ پر عمل نہیں کر سکتے:

''سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو'' (آلِ عمران:102)۔

اسی طرح درج ذیل آیۂ مقدسہ پر بھی اس وقت تک عمل نہیں ہو سکتا جب تک مسلمانانِ

عالم یونی کمانڈ کی سرکردگی میں نہ ہوں یا بالفاظِ دیگر نظامِ خلافت اس دھرتی کا مقدر نہ بن جائے:

''(مسلمانو) مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں''

(توبہ:36)۔

مشرکوں کا مل کر لڑنا تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔عراق، افغانستان وغیرہ میں کفار ومشرکین باہم اتحادی اور حمایتی بن کر لڑ رہے ہیں۔اس کے مقابلہ میں پوری دنیا کے مسلمان منتشر ہیں۔کسی ایک محاذ پر بھی مسلمانانِ عالم ایک جھنڈے تلے متحد ہو کر آگے نہیں بڑھ رہے۔محاذ پر متحد ہونا تو درکنار او آئی سی اور عرب لیگ جیسے بظاہر مشترکہ پلیٹ فارموں پر اکٹھے ہونے والے بھی یگانگت ویکجہتی کا مظاہرانہیں کرتے بلکہ ایسا تاثر چھوڑتے ہیں کہ جیسے ان کی باگ ڈور کسی غیبی ہاتھ میں ہو۔اجتماع تو مسلمان سربراہان کا ہوتا ہے لیکن ایسے اجتماع میں طاغوتی طاقتوں کے مفادات کی آبیاری کی جارہی ہوتی ہے۔اصل میں ان کے انتشار نے ہی ان بیرونی طاقتوں کو اس قابل بنایا کہ وہ انہیں آپس میں لڑا کر مسلمان سرزمینوں کے ذرائع اور وسائل کو لوٹ کر اپنے ہاں کی رونقیں بڑھائیں۔

امتِ مسلمہ زیرِ عتاب

آج ہم زیادہ سے زیادہ ''مسلمانانِ عالم'' کی اصطلاح ہی استعمال کر سکتے ہیں اس لیے کہ جیسے ہم پہلے ذکر کر آئے نظامِ خلافت کی عدم موجودگی میں اور مرکزیت ختم ہونے سے ''امتِ مسلمہ'' کا وجود زیرِ آسماں کہیں نہیں اور یہ امتِ مسلمہ کے وجود کا نہ ہونا بذاتِ خود عذاب کی شکل ہے۔اس کے علاوہ مسلمانانِ عالم وقت کے اس موڑ پر تین طرح کے عذاب سے دوچار ہیں۔قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے صدیوں پہلے نشاندہی فرمادی تھی کہ جب بھی مسلمان خود پر فلاں فلاں مخصوص حالات مسلط کرلیں گے تو وہ فلاں فلاں قسم کے عذاب سے لازماً دوچار ہونگے۔پہلی قسم کا عذاب وہ ہے جو مسلمانوں پر اس وقت نازل ہوتا ہے جب مسلمان ایسے نظام کو رواں دواں کیے ہوئے ہوں جو کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام کا ملغوبہ ہو۔فرمایا گیا:

’’تو کیا تم کتاب کے کچھ حصوں پر ایمان لاتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں‘ ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے‘ جو تم کر رہے ہو‘‘ (بقرۃ:85)۔

اس آیۂ کریمہ میں دو طرح کے عذاب کی نوید دی گئی ہے۔ایک عذاب کی صورت اسی دنیا میں ذلت وخواری کی شکل میں نازل ہونے والی اور دوسری شدید ترین صورت میں آخرت میں مسلط ہونے والی ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا‘ جس ذلت وخواری سے دنیا بھر کے مسلمان اس وقت دوچار ہیں اسی وجہ سے ہے۔اس دنیا میں مسلمانوں کا ذلت وخواری سے دوچار ہونا بتا رہا ہے کہ آخرت کا ’’شدید ترین عذاب‘‘ ان کے انتظار میں ہے۔نظامِ خلافت قائم ہوتا تو عذاب کی یہ صورت کبھی پیدا نہ ہوتی۔

دوسری قسم کا عذاب جو مسلمانانِ عالم پر وقت کے موجودہ موڑ پر مسلط ہے اور جس کا ذکر قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے کر رکھا ہے‘ یوں ہے:

’’کہو وہ (اللہ) اس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے نازل کر دے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزا چکھوا دے۔ دیکھو‘ ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں‘‘ (انعام:65)۔

واقعات کی دنیا میں کس قدر کھل کر ہمارے سامنے ہے عذاب کی یہ شکل کہ ’’تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزا چکھوا دے‘‘۔فلسطین میں‘ عراق میں‘ افغانستان میں بلکہ ہمارے ہاں پاکستان میں مسلمان ہی مسلمان کو مار رہا ہے۔اور چونکہ ہم نظامِ خلافت کی طرف نہیں آ رہے اور بنابریں ہماری سمت درست نہیں‘ وقت گزرنے کے ساتھ مسلمان سے ’’مسلم ماری‘‘ کے عمل میں شدت آ رہی ہے۔اگر کسی عمرؓ کا کوڑا کہیں زیرِ آسماں

موجود ہوتا تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔

مذکورہ دو عذاب کی اقسام تو وہ ہیں جو زیادہ تر براہِ راست مسلمانوں کو متاثر کیے ہوئے ہیں۔ شومیٔ قسمت' قرآنِ مجید عذاب کی ایک ایسی قسم کا ذکر بھی کرتا ہے جو صرف مسلمانوں کو ہی متاثر نہیں کرتی' مسلمانوں کی نااہلی کی وجہ سے آج پوری انسانیت کو ہی متاثر کیے ہوئے ہے۔ فرمایا گیا:

''جو کافر ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ (مسلمانو!) اگر تم ایسا نہ کرو گے تو یہ زمین بھر جائے گی فتنے اور بڑے فساد سے'' (انفال: 73)۔

شرق و غرب گھوم جائیں آج کی کوئی قوم' خواہ توانا ہو یا کمزور' کوئی ملک خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' کوئی فرد خواہ امیر ہو یا غریب' بے سکونی' بے اطمینانی اور بے بسی کا شکار ہے۔ دنیا بھر میں جس قدر ظلم و جور' فتنہ و فساد' جوڑ توڑ' لوٹ کھسوٹ' دھکم پیل وغیرہ ہے اسی وجہ سے ہے کہ وہ امت جسے اللہ تعالیٰ دنیا والوں کی اصلاح کے لیے میدان میں لایا تھا (آلِ عمران: 110) آج خود خلافت کے مبارک نظام کو کھو کر در در کی جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہے۔ عذاب کی اس شکل نے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں' غیر مسلموں کو ہی نہیں' زمین کی ہر ذی روح کو مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ بڑی وسعت ہے اس عذاب کی' پوری انسانیت کو اس نے بے رحم اور بھیانک شکنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ فساد تو وقت کے اس موڑ پر ہر سو نظر آ رہا ہے۔ دائیں بائیں' آگے پیچھے' فضا سے تحت الثراء تک۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فتنہ کیا ہے جس کا نتیجہ یہ فساد ہے۔ فتنہ یہ ہے کہ دنیا کی قیادت اس موڑ پر کفر کے ہاتھ میں ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شر براجمان ہے اور وہ انسانیت کی کشتی کو اندھیرے غاروں میں لیے پھر رہا ہے۔ کشتی میں سوار پوری انسانیت شر کے رحم و کرم پر ہے۔ اس کشتی میں مسلمان بھی ہیں لیکن' شومیٔ قسمت' کھڈے لائن لگے ہوئے...... سہمے ہوئے' دبکے ہوئے' مجبور و بے بس۔ نظامِ خلافت ہوتا تو ''خیرِ امت'' کیا یوں ''نشانِ عبرت'' بنتی؟

پس چہ باید کرد (کریں ہم تو کیا؟)

وہی کریں جو رسول ﷺ نے کیا۔ آئے تھے تو دورِ جہالت تھا' دنیا سے تشریف

لے گئے تو دورِ خلافت تھا۔ انہوں نے نظامِ باطل کو نظامِ خلافت میں بدلا' ہم بھی نظامِ باطل کو نظامِ خلافت میں بدلیں۔ ایسا کریں' اس لیے کہ ایسا کرنا مقصدِ تخلیقِ آدم ہے۔ ایسا کریں' اس لیے کہ ایسا کرنے سے دنیا میں اللہ کے قانون کی حکومت یا حکومتِ الٰہیہ قائم ہوتی ہے۔ ایسا کریں کہ ایسا کرنا اسوۂ رسول ﷺ ہے۔ ایسا کریں کہ ایسا کیے بغیر دینِ حق یوں جیسے زردی کے بغیر انڈا۔ ایسا کریں کہ ایسا کیے بغیر شرعی اولوالامر معرضِ وجود میں نہیں آتے اور ہمارا نظامِ اطاعت ادھورا رہ جاتا ہے۔ ایسا کریں' اس لیے کہ ایسا کرنے سے زیرِ آسماں امتِ مسلمہ کا وجود قائم رہتا ہے ورنہ امت' اقوام میں بٹ جاتی ہے۔ ایسا کریں کہ ایسا کرنے سے بیت المال وجود میں آتا ہے اور بیت المال کی عدم موجودگی میں ہمارا نظامِ زکوٰۃ آج درہم برہم ہے۔ ایسا کریں' اس لیے کہ ایسا کرنے سے ہی اصل نظامِ صلوٰۃ قائم ہوتا ہے۔ ایسا کریں' اس لیے کہ ایسا کیے بغیر وہ ڈھال معرضِ وجود میں نہیں آتی جس کے پیچھے ہی مسلمانوں نے قتال کرنا ہوتا ہے۔ ایسا کریں' اس لیے کہ ایسا کرنے سے ہی ہمارے ہاں نظامِ بیعت بحال ہوتا ہے۔ ایسا کریں' اس لیے کہ ایسا کیے بغیر عالمی سطح پر فریضۂ شہادت علی الناس کما حقہ ادا نہیں ہوتا۔ ایسا کریں' اس لیے کہ ایسا کرنا عالمی سطح پر فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ادائیگی کیلئے ضروری ہے۔ ایسا کریں' اس لیے کہ ایسا کیے بغیر غلبۂ دین کا حصول ناممکن ہے۔ ایسا کریں' ایسا کرنے سے ہی دینِ حق کی برکات بشمل عدل' امن' خوشحالی' اتحاد وغیرہ حاصل ہوتی ہیں۔ ایسا کریں' اس لیے کہ ایسا کریں تو دین ہے' ورنہ بے دینی اور ایک بڑا فریب۔

جس قدر جلد ممکن ہو عملاً ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ سازش کے تحت وجود پذیر موجودہ ستاون اٹھاون مسلم ممالک کو صوبوں کا درجہ دے کر اور باہم مدغم کر کے کرۂ ارض پر ایک عظیم تر اسلام کی مملکتِ واحدہ کو معرضِ وجود میں لایا جائے۔ ایسی مملکتِ واحدہ ایک خلیفۃ المسلمین کی سربراہی میں ہو۔ اس کا آئین قرآن وسنت اور نام ''دارالسلام'' ہو۔

برکاتِ خلافت

اسلام انسانیت کا دین ہے

قرآنِ مجید۔ آسمانی کتابوں کے سلسلہ کی آخری کتاب کا آغاز ''ربّ العالمین'' کی حمد سے ہوتا ہے تو اختتام لفظ ''النّاس'' سے۔ اس کتاب جسے بشمول پہلی نازل شدہ کتبِ آسمانی قرآنِ مجید ''الکتاب'' کا نام دیتا ہے' میں انسانوں کے خالق و پروردگار سے آغاز اور انسان سے اختتام کیا گیا تو یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس انوکھی' یکتا اور عظیم کتاب کا موضوع ''انسان'' ہے۔ پھر چونکہ انسانیت اس کرۂ ارض پر وارد ہونے والے پہلے انسان سے لے کر قیامت سے پہلے آخری وارد ہونے والے انسان پر مشتمل ہے لہذا ظاہر ہے کہ جب جملہ آسمانی کتابوں کا مجموعہ یعنی الکتاب انسان کے متعلق ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب ہے کہ یہ انسانیت کی کتاب ہے۔ اسی بات کا مزید احاطہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ چند بنیادی حقائق کا پہلے ادراک کر لیا جائے۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ جب الکتاب انسان و انسانیت کی کتاب ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ انسان کی تخلیق' دوسری مخلوقات کے بارے میں اسکی حیثیت' مقصدِ تخلیقِ آدم' اس دنیا میں انسانی زندگی گزارنے کے قوانین وضوابط' انسان اور کائنات کے باہمی تعلق' اللہ اور انسان کے باہمی تعلق کی پوری روئیداد و نظم بیان کرتی ہے۔ اسی نظام کا نام ''اسلام'' ہے۔ یہ کتاب پتہ دیتی ہے کہ اللہ کے نزدیک اس دنیا میں وارد ہونے والے پہلے انسان سے لے کر قیامت سے پہلے آخری انسان کے وارد ہونے والے انسان کے لئے زندگی گزارنے کا پسندیدہ نظام ''اسلام'' ہے۔ انسانی تاریخ کے مختلف مرحلوں پر انسان خود بے جا مداخلت کر کے مختلف نسبتوں کی آڑ میں دینِ اسلام کو اسلام کی بجائے دوسرے ناموں سے موسوم کرتے رہے ہیں' جیسے یہود کی نسبت سے یہودیت اور عیسیٰؑ کی نسبت سے عیسائیت وغیرہ۔ بالفاظِ دیگر یہ خود ساختہ اصطلاحات انسانی اختراعات ہیں' ہمارے خالق کی طرف سے نہیں' لہٰذا اللہ کے نزدیک ظاہر ہیں' ناپسندیدہ ہیں۔

دوسری حقیقت یہ کہ اسلام دین ہے' مذہب نہیں۔ قرآنِ مجید میں مذہب کی اصطلاح

کہیں استعمال نہیں ہوئی۔ بنابریں' دین اور مذہب کی اصطلاحات کو سمجھنا بڑا ضروری ہے۔قرآنِ مجید میں دین کی اصطلاح کوئی معانی میں استعمال کیا گیا ہے لیکن اکثر و بیشتر یہ اصطلاح ''نظام'' یعنی انسانی نظامِ زندگی کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔یعنی اللہ انسان کو پابند کرتا ہے کہ وہ اسی نظامِ زندگی یا دین کو اپنائے جو ''الکتاب'' میں بیان ہوا ہے۔نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ الکتاب میں بیان کردہ دین کی جو ایک اہم شق ہے وہ انسان کے مقصدِ تخلیق کے متعلق ہے نہ کہ صرف مسلمان کے مقصدِ تخلیق کے متعلق۔اللہ کا فرمانا ہے:

''میں نے جنّ اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں'' (ذاریات:۵۶)

اللہ کی بندگی وعبادت کا حق محض چند مراسمِ عبودیت یعنی نماز' روزے وغیرہ سے پورا نہیں ہوتا۔اگر ہوتا ہے تو تبھی جب زندگی کے ہر شعبہ بمثل سماجی' معاشرتی' معاشی' سیاسی' تعلیمی' عسکری وغیرہ میں اسی قانون اور اسی نظام کے مطابق عمل پیرا ہوا جائے جو الکتاب میں بیان ہوا ہے۔ یہ ہر ہر دائرۂ کار میں اللہ کے عطا کردہ قانون کا کارفرما ہونا دین ہے۔اس کے مقابلہ میں انسان کا چند لمحات مراسمِ عبودیت میں گزارنا اور باقی زندگی الکتاب میں بیان کردہ قوانین وضوابط کی بجائے اپنی من مرضی یا خودساختہ قوانین کے مطابق گزارنا ''مذہب'' ہے۔دین پوری انسانی زندگی کو بطورِ ''کل'' (As a whole) لیتا ہے جبکہ مذہب چند مراسمِ عبودیت کے علاوہ پوری زندگی کو الکتاب میں بیان کردہ قوانین وضوابط سے خارج رکھتا ہے۔ یہ بھی کہ مذہب انسانی زندگی کو دو علیحدہ علیحدہ دوائر یعنی مذہبی زندگی اور سیاسی زندگی میں تقسیم کرتا ہے۔سیکولرازم بھی بڑی حد تک یہی ہے۔ پھر یہ بھی کہ مذہب صرف یہ دو دوائر ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے حلقہء اثر میں ''مذہبی لوگ'' اور ''سیاسی لوگ'' جیسے دو بیّن (Distinct) گروہ بھی پیدا کرتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ کہ الکتاب میں دی گئی ہدایات وقوانین کا سرچشمہ صرف ایک ذات یعنی اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔اس نے دنیا میں پہلے پیدا ہونے والے انسان کو زندگی گزارنے کی

وہی سہولتیں اور ہدایات دی ہیں جو کہ اس دنیا میں وارد ہونے والے آخری انسان کو۔ اگر فرق کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو تمدّنی زندگی کے ارتقاء کے وجہ سے۔ اسی لئے اللہ (سرچشمۂ ہدایت) نے پوری انسانی تاریخ پر وقفہ وقفہ سے انبیاء وہ رسلؑ کو مبعوث فرمایا ہے تا کہ وقت کے ساتھ اگر ہدایات وقوانین میں کوئی تبدیلی ضروری ہو تو دین کی تجدید ہوتی رہے' ایسا کرنے کے لئے دو واضح تبدیلیاں کی گئیں:

پہلی تبدیلی یہ کہ پہلی آسمانی کتابیں بشمل زبور' تورات' انجیل وغیرہ میں وہی ہدایات دی گئی تھیں جن پر اس وقت کے تمدّنی ارتقاء کے مطابق عمل کرنا ممکن تھا۔ یعنی وقت کے اس مخصوص موڑ پر نازل کردہ ہدایات وقوانین اس وقت کے لئے تو مکمل تھیں لیکن پوری انسانی تاریخ کے لحاظ سے جزوی تھیں۔ مکمل ہدایات جو پورے کرۂ ارض پر محیط ہو سکتی تھیں بعد میں اس وقت اتاری گئیں جب تمدّنی ارتقاء خود اس حد تک ٹھہرا کہ پوری دنیا ''ایک گاؤں'' کی صورت اختیار کرنے کو تھی۔ ذرائع ابلاغ اور آمد ورفت میں بے مثل انقلاب آنے کو تھا۔

دوسری تبدیلی یہ کہ جب دین اور الکتاب کی تکمیل ہوگئی تو آسمانی کتابوں کی تنزیل کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ پھر جب آسمانی کتابوں کی تنزیل کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو ظاہر ہے مزید انبیاء ورسلؑ کی بعثت کے سلسلے کی ضرورت نہ ہونے کی بنا پر آخری رسول ﷺ بھیج کر اس سلسلے کو بھی منقطع کر دیا گیا۔ اب تا قیامت پایۂ تکمیل کو پہنچنے والی ہدایات وقوانین پر مشتمل الکتاب ''قرآن مجید'' ہے تو انسانی سطح پر مبعوث ہونے والے آخری نبی ﷺ یا بلفاظِ دیگر نبیٔ کائنات ﷺ ''محمد ﷺ'' ہیں۔ پہلے والی کتابیں بھی اقوام کی سطح کی اور جزوی تھیں اور پہلے والے انبیاء بھی انسانیت کی سطح کے نہ تھے بلکہ اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث تھے۔ تکمیلی کتاب اور تکمیلی نبی ﷺ اس وقت متعارف کرائے گئے جب اللہ کی طرف سے یہ اعلان کر دیا گیا کہ:

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے'' (مائدہ:3)

موضوعِ سخن یعنی ''اسلام انسانیت کا دین ہے'' کی طرف آتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید اور سنّتِ رسول ﷺ میں بیشتر اصولی ہدایات وقوانین انسانیت کی سطح کے ہیں نہ کہ محض مسلمانی کی سطح کے۔ ان میں چند ایک کا ذکر درج ذیل ہے۔

''اے انسانو! بندگی اختیار کرو اپنے اس ربّ کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے' تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے'' (بقرہ: 21)۔

''ہم نے کہا تم سب (انسان) یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے' تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے' وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں' جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے'' (بقرۃ: 39)

''ابتدا میں سب انسان ایک ہی طریقہ پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبیؑ بھیجے جو راست روی پر اجازت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے مابین جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے' ان کا فیصلہ کرے'' (بقرۃ: 213)

''انسانوں کے لئے مرغوباتِ نفس۔۔۔ عورتیں' اولاد' سونے چاندی کے ڈھیر' چیدہ گھوڑے' مویشی اور زرعی زمینیں۔۔۔ بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں' مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں' بہتر ٹھکانہ تو اللہ کے پاس ہے'' (آلِ عمران: 14)

''اور وہی (اللہ) ہے جس نے ایک متنفّس سے تم کو پیدا کیا۔۔'' (انعام: 98)

''ہر شخص کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمہارا ربّ لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے''(انعام:132)

''اے بنی آدمؑ' ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔کھاؤ' پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو' اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا''(اعراف:31)

''اے انسانو! ربّ کے غضب سے بچو' حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔جس روز تم اسے دیکھو گے' حال یہ ہوگا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی' ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور انسان تم کو مدہوش نظر آئیں گے' حالانکہ وہ نشے میں نہ ہونگے' بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا ہوگا''(حج:1-2)۔

''بعض انسان ایسے ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرنے لگتے ہیں''(حج:3)۔

''اے انسانو! اگر تمہیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے' پھر نطفے سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقتِ مقررہ تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں' پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو۔اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے باوجود پھر کچھ نہ جانے۔اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے' پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا تو یکایک

وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اسنے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کردیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے۔ اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے' اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ (اس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی' اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں' اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں پڑے ہیں'' (حج:4-5)

''بعض اور انسان ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر' گردن اکڑائے ہوئے' اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں تا کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں'' (حج:8-9)

''اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم سب سے عزّت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے'' (حجرات:13)۔

''کیا نہیں آیا انسان پر ایک لامتناہی زمانہ جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا؟ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لئے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا' خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا'' (دھر:1-3)

''اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اس ربِّ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا ہے جس نے تجھے پیدا کیا' تجھے نِک سُک سے درست کیا۔ تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا؟'' (انفطار:6-8)

''ہم نے انسان کو مشقّت میں پیدا کیا'' (بلد:4)

’’ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا‘‘ (التین :4)

’’جب زمین اپنی پوری شدّت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے‘‘ (زلزال:1-3)

’’زمانے کی قسم‘ انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے‘ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے‘ اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے‘‘ (عصر:1-3)

’’تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا تو بس ایسا ہے جیسے ایک نفس کو (پیدا کرنا اور جلا اٹھانا)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ دیکھنے والا اور سننے والا ہے‘‘ (لقمان:28)

کہنے کو تو یہ چند آیات ہیں لیکن ان میں اسلام کا پورا فلسفہ ہے کہ انسان ہے کیا؟ اس کا اپنے پروردگار اور دوسری مخلوق سے کیا تعلق ہے؟ اسکی ابتداء اور انتہاء کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان آیات سے یہ امر دو اور دو چار کی طرح عیاں کہ قرآنِ مجید کا موضوع ’’انسان‘‘ ہے اور یہ کہ ’’اسلام انسانیت کا دین ہے‘‘۔ پھر صوابدیدی اختیارات (Discritional Powers) ہونے کی وجہ سے دنیا میں آنے والے انسان چونکہ دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں‘ ایک ماننے والے اور دوسرے نہ ماننے والے‘ قرآن ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ زیرِ بحث لاتا ہے۔ یعنی آپ کو اس کتاب میں ماننے والوں (مسلم) اور نہ ماننے والوں (غیر مسلم) کا ذکر علیحدہ علیحدہ ملتا ہے۔ البتہ ہر ہر ذکر سے مترشح یہی ہوتا ہے کہ ’’اسلام انسانیت کا دین ہے‘‘۔ آیئے پہلے دیکھیں کہ قرآن عورت اور مرد کو کس پیرائے یا حیثیت سے لیتا ہے؟

اسلامی معاشرے میں مرد اور عورت کی حیثیت

کوئی بھی گھریلو یونٹ یا گھریلو یونٹوں کے مجموعے سے بننے والا معاشرہ مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ معاشرے کے نظم، سکون اور راحت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ مرد وزن کی باہمی حیثیت فطری یعنی اللہ کی وضع کردہ ہو۔ اسلام یعنی دینِ فطرت میں مرد کے مقابلہ میں عورت کی چار حیثیتیں ہیں۔ بطور انسان' بطور جنس' بطور بیوی اور بطور اولاد۔ بطور انسان' اسلام مرد اور عورت کی حیثیت میں رتی بھر فرق نہیں کرتا۔ دونوں کی حیثیت بالکل یکساں۔ ایسا نہیں کہ عورت کوئی اچھا کام کرے تو ویسا ہی اچھا کام کرنے والے مرد کی بہ نسبت اسے کم اجر و ثواب ہو۔ اسی طرح دونوں میں سے کوئی بھی اگر کسی جرم کا ارتکاب کرے تو اسے یکساں سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ اس لحاظ سے مرد سے بھی بطورِ انسان برتاؤ ہوگا تو عورت سے بھی اسی طرح بطورِ انسان۔ بالفاظِ دیگر بطورِ انسان دونوں ہر لحاظ سے یکساں۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''ان کے رب نے فرمایا'' میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت' تم سب ایک دوسرے میں سے ہو'' (بقرۃ:195)۔

بطور جنس اسی طرح ان کے دائرہ کار اور ذمہ داریوں میں فرق ہے جیسے کہ ان کی فطری جنس میں فرق ہے۔ بطور جنس اسلام نے مرد کو ان کاموں کے لئے مختص کیا ہے جو زیادہ دوڑ دھوپ اور محنت طلب ہیں۔ دونوں کے دائرۂ کار ہی کو اس طرح مختص کیا ہے کہ قدم قدم پر اس کی داد دینا پڑتی ہے۔ گھر کے باہر کے کام' روزی کمانے اور دوسرے مشقت کے کام، زمانے بھر میں دوڑ دھوپ کر کے گھریلو ضروریات کو پورا کرنے کے کام مرد کے سپرد کئے ہیں۔ حمل وزچگی' بچوں کی پرورش و دیکھ بھال، گھر میں مرد کے لئے سہولیات مہیا کرنے کی سعادت عورت کے فرائض قرار دیئے ہیں۔ ایسی بے ترتیبی و بے مروتی نہیں کہ عورت بچہ بھی اٹھائے پھرے اور روزی کمانے کے لئے مرد کے شانہ بشانہ تگ و دو بھی کرے۔ بعینہٖ ایسا بھی نہیں کہ مرد سارا دن بیرونی کاموں میں کھپنے کے بعد رات بھر بچوں کی نگہداشت بھی کرے' کھانا بھی پکائے' کپڑے بھی دھوئے اور گھر کی

صفائی بھی کرے۔ بنا بریں اسلام نے مردوزن کے دائرہ کار کو ایک دوسرے سے علیحدہ (Distinct) واضح اور ایسا کہ جو ہر ایک کی جسمانی ساخت اور فطری میلان کے عین مطابق ہو دوٹوک مختص کیا ہے۔ تجربہ شاہد کہ جن معاشروں نے اس فطری تقسیم میں مداخلت کرتے ہوئے ان کے کام کے ان مخصوص دائرہ ہائے کار کو درہم برہم کیا ہے نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر برباد' سکون تباہ' اولاد گمراہ' والدین یوں جیسے بوجھ ہو گئے۔ ترس گئے کون ومکاں گھریلو چاہت اور سکون کو۔ گھروں میں کتوں اور بلیوں نے ڈیرے آجمائے۔

بطور بیوی اسلام عورت کو مرد کی معاون قرار دیتا ہے اور یہ بھی ایک بہت بڑی انسانی ضرورت ہے۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا انتظامی یونٹ تبھی بسہولت وسلجھاؤ رواں دواں رہ سکتا ہے کہ اس کے دو نہیں صرف ایک سربراہ ہو۔ کسی ادارے یا ڈائریکٹوریٹ کے اگر یکساں اختیارات کے حامل دو ڈائریکٹر ہوں تو ایسا ادارہ نہیں چل سکتا۔ بنابریں اسلام گھریلو یونٹ' جو درحقیقت بہت اہم اور بنیادی یونٹ ہے' میں مرد کو قوّام (سربراہ) تو عورت کو اس کا معاون قرار دیتا ہے۔ قرآن میں آیا:

''مرد عورتوں پر قوّام ہیں' اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو عورتیں صالح ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت ونگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں'' (نساء:43)۔

یعنی شوہر کو بیوی کا نگران ومحافظ بنایا ہے تو ایک تو اس بنا پر کہ دونوں کے اختیارات یکساں نہ ہوں بلکہ ایک کو دوسرے پر فضیلت ہو یعنی ان میں سے مرد سرکردہ ہو تو عورت اس کی معاون اور دوسرے یہ فضیلت وقوّامیت اس لئے کہ خاوند کماتا ہے تو بیوی اس کی کمائی سے استفادہ کرتی ہے۔ اصل میں مرد کی کمائی میں عورت کی اپنی محنت کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ عورت اگر مرد کی معاونت نہ کرے اور گھریلو کام کاج کو نہ سنبھالے تو مرد کماحقہ' اس قابل ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کمائی

کرے۔ یعنی بغرض انسانی ضرورت اگر بیوی کو معاون یا گھریلو یونٹ میں نمبر 2 پر رکھا ہے تو اس کا مداوا (Compensation) اس طور کیا ہے کہ بیوی، اولاد اور بوڑھے والدین کا نان ونفقہ مہیا کرنے کی مشقت مرد پر ڈالی ہے اور عورت کو یہ سہولت باوجود اس کے دی گئی ہے کہ خود وہ وراثت میں بقدر درجہ حصہ دار ہوتی ہے اور بنابریں حاملِ ملکیت ہوتی ہے۔

بطور بچوں کی ماں تو اسلام نے تینوں کے تینوں تمغے ماں کے سپرد کر دیئے۔ محروم رکھا ہے ان سے تو والد کو۔ ظاہر ہے کسی بھی کھیل یا مشق میں عموماً پہلا، دوسرا اور تیسرا انعامات یا تمغات ہوتے ہیں۔ اسلام نے یہ تینوں تمغات والدہ کے سینے پر سجا دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو اس بارے میں نبیٔ رحمت ﷺ کا ارشاد گرامی، فرمایا:

''ایک آدمی نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''تیری ماں''۔ اس نے کہا پھر کون؟ فرمایا ''تیری ماں''۔ اس نے کہا پھر کون؟ فرمایا ''تیری ماں''۔ اس نے کہا پھر کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''پھر تیرا باپ'' پھر درجہ بدرجہ جو تیرے قریبی لوگ ہیں'' (بخاری، مسلم)۔

یعنی اس معاملے میں اسلام ماں کو نمبر 1 پر رکھتا ہے تو والد کو نمبر 2 پر۔

طلاق

ایک اور انسانی ضرورت ازدواجی زندگی میں منسلک ہونے یا شادی کرنے کی ہے تو اس سے بھی اہم بوقتِ ضرورت شادی کے بندھن کو توڑنے یعنی طلاق کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی بہت اہم لیکن اس سے بھی اہم تر ہے بوقتِ ضرورت طلاق۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی گاڑی کی اصل خصوصیت اس کا چلنا ہے۔ لیکن کسی بھی گاڑی کا چلنا خود موت کا بندوبست کرنا ہے اگر اس میں بوقتِ ضرورت رکنے کی خصلت نہ ہو۔ میاں بیوی انسان ہیں اور بعض اوقات ان کے مابین حالات اسقدر کشیدہ ہو جاتے ہیں کہ دونوں کو بطور میاں بیوی رہنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا

ہے۔ایسے میں دو راستے ہو سکتے ہیں۔ایک تو یہ کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر کسی دوسری جگہ پر رشتۂ ازواج میں منسلک ہو جائیں یعنی چاہیں تو کوئی اور گھر بسا لیں۔دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں طلاق کی سہولت یا طلاق کے بعد کسی دوسری جگہ شادی کرنے کی اجازت نہ ہو' جیسے کہ آج کی دنیا میں کئی معاشروں میں ایسا ہے۔آخری صورت میں تو خودکشی تک بھی نوبت پہنچ سکتی ہے۔''ستی'' کی رسم اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔اسلام نے انسان کی اس ضرورت کو بطریقۂ احسن پورا کیا ہے یعنی بوقتِ ضرورت طلاق کی بھی اجازت دی ہے تو طلاق کے بعد مرد و زن ہر ایک کو کسی دوسری جگہ رشتۂ ازواج میں منسلک ہونے کی بھی۔بایں ہمہ اللہ تعالیٰ کو جائز کاموں میں سب سے زیادہ کوئی کام ناپسند ہے تو ''طلاق''۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ایک انسانی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے طلاق کی اجازت تو دی ہے لیکن آخری چارۂ کار کے طور پر۔اسلام طلاق کی نوبت تک پہنچنے کے لئے متعدد مصالحتی اقدامات کی سفارش کرتا ہے۔مطلب یہ کہ کس طرح میاں بیوی کے علیحدہ ہونے کا مرحلہ ٹل جائے۔ذیل میں ہم ایسے چند اقدامات کا ذکر کرتے ہیں:

☆ سب سے پہلے شوہر کو خطاب کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاکید کی گئی کہ بیوی کی خصلت میں کوئی کمی ہو تو اس کا حل یہ ہرگز نہیں کہ فوراً علیحدگی اختیار کر لی جائے۔وقت گزرنے کے ساتھ ہو سکتا ہے کمی دور ہو جائے یا اس کمی کے ہوتے ہوئے اس کو اللہ تعالیٰ نے دوسری ایسی خوبیاں دے رکھی ہوں کہ اس ایک کمی کا احساس ہی نہ رہے۔چنانچہ قرآن میں آیا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہیں ان بیویوں کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت بھلائی رکھ دی ہو'' (نساء:19)۔

☆ بیوی کو بھی صلح جوئی اور مصالحت کی طرف راغب کیا' فرمایا:

''جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں۔صلح بہر حال بہتر ہے۔نفس تنگ

دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو اللہ تمہارے اس عمل سے بے خبر نہ ہوگا''۔(نساء:128)۔

☆ اکٹھے رہتے ہوئے چھوٹی موٹی تو شکایات پیدا ہوتی رہتی ہیں لہٰذا میاں بیوی دونوں کو تلقین کی کہ وہ باہم فیاضانہ برتاؤ کا رویہ اپنائیں۔فرمایا:

''آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے''۔ (بقرہ:237)۔

☆ رنجش و ناراضگی کی صورت میں اگر بات گھر سے باہر نکل جائے تو اسلام پھر بھی زوجین کو دھیرے دھیرے قریب لانے کی کوشش کرتا اور طلاق کی نوبت کو حتی الوسع ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔ایسے میں وہ ثالثی طریقے کی تلقین کرتا ہے۔چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

''اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو' وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا۔اللہ سب کچھ جانتا اور باخبر ہے'' (نساء:35)۔

مطلب یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک فرد مصالحت کے لئے مقرر کیا جائے۔وہ دونوں معاملے کی تحقیق کریں کہ خرابی کہاں ہے؟ پھر اس خرابی کو حتی المقدور رفع کرنے کی کوشش کریں تا کہ نزاع سے انقطاع کی صورت پیدا نہ ہو۔

ان تمام احتیاطی و مصالحتی اقدامات کے باوجود اگر طلاق کی نوبت آ ہی جائے تو اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ مرد طلاق ایامِ ماہواری میں نہیں' ایامِ طہر میں دے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی۔حضرت عمرؓ نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا۔آپ ﷺ اس واقعہ پر بہت ناخوش ہوئے

اور فرمایا: عبداللہ اپنی بیوی کو واپس کرے اور اس کو چاہیئے کہ وہ اس کو اپنے پاس رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے۔ اس کے بعد طلاق دینا ضروری ہو تو پاک ہونے کی حالت میں اس کو طلاق دے دے اور اس عرصہ میں اس کو ہاتھ نہ لگائے''۔ (مشکوٰۃ)

ایسا اس لئے کیا کہ ایامِ طہر میں میاں بیوی میں رضامندی کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ مصلحت اس میں یہی ہے کہ کس طرح وقوع طلاق ٹل جائے۔ طلاق دینے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ خود اس مصلحت کو چھپائے ہوئے ہے کہ کسی طرح جدا ہونے والے میاں بیوی سمجھوتہ کر کے پھر جڑ جائیں۔ چنانچہ مجموعی طلاق خود تین طلاقوں پر مشتمل ہے۔ اور ان تین طلاقوں میں وقفہ سالہا سال کا بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک صحابی رکانہ نے اپنی بیوی کو عہدِ رسالت میں طلاق دی لیکن جلد ہی رجوع کر لیا۔ پھر عمرؓ کے عہدِ خلافت میں دوسری دفع طلاق دی اور قریب میں ہی رجوع کر لیا۔ تیسری طلاق انہوں نے حضرت عثمانؓ کے دور میں دی (مشکوٰۃ)۔ مطلب یہی کہ طلاق کا کڑوا گھونٹ نہ ہی پیا جائے تو بہتر۔ اس لئے کہ اصل ضرورت تو گھر کو بسانا ہے نہ کہ ویران کرنا۔

یاد رہے تیسری دفع طلاق دینے سے باہم رجوع کرنے کی سہولت ختم ہو جاتی ہے جب تک کہ عورت کسی دوسری جگہ شادی نہ کرے اور دوسری جگہ سے کسی وجہ سے اسے طلاق مل جائے۔ ایسا اس لئے کیا گیا کہ طلاق کہیں محض اذیت کا ذریعہ نہ بن جائے جیسے کہ دورِ جہالت میں ایسا ہی تھا۔ پھر اسلام یہی نہیں کرتا کہ سخت گرفت کرتا ہے اگر طلاق کو ضرر رسانی کا ذریعہ بنایا جائے بلکہ وہ لازم قرار دیتا ہے کہ مطلقہ عورت کی کہیں اپنی مرضی سے شادی کرنے میں رکاوٹ نہ بنا جائے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا وہ درحقیقت آپ اپنے پر ہی ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ''۔ (بقرہ: 231)۔

قربان جائیں اسلام کی انسانیت پروری پر وہ تو جدا ہونے والی سابقہ بیوی سے حسنِ

سلوک کی تاکید کرتا ہے۔قرآن میں آیا:

''جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو انہیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے یہ حق ہے متقی لوگوں پر'' (بقرہ: 241)۔

ایک اور جگہ پر حسنِ سلوک کی تلقین کی۔فرمایا: ''اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے (جدا ہونے والی بیوی) ڈھیر سارا مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اسے کس طرح لے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہے'' (نساء: 20-21)۔

یتیموں کی فلاح و بہبود کا فکر

یہ انسانی سانحہ ہے کہ جدا ہونے والے مرد کو بھی کوئی اور عورت مل جاتی ہے اور جدا ہونے والی عورت کو بھی کوئی اور مرد مل جاتا ہے اصل خسارہ ہوتا ہے یا مشکل میں پڑتے ہیں تو بچے جو حقیقی والدین کے سایہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔اسلام نے جیسے کہ انسانی تقاضا ہے اس مسئلے کو بھی نہ صرف اپنا موضوع بنایا ہے بلکہ اس کو حل کرنے کی مقدور بھر کوشش بھی کی ہے۔

احترامِ انسانیت کی یہ انتہا ہے کہ یتیم بچے خواہ طلاق کی صورت میں وجود پذیر ہوں یا والد کی وفات کی صورت میں، اسلام ان کی بہبود و بقا کی فکر اُس وقت سے کرتا ہے جب ابھی وہ رحمِ مادر میں ہوں۔اسلام نے اس مقصد کے لئے ایک خاص نظام وضع کیا ہے جسے وہ عدت کا نام دیتا ہے۔عدت اس پیریڈ کا نام ہے جو طلاق یافتہ عورت یا بیوہ عورت کو دوسری شادی کرنے سے پہلے شادی کے انتظار میں اس لئے گزارنا ہوتا ہے کہ صراحت سے واضح ہو سکے کہ عورت کیا حاملہ تو نہیں؟ حاملہ ہونے کی صورت میں تو اسے تا وضع حمل و بحالیٔ صحت دوسری شادی کرنے کی اس لئے اجازت نہیں ہے کہ بچے کی ولدیت اور حق وراثت متاثر نہ ہوں۔دوسری شادی تو درکنار دورانِ عدت عورت کو مزید نسبت طے کرنے یا دوٹوک دوسرے مرد سے منگنی کرنے کی اجازت نہیں یعنی

اسلام یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ جب بچہ پیٹ میں ہو تو عورت کی رگوں میں دو محبتوں یعنی سابقہ شوہر اور ہونے والے شوہر کی محبت بھرا خون گردش کرے۔ اس لئے کہ اس سے ہونے والے بچے کے اوصاف پر فرق پڑتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کی حق تلفی ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

''زمانہ عدت میں خواہ تم ان عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایئے میں ظاہر کر دو خواہ دل میں چھپائے رکھو' دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تو تمہارے دلوں میں آئے گا ہی' مگر دیکھو! خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو اور عقدِ نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو' جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہٰذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بردبار ہے چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگزر فرماتا ہے''۔ (بقرہ:235)۔

یہ تو ہوئی یتیم کے حقوق کی اس وقت کی بات جب وہ ابھی رحمِ مادر میں ہے لیکن اسلام جیسے کہ انسانی مطالبہ ہے یتیموں کی پرورش، دیکھ بھال اور مفادات کی لواحقین و متعلقین کو بڑی تاکید۔ بعض اوقات تو جذباتی انداز میں تاکید کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم چند آیات و احادیث کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلے ان بچوں کی رضاعت کا مسئلہ حل ہونا چاہئے جن کے والدین علیحدہ ہو چکے ہوں۔ اسلام اس انسانی ضرورت کو بطریق احسن پورا کرتا ہے۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدتِ رضاعت تک دودھ پیئے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہئے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے اور نہ ہی باپ کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسے بچے کے باپ پر ہے ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ

نہیں۔ اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو معاوضہ طے کرو وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے"۔ (بقرہ:233)۔

پھر اسلام یتیم بچوں کی عمومی فلاح کا ذکر کرتا ہے' فرمایا:

"اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد کو پہنچ جائے"۔ (انعام:152)۔

"یتیموں کے مال ان کو واپس دو۔ اچھے مال کو بُرے سے نہ بدل لو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے" (نساء:2)۔

"اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حدِ انصاف سے تجاوز کر کے اس خوف سے ان کے مال جلدی جلدی ہڑپ کر جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا سرپرست جو مالدار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقے سے معاوضہ کھائے۔ پھر جب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنا لو (یاد رکھو) حساب لینے کے لئے اللہ کافی ہے"۔ (نساء:6)۔

"اور تقسیم وراثت کے موقع پر کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔ لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت ان کو اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہئیے کہ وہ اللہ کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے" (نساء:10-8)۔

"اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو اور جو بھلائی تم

کروگے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی‘‘۔(نساء:127)۔

ان آیات واحادیث سے اندازہ لگائیں اسلام کی انسانیت پروری کا کہ اسے ان بچوں کی فلاح و بہبود کا کس قدر فکر ہے جو کسی طور والدین‘ والد یا والدہ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوجائیں۔اس کے مقابلہ میں آج ہمارے سامنے ان معاشروں کی بے رُخی، بیکسی اور بدقسمتی کا حال دیکھیں جو جیتے جی اور ہنستے بستے اپنی اولاد کو ایک بوجھ سمجھتے ہوئے چلتا کرتے ہیں۔حالانکہ ان کی یہ بھول اوران کا یہ غیر فطری عمل بالانجام ان کے اوران کی اولاد کے لئے تباہ کن ہوتا ہے۔ کتنے معاشرے‘ کتنی بستیاں اور کتنے گھر آج اس لئے ویران پڑے ہیں کہ اولاد کوان کے والدین نے حیلے بہانے اپنانے سے انکار کررکھا ہے۔

یہ تو ہوئی صرف یتیموں کی بات لیکن کسی بھی معاشرے میں مالی طور پر کمزور رشتے دار، مالی طور پر کمزور عوام‘ قیدی‘ مسافر‘ ہمسایہ وغیرہ جیسے پسماندہ و درماندہ طبقات ہوتے ہیں۔انسانی ضرورت ہے کہ ایسے تمام طبقات کی فلاح و بہبود کا بھی فکر کیا جائے۔اسلام بطور انسانیت کا دین ان تمام طبقات کے دکھوں کا کما حقہٗ مداوا کرتا ہے۔

پوری انسانی تاریخ پر اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین چونکہ اسلام ہی تھا اور ہے۔یہود و نصاریٰ وغیرہ نے انحراف کرتے ہوئے اس کو مختلف نام دے دیئے۔قرآن بتاتا ہے کہ خود یہود کو ان طبقات کی فلاح وصلاح کی تاکید کی گئی۔قرآن میں آیا:

’’یاد کرو‘ اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا‘ ماں باپ کے ساتھ‘ رشتے داروں کے ساتھ‘ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا‘ لوگوں سے بھلی بات کہنا‘ نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اوراب تک پھرے ہوئے ہو‘‘۔(بقرہ:83)۔

’’رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ’’میں اور یتیم کا سرپرست‘ یتیم چاہے اس کا رشتہ دار ہو یا اجنبی‘ جنت میں اس طرح ہونگے۔آپ ﷺ نے اپنی دوانگلیاں ملا کر بتایا‘‘۔(مسلم۔موطا امام

مالک)۔

''نبی ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں کے گھروں میں سے بہترین گھر وہ ہے جس میں یتیم ہواور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہو۔اور مسلمانوں کے گھروں میں سے بُرا گھر وہ ہے جس میں یتیم ہواور اس کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو'' ۔(ابنِ ماجہ۔مسندِ احمد)۔

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جو شخص تین یتیموں کی معاشی کفالت کرتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو رات کو قیام کرتا ہے اور دن میں روزے رکھتا ہے اور صبح وشام اللہ کی راہ میں تلوار سونتے رکھتا ہے۔میں اور وہ جنت میں دو انگلیوں کی طرح اکٹھے ہونگے'' ۔(ابن ماجہ)

''ایک آدمی نے نبی ﷺ سے شکایت کی کہ میرا دل سخت ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا ''یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر اور مسکین کو کھانا کھلا'' ۔(مشکٰوۃ)

یتیموں کے علاوہ دوسرے محتاجوں کی فلاح و بہبود

جیسے کہ انسانی ضرورت ہے' اسلام صرف یتیموں کی دیکھ بھال کا ذکر ہی نہیں کرتا اسے ہر اس فرد اور طبقے کی بقا ونشو ونما کی فکر ہے جو کسی طور کمزور ونادار اور اس قابل نہ رہے کہ سلسلۂ جسم و جاں اپنی کمائی سے کما حقہٗ قائم رکھ سکے۔ چنانچہ اسے بوڑھے والدین کا بھی فکر ہے' غربت زدہ رشتے داروں کا بھی' قیدیوں کا بھی' مسافروں کا بھی' غرضیکہ ہر اہلِ حاجت کا۔قرآن وسنت میں سے چند احکامات وہدایات کا ذکر ذیل میں کرتے ہیں:

''یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لئے جن کی تالیفِ قلوب مطلوب ہو۔نیز یہ گردنوں کو چھڑانے' قرضداروں کی مدد کرنے' اللہ کی راہ میں لگانے اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا وبینا ہے'' (توبہ: 60)۔

''یہ کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں تھوڑا یا بہت کوئی خرچ وہ اٹھائیں اور (سعی و جہاد

میں) کوئی وادی پار کریں اوران کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے‘‘ (توبہ: 121)۔

’’تم نیکی کونہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی وہ چیزیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہواور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا‘‘ (آل عمران: 92)۔

’’نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اوراس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اوراللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں، یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی متقی ہیں‘‘ (بقرہ: 177)۔

’’لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے‘‘ (بقرہ: 215)۔

’’جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے' نہ دکھ دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں‘‘ (بقرہ: 261-262)۔

’’(خاص طور پر مدد کے مستحق وہ لوگ ہیں) جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنے ذاتی کسبِ معاش کے لئے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت

پہچان سکتے ہو۔مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔ان کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا'' (بقرہ:273)۔

''دردناک سزا کی خوشخبری دوان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا'لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو' (توبہ:35-34)۔

یہ چند چیدہ چیدہ آیات اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ اندازہ لگائیں اسلام کے انسانیت کے دین ہونے کا کہ ایک طرف وہ چن چن کر ان محتاجوں کی نشاندہی کرتا ہے جو کسی نہ کسی طور مالی مدد کے مستحق قرار پاتے ہیں تو دوسری طرف دولتمندوں کے لئے واجب قرار دیتا ہے کہ وہ ان مستحقین کی مدد کریں۔بالفاظِ دیگر اسلام دولتمندوں کی دولت میں غرباء و مساکین وغیرہ کا حصہ اسی طرح فرض کرتا ہے جس طرح کہ وراثت میں حصہ داروں کا۔چنانچہ قرآن مجید میں دوٹوک آیا ہے،فرمایا:

''انسان تھڑ دِلا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں، جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے، جو روز جزا کو برحق مانتے ہیں'' (معارج:19:26)۔

یہاں پر ایک اور انسانی ضرورت سامنے آتی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ مدد کئے جانے والے کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔اسلام کا طریقِ کار یہ ہے کہ صدقات وزکوٰۃ دینے والے براہِ راست اپنی رقوم محتاجوں کو نہ دیں بلکہ وہ یہ رقوم بیت المال میں جمع کرائیں جس کی شاخوں کا پوری اسلامی دنیا میں جال بچھا ہو۔یہ خلافتِ وقت کا کام ہے کہ وہ بیت المال سے وظائف کی شکل میں مقررہ تاریخ کو مستحقین تک مختص رقوم پہنچائے۔یہ بھی کہ کھانا وغیرہ کی شکل میں اگر کوئی دولتمند

کسی حاجت مند کی ضرورت کو براہِ راست پورا کرتا ہے تو تاکید کردی کہ وہ احسان جتانے اور بیگار لینے جیسی حرکات سے باز رہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں آیا:

''اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملادو جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے، نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ آخرت پر'' (بقرہ:264)۔

یہ احسان کا جتانا اور اذیت دینا ہی گوارا نہ کیا، ایک میٹھا بول اور ذرا سی چشم پوشی کو خیرات سے زیادہ احسن قرار دیا۔ فرمایا:

''ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی خاموشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے'' (بقرہ:263)۔

اسلام ''ایک پنتھ دو کاج'' کے مصداق صدقہ کو بطور کفارہ استعمال کرنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ گناہوں کا بھی قلع قمع ہو اور غریب کی مدد بھی ہو۔ چنانچہ ارشادِ ربِ کائنات ہے:

''تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ۔ پھر جو کوئی قصاص کا صدقہ کردے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں'' (مائدہ:45)۔

قسم توڑنے تک کا مداوا انفاق فی سبیل اللہ قرار دیا۔ فرمایا:

''تم لوگ جو مہمل قسمیں کھاتے ہو ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو ان پر ضرور تم سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو یا انہیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے'' (مائدہ:89)۔

انسان کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ بوقتِ ضرورت اسے قرض حاصل ہو لیکن وہ قرض

جس میں سود کا عمل دخل ہو انسان کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے سود کو دوٹوک حرام قرار دیا۔ فرمایا:

''جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا غم نہیں مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ''تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے'' حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لئے وہ سود خوری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے، وہ جہنمی ہے' جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ (بقرہ: 275)۔

سود کی بجائے اللہ قرض کے لئے ایک احسن اصطلاح ہی ایجاد نہیں کرتا بلکہ اسے ''قرض حسنہ'' قرار دے کر یہ بھی قرار دیتا ہے کہ قرض دینے والا اللہ کو قرضِ حسنہ دیتا ہے جسے اللہ کئی گنا بڑھا کر واپس کرتا ہے۔ فرمایا:

''تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے؟ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی اور اسی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے'' (بقرہ: 245)۔

غرباء و مساکین وغیرہ کی مالی اعانت کے لئے نبی کائنات ﷺ کی بھی بہت سی احادیث مبارکہ ہیں۔ ہم طوالت سے بچنے کی خاطر ان احادیث میں سے صرف ایک حدیث کا تذکرہ یہاں پر کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے'' (بخاری و مسلم)۔

انسان کی دیگر ضروریات

انسان اللہ تعالیٰ کی فیکٹری کا پروڈکٹ ہے۔ وہ ہی اصل جانتا ہے کہ ضروریات کونسی ہیں اوران کو پورا کیسے کرنا ہے۔ ہم چند ایسی ضروریات اوران کے پورا کیئے جانے کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

دھاندلی سے مال ہڑپ کرنے کی ممانعت

دھاندلی اور ہیرا پھیری سے خواہ مال حاصل کیا جائے' الیکشن جیتا جائے یا کوئی عہدہ وغیرہ حاصل کیا جائے کوئی معاشرہ اس کی اجازت نہیں دیتا اور اگر دیتا ہے تو وہ معاشرہ ایسا بیج بوتا ہے کہ جو سویر یا بدیر اس کی تباہی پر منتج ہوتا ہے۔ ہر انسان خواہ وہ عربی ہو یا عجمی' کالا ہو یا گورا' عورت ہو یا مرد' بیوی ہو یا خاوند' شاہ ہو یا گدا' آجر ہو یا اجیر کبھی یہ سوچ نہیں سکتا کہ اس کا انجام بالآخر برا ہو۔ اسلام واضح اور دوٹوک ہدایات دیتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

''اورتم لوگ نہ تو ایک دوسرے کے مال ناروا طریقہ سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لئے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے'' (بقرہ:188)۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ' دیکھو اپنے آپ کو خود قتل نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے'' (نساء:29)۔

ان آیاتِ مبارکہ میں ایک بھیانک معاشرتی روگ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص اگر اپنی چرب بیانی سے یا جھوٹی گواہیاں بھگتا کر کوئی ایسی چیز حاصل کر لیتا ہے جو حقیقتاً اس کی نہیں تو وہ کئی معاشرتی بے ربطگیوں' بے اعتدالیوں اور دھاندلیوں کی نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے۔ پہلے یہ کہ وہ ایسا مال حاصل کرتا ہے جو اصل میں اس کا نہیں۔ پھر اس سہل طریقے سے حاصل کردہ مال کو اللے تللے اڑاتا ہے جو خود بڑی بے اعتدالی ہے۔ پھر جس شخص کا مال وہ ناحق کھاتا

ہے ظاہر ہے وہ متنفر رہتا ہے اور کسی نہ کسی طور اس کا بدلہ لینے کے در پے ہوتا ہے۔ جتنے کسی معاشرے میں ایسے کیس ہونگے اتنی ہی اس معاشرے میں کشیدگی، رسہ کشی اور جذبۂ انتقام کا دور دورہ ہوگا۔ سب سے بڑا خسارہ یہ کہ جب دھاندلی سے ہڑپ کرنے والا شخص اپنے رب کے پیش ہوگا تو ایک غاصب کی حیثیت سے یعنی سزاوارِ سزا۔

کس قدر احسان اسلام کا اور کس قدر اس کی انسان پروری کہ اس نے پہلے ہی قدم پر دھاندلی سے مال ہڑپ کرنے کی ممانعت کر دی۔ بلکہ اس نے ایک قدم آگے اٹھایا، جب یہ فرمایا کہ "جو کچھ اپنے لئے پسند کرو وہی دوسرے کے لئے پسند کرو"۔ کوئی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ دھاندلی ہو، کیسے وہ دھاندلی کرے گا کسی دوسرے سے؟

احسان کا طریقہ اختیار کرو

قرآن مجید میں آیا:

"احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے" (بقرہ:195)۔

یہ احسان کیا ہوتا ہے؟ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ فرض کریں ایک شخص نے دوسرے شخص سے ایک کلو دودھ مانگا۔ دودھ کے مالک نے مانگنے والے کو ایک کلو دودھ بھی دیا اور ایک پاؤ اپنی طرف سے زائد دے دیا۔ اب یہ زائد کا دینا ایک بات تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ دینے والے نے وہ کلو دودھ بھی بخوشی دیا، کسی جبر سے نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس نے مانگنے والے کے اس عمل کو بُرا نہیں جانا بلکہ اس کی قدر کی۔ یہی احسان ہے۔ اسے ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ ایک تو ہے کہ کسی کام کا کرنا۔ ایسا کرنا محض کرنا بھی ہو سکتا ہے اور چار و نا چار کرنا بھی۔ لیکن جب کرنے والا اس کام کو پوری دلچسپی، لگن اور خوبی سے کرے تو یہی احسان ہے۔

لیکن یہاں پر اللہ تعالیٰ یعنی انسان کی سرشت کو کما حقہ سمجھنے والے نے متنبہ بھی فرمایا کہ احسان کرنے والا اس حد تک آگے نہ جائے کہ وہ مالی طور پر خود کنگال اور جسمانی طور پر اپنی صحت گنوا دے۔ چنانچہ مذکورہ آیت ہی کے پہلے حصے میں فرمایا:

”اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو“

آیہ مبارکہ کے اس حصے کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ دین کی سربلندی کی جدوجہد میں اگر تم خرچ نہ کرو گے تو یہ دنیا و آخرت دونوں میں بڑے خسارے کا سودا ہے۔ یعنی اس دنیا میں مغلوبیت اور آخرت میں مقدر ہوگا تو شدید ترین عذاب۔

اسلام کا کس قدر احسان اور اس کی کس قدر انسان پروری کہ وہ دھاندلی والے معاشرے کی نفی کرتا ہے تو دوسری طرف ایسے معاشرے کو وجود میں لانے کا داعی ہے کہ جو ”احسان“ پر مبنی ہو۔ یاد رہے اسلام تو مخالفین تک سے احسان کرنے اور انہیں معاف کرنے کا درس دیتا ہے۔ فرمایا:

”ان (مخالفین) کو معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو، اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش اختیار کرتے ہیں“ (مائدہ:13)۔

حق تلفی کی ممانعت

اسلام کی انسانیت پروری کا اندازہ اس سے لگائیں کہ آپ کو حقوق کی اس قسم کی تقسیم کہ (۱) حقوق اللہ (۲) حقوق العباد اور (۳) حقوق النفس بدوں اسلام دنیا بھر کے لٹریچر میں کہیں نہیں ملے گی۔ یہ بھی اسلام ہی کا اعزاز ہے کہ حق تلفی خواہ اللہ کی ہو، بندوں کی ہو یا خود کسی انسان کی اپنے آپ سے‘ اسلام اسے ظلم قرار دیتا ہے۔ حق تلفی کا مطلب ہی یہ ہے کہ جس کا حق ہو اسے تو ادا نہ کیا جائے اور اس کی بجائے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا حق کسی اور کی طرف لوٹا دیا جائے اور ظاہر ہے ایسا کرنا ظلم ہی تو ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

1۔ حقوق اللہ

اسلام نے‘ جیسے کہ ہونا چاہئے‘ حقوق اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق کو سرِ فہرست رکھا ہے۔ بندوں کی طرف سے حقوق اللہ ادا کرنے کا مطلب ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی ذات و

صفات کو کما حقہ اسی طرح تسلیم کریں جیسے کہ وحی پر مبنی تعلیمات و ہدایات نے اس ہستی کا پتہ دیا ہے۔قرآنِ مجید کی متعدد آیات ایسی ہیں کہ جو کلیۃً اس کی ذات وصفات کا ہی پتہ دیتی ہیں۔ پھر کتاب اللہ کی بیشتر آیات اس کی صفات پر اختتام پذیر ہوتی ہیں۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے ہم یہاں پر صرف تین مقامات سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔آیت الکرسی میں فرمایا:

''اللہ' وہ زندہ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور اُن کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔پس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے''(بقرہ:255)۔

سورہ اخلاص میں آیا:

''کہو! وہ اللہ ہے یکتا۔اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے''۔

سورہ حشر کی آخری تین آیات میں اس کی صفات کا ایک خوبصورت اور بھرپور گلدستہ آیا۔فرمایا:

''وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب اور حاضر ہر چیز کا جاننے والا، وہی رحمٰن اور رحیم ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس، سراسر سلامتی، امن دینے والا، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا، پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔اس کے لئے بہترین نام

ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ ہی زبردست اور حکیم ہے"۔

جو انسان اللہ کی ان ذات وصفات میں سے کسی ایک صفت کا سہواً حق ادا نہ کرے وہ گناہگار ہے اور جو کوئی عمداً ان کا انکار کرے وہ کافر ہے اور جو کوئی ان صفات میں اللہ کی ذات کے سوا کسی اور چیز کو شامل کرے، وہ مشرک ہے۔ یاد رہے وقت کے اس موڑ پر دنیا میں مشرکین کی تعداد سب سے زیادہ ہے نہ ماننے والوں یعنی کافروں کی اس سے کم اور ماننے والوں یعنی ایمان لانے والوں کی سب سے کم۔

2۔حقوق العباد

حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ حقوق العباد یعنی بندوں پر بندوں کے حقوق کی باری آتی ہے۔ والدین کے اولاد پر حقوق ہیں تو اولاد کے والدین پر، بیوی کے شوہر پر حقوق ہیں تو شوہر کے بیوی پر، امیر کے مامور پر حقوق ہیں تو مامور کے امیر پر۔ آجر کے اجیر پر حقوق ہیں تو اجیر کے آجر پر۔ استاد کے شاگرد پر حقوق ہیں تو شاگرد کے استاد پر۔ اسی طرح، جیسے کہ ہم اوپر ذکر کر آئے، یتیم، مسکین، بیوہ، مسافر یا قیدی وغیرہ سب کے حقوق ہیں۔ سخت گناہگار ہے وہ جو ان حقوق کی ادائیگی نہ کر پائے یا کوتاہی وغفلت کا شکار ہو جائے۔

زمانۂ قدیم سے لوگ بیٹیوں کو ایک بوجھ سمجھتے رہے ہیں ہم یہاں پر نمونے کے طور پر صرف ان احادیث کا ذکر کرتے ہیں جو رسول ﷺ نے بیٹیوں کی فلاح و بہبود کے لئے بیان فرمائی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جس شخص کے ہاں بیٹی ہو، وہ اسے زندہ درگور نہ کرے اور اسے ذلیل نہ کرے اور اپنے بیٹے کو اس پر ترجیح نہ دے، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریگا" (ابوداؤد)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جس نے تین بیٹیوں کو پرورش کیا اور ان سے حسنِ سلوک کیا وہ جنت میں جائے گا" (ابوداؤد)۔

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ تین سے کم وبیش بیٹیوں والوں کے لئے یہ بشارت نہیں بلکہ مطلب محض بیٹیوں کا ہے خواہ ان کی تعداد کوئی ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک اور موقع پر فرمایا:

''جس نے دو لڑکیوں کی کفالت کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں، قیامت کے دن میں اور وہ اس طرح آئیں گے۔ یہ فرما کر آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں اکٹھی کر لیں'' (مسلم)۔

حضرت سراقہ بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ صدقہ کا بہترین مستحق کون ہے؟ وہ تمہاری بیٹی ہے جو (مطلقہ یا بیوہ ہونے کے بعد) گھر میں واپس آجاتی ہے'' (مشکوٰۃ' کتاب الآداب)۔

اسی طرح کی احادیث رشتے داروں اور دوسرے انسانوں کی خیر خواہی کے لئے ہیں۔ اسلام تو راستے میں پڑے پتھر کو ہٹانے والے کو صدقہ کی بشارت دیتا ہے۔ خدمتِ خلق کا وسیع دائرہ کار زیادہ تر حقوق العباد کے متعلق ہے۔

3۔ حقوق النفس

انسان کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ خود اپنے حقوق کی فکر کرے۔ اس کے جسم کا ہر عضو، اس کے وقت کا ایک ایک لمحہ' اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اس کے پاس بطور امانت ہیں۔ وہ انہیں سب سے پہلے اپنی، پھر اپنے اعزہ واقارب، پھر اپنے معاشرے اور بالآخر پوری انسانیت کی فلاح و بہبود میں لگانے یا انویسٹ کرنے کا پابند ہے۔ جس قدر وہ اس سے انحراف کرے گا اسی قدر وہ خیانت کا مرتکب ہوگا۔ ایک مسلمان تو جنت کے عوض اپنا جان و مال فروخت کر چکا ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کہ جان و مال ہوتا تو اس ہی کے پاس ہے لیکن بطور ملکیت نہیں بطور امانت۔ قرآن مجید میں آیا:

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں'' (توبہ: 111)۔

ایسے میں جب ایک مسلمان خیانت کا مرتکب ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے، کسی دوسرے پر بعد میں۔ چنانچہ یہ بھی فرمایا گیا:

''اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ خود اپنے اوپر ظلم کرے گا'' (طلاق:1)۔

پھر یہ تصورِ امانت ایک انسان کے لئے اپنی ذات کے متعلق بھی ہے تو اجتماعی نظام کے متعلق بھی۔ ایک انسان اپنے اعضاء کو امانتاً استعمال کرتے ہوئے وہی کام کرتا ہے جس کے لئے اسے یہ عطا کئے گئے ہیں تو درست بصورتِ دیگر خیانت ہے اور قابل گرفت۔ خودکشی اسی لئے حرام ہے کہ یہ اپنے نفس پر ظلم ہے۔ قرآنِ مجید یہ واضح تصور پیش کرتا ہے کہ جب بھی کوئی فرد بھلائی کا کام کرتا ہے تو اس بھلائی کا فائدہ خواہ کسی دوسرے کو پہنچے یا نہ پہنچے، اس کی اپنی ذات کو ضرور پہنچتا ہے اور اسی طرح کوئی برائی کرے تو اس برائی کا نقصان کسی دوسرے کو پہنچے یا نہ پہنچے، خود اس کو ضرور پہنچتا ہے۔ فرمایا گیا:

''جو کوئی راہِ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ (قیامت کو) کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا'' (بنی اسرائیل:15)۔

پھر قرآن یہ بھی پتہ دیتا ہے کہ جو کوئی صرف اپنی اس دنیا کو ہی بنانے میں لگا رہے تو اسے اس کا معاوضہ اِس دنیا میں ادا کر دیا جاتا ہے اور آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں۔ اور جس کی دوڑ دھوپ اپنی آخرت سنوارنے کے لئے ہو تو ایسا شخص بشرطیکہ وہ مومن ہو آخرت میں انعامات پائے گا۔ فرمایا:

''جو کوئی جلد (سامنے کی دنیا) کا خواہشمند ہو، اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی دینا چاہیں پھر اس کے حصے میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر اور جو آخرت کا خواہشمند ہو اور اس کے لئے سعی کرے جیسی کہ اس کے لئے سعی کرنی چاہئے اور

وہ مومن ہوتو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی‘‘ (بنی اسرائیل:18-19)۔

انسان کی خیر خواہی و بھلائی اسی میں ہے کہ نہ تو بخل کا شکار ہو اور نہ اللہ کی راہ میں بھی اتنا خرچ کر دے کہ خود کنگال ہو جائے۔ یعنی اخراجات کرتے وقت اسے اپنی ذات کو نہ بھول جانا چاہئے۔ اپنے نفس کی حفاظت اس کا فرض ہے۔ قرآن کریم نے اسے استعارے کی زبان میں یوں بیان کیا ہے:

’’نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو (بخل کرو) اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو (استطاعت سے زیادہ خرچ کرو) کہ خود ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ‘‘ (بنی اسرائیل:29)۔

عبادت کتنا محبوب عمل ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس میں بھی اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تاکید کی ہے۔ مطلب یہ کہ ایک عابد خود پر اتنا بوجھ نہ لادے کہ اس کی ذات کا نقصان ہو۔ ملاحظہ ہو نبی کائنات ﷺ کا اس بارے میں ارشاد:

’’حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ’’اے عبداللہ! مجھ کو خبر دی گئی ہے کہ تو دن کو روزہ رکھتا اور رات کو (مسلسل) عبادت کرتا ہے‘‘ میں نے عرض کیا ’’ہاں یارسول اللہ ﷺ‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا ’’ایسا نہ کرو۔ روزہ بھی رکھ اور روزہ ترک بھی کر۔ رات کو عبادت بھی کر اور سو بھی۔ اس لئے کہ تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے‘‘ (بخاری و مسلم)۔

بنیادی حقوق

خالقِ کائنات نے اپنی مکرم مخلوق یعنی انسان کو معاشرت پسند بنایا ہے۔ معاشرے کے بغیر وہ اپنی ہستی تک سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ماں کے پیٹ کے اندر ہونے سے لیکر اس دنیا میں آخری سانس تک اسے بے شمار افراد کی خدمات کی محتاجی ہوتی ہے۔ وہ اپنی پرورش اور زیست کے دوسرے لوازم بشمل خوراک، لباس، رہائش، تعلیم، علاج وغیرہ کے لئے ہی نہیں اپنی

صلاحیتوں اورتوانائیوں کی نشوو ارتقاء کے لئے وہ لازماً اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اعزہ و اقارب کی ایک خاصی بڑی تعداد اور مختلف النوع شہریوں کی فوج ظفر موج اس کے حقوق وفرائض کو متعین کرتی ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے حقوق کی تین اقسام ہیں۔ پہلی قسم وہ جن کی حیثیت اخلاقی ہوتی ہے۔ بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، کمزور کی مدد، واقف یا ناواقف ضرورتمند کی ضرورت کو پورا کرنا وغیرہ۔ دوسرے وہ حقوق ہیں جن میں قانون آداخل ہوتا ہے۔ ایسے حقوق کی مزید دو اقسام ہیں۔ ایک قسم وہ جو شہریوں کے مابین ہوتے ہیں جیسے حقِ نکاح وطلاق، حقِ مہر، حقِ اجرت' حقِ پردہ داری، حقِ رازداری وغیرہ۔ دوسری قسم حقوق کی وہ ہے جو حکومتِ وقت اور شہریوں کے مابین ہوتی ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم اخلاقی اور شہریوں کے مابین قانونی حقوق پر کافی بحث کر چکے۔ ذیل میں ہم ان حقوق کا ذکر کرتے ہین جو شہریوں اور حکمرانوں کے مابین ہوتے ہیں۔ اس میں اندرونی یا بیرونی دونوں قسم کے حکمران شامل ہیں۔

حقِ ملکیت

اسلام کا یہ منفرد کردار کہ وہ انفرادی ملکیت کی اجازت دیتا ہے۔ ضرورت سے زائد تو وہ اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا لیکن ضرورت ہو یعنی اگر وہ ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے کی خاطر فیکٹریوں اور لمبے چوڑے کاروباروں میں مصروف ہو تو ارب پتی بھی ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس کی آمدنی واخراجات قرآن وسنت کے مطابق ہوں اور یہ بھی کہ اس کے کاروبار سے حکومت یا کسی دوسرے شخص کے کاروبار پر بُرا اثر نہ پڑتا ہو۔ پھر جیسے کہ انسانی ضرورت ہے اسلام حقِ ملکیت مرد اور عورت دونوں کو دیتا ہے۔ اسلام کی انسان پروری کی یہ بھی ایک روشن مثال کہ وہ وراثت میں مرد اور عورت، لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو شامل کرتا ہے۔ قرآن میں آیا:

''مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو' خواہ تھوڑا

ہو یا بہت، حصہ ہے ضرور‘‘ (نساء:7)۔

اس آیہ مبارکہ یں موجودہ دور کی کئی الجھنیں حل کی گئی ہیں۔ پہلی الجھن جس کا حل بتایا گیا ہے یہ کہ عورت خواہ وہ بیٹی، بہن، بیوی، ماں یا کسی حیثیت میں ہو اس کی ایک اپنی حیثیت (Identity) ہے۔ وہ محض دوسروں پر بوجھ (Dependent) نہیں اور بے سہارا نہیں ہے۔ مرد کی طرح وہ حاملِ ملکیت ہے اور فرض ہونے پر اسے اپنی ملکیت سے زکوٰۃ ادا کرنی ہے۔ دوسری اس الجھن کا حل کہ میراث کو بہر حال تقسیم ہونا ہے اور اسلام نے تفصیل کے ساتھ مختلف وارثین کے حصوں کا ذکر کیا ہے جو ان کی ذمہ داریوں کے مطابق طے کر دیئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مرنے والے نے اگر ایک پلاٹ چھوڑا جس کے دس وارث ہیں تو یہ تو ضرور ہے کہ اسے دس حصوں میں تقسیم کیا جائے گا لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ دس حصے برابر ہوں بلکہ وہ ان ذمہ داریوں کے مطابق کم و بیش ہونگے جو مختلف وارثین نے ادا کرنی ہیں۔ مثال کے طور پر مرد پر تو لواحقین کے نان و نفقہ کا بوجھ ہوتا ہے، عورت پر نہیں۔ پھر یہ بھی کہ عورت کو میکے سے بھی وراثت ملتی ہے تو سسرال سے بھی۔ پھر اس مسئلے کا حل بھی اس آیت میں موجود ہے کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال واملاک پر ہوگا خواہ وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، صنعتی ہو یا زرعی وغیرہ۔ پھر یہ تو ظاہر ہے ہی کہ تقسیم وراثت کا مسئلہ پیدا ہوگا تو اس وقت جب مرنے والا کوئی مال و ملکیت چھوڑ کر مرا ہو۔

اسلام نے تحفظ وحقِ ملکیت کو اس قدر اہم قرار دیا ہے کہ رسول ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

’’جو شخص اپنا مال بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے‘‘ (بخاری)۔

مال کا اصل تحفظ جس کی اسلام بار بار تاکید کرتا ہے اسکا اللہ کے لئے خرچ کرنا ہے۔ وہ مال جو اللہ کی راہ میں یا دوسرے لفظوں میں ان مدات میں جو انسانیت کی خیر خواہی کے لئے ہوں خرچ کیا جائے وہ ایسے بنک میں جمع ہو جاتا ہے جہاں نہ چور کا ڈر ہے نہ خسارے کا بلکہ وہاں ہر جمع کیا جانے والا سرمایہ کئی گنا بڑھا کر واپس کیا جاتا ہے۔ (بقرہ:261)۔

پھر اسلام کا یہ بھی اعزاز کہ سرمائے و مال پر سانپ بن کر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

زکوٰۃ وصدقات وغیرہ کی صورت میں ایسا فطری نظام دیتا ہے کہ سرمایہ فطری انداز سے گردش میں رہتا ہے۔ بڑی بھیانک وعید ہے ان مالداروں کے لئے جو مال اندوزی کرتے اور مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ فرمایا:

''دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو'' توبہ: 35-34)۔

یہ بھی اسلام کا اعزاز کہ وہ مال ومتاع کو وجہ افتخار بننے کی اجازت نہیں دیتا، وہ تقویٰ کو معیارِ فضیلت قرار دیتا ہے۔ ایمان، عمل، علم اور صحتِ جسم کی قدر کرتا ہے۔ قرآن میں آیا:

''ان کے نبی نے ان سے کہا اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے ''ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے''۔ نبی نے جواب دیا ''اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو علم اور جسم کی اہلیتوں سے نوازا ہے'' (بقرہ: 247)۔

یہ ہے اسلام! وہ جو اسلام کی مخالفت کرتے ہیں کیا وہ مرد کے ساتھ عورت کو وراثت میں حصہ دار نہیں بنانا چاہتے؟ ذرا تنہائی میں سوچیں تو سہی، آخر انسانیت کی وہ کیا خدمت کر رہے ہیں؟

حقوقِ جاں

اسلام انسانی جان کو اس قدر محترم قرار دیتا ہے کہ اس کے نزدیک ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ اور ایسا قتل صرف مسلمان کا ہی نہیں، مسلمان اور غیر مسلمان دونوں کا۔ قرآن مجید میں آیا:

''جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ

سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی'' (مائدہ:32)۔

ایک اور جگہ پر فرمایا گیا:

''قتلِ نفس کا ارتکاب نہ کرو، ایسا کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے مگر حق کے ساتھ'' (بنی اسرائیل:32)۔

انسانی ضرورت ہے کہ بعض صورتوں میں کسی انسان کی جان لینا معاشرے اور بہتر رہن سہن کی ضرورت بن جاتی ہے۔ اسلام نے ان صورتوں کی وضاحت کر دی ہے اور ان کو درج ذیل چھ صورتوں تک محدود کر دیا ہے۔

1۔ قتلِ عمد کے مجرم سے قصاص

2۔ جہاد میں دینِ حق کی راہ میں مزاحم لوگوں سے جنگ۔

3۔ اسلامی نظامِ حکومت کو الٹنے کی سعی کرنے والوں کو سزا۔

4۔ شادی شدہ عورت یا مرد کو زنا کی سزا۔

5۔ ارتداد کی سزا۔

6۔ شاہراہوں پر ڈاکہ زنی کرنیوالوں کو سزا

قتل عمد کی سزا لازماً جہنم رسیدگی ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

''وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے۔ اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے'' (نساء:93)۔

اسلام کا یہ منفرد پہلو کہ سیکولر نظاموں کے قوانین تحفظ جان کے حق کو بعد از ولادت لاگو کرتے ہیں اس کے برعکس اسلام اس حق کا اطلاق اس وقت سے کرتا ہے جب ماں کے پیٹ میں لوتھڑا انسانی شکل اختیار کرتا ہے اور اس کی مدت اسلام نے استقرارِ حمل سے چار ماہ بعد رکھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور اس نے نہ صرف زنا کا اعتراف کیا بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کیا۔ ہادیٔ برحق ﷺ نے اس عورت سے پوچھا کہ کیا وہ حاملہ تو نہیں؟ اس کے اقرار پر اس کی سزا کو نہ صرف بچے کی ولادت تک مؤخر کیا بلکہ رضاعت تک یعنی بچے کی دودھ پینے کی مدت تک جسے بھی اسلام نے دوسال کی مدت سے مختص کر دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث بھی حرمتِ جاں پر مصر ہیں۔ چند ایک کا ذکر درج ذیل ہے:

حجۃ الوداع پر آپ ﷺ نے تاکید کی' فرمایا:

''لوگو! تمہارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئی ہیں۔ ہمیشہ کے لئے ان کی حرمت ایسی ہے جیسی آج تمہارے اس دن کی' اس ماہ مبارک (ذی الحجہ) کی اور اس شہر کی۔ خبردار! ایسا نہ ہو کہ تم میرے بعد ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو اور کفار کے زمرے میں شامل ہو جاؤ (بخاری' ابوداؤد)۔

''کسی مسلمان کے قتل کے مقابلہ میں پوری دنیا کا زوال اللہ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا (مسلم)'' اور خون صرف مسلمان کا ہی محترم نہیں' اللہ کے ہر بندے کا خون محترم ہے۔ کسی مسلمان کے ہاتھ سے اگر کسی ذمی کا قتل ناحق ہو جائے تو اس پر جنت حرام ہے۔ فرمایا:

''جس نے کسی معاہد (وہ جس کے ساتھ معاہدہ ہو) غیر مسلم کو قتل کیا وہ کبھی جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا'' (بخاری)۔

اس موضوع پر اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن ہم ایک اور حکم بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ فرمایا: ''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو'' (نساء:29)۔

یعنی اسلام خودکشی کو حرام قرار دیتا ہے۔ یوں خودکشی کا دروازہ اس نے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ یہ ہے اسلام! اسلام کے مخالفین کیا قتل انسانی کے اس قدر متوازن، مربوط اور بامقصد نظام کو نہیں چاہتے؟ ذرا تنہائی میں سوچیں وہ انسانیت کی کونسی خدمت کر رہے ہیں؟

تحفظِ آبرو

اسلام کے نزدیک کسی پاکدامن عورت پر تہمت لگانے والا تقریباً اتنا ہی بڑا مجرم ہے کہ جتنا زانی یا زانیہ۔ غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا اگر سو کوڑے ہے تو تہمت لگا کر اس کا ثبوت پیش نہ کرنے والے کی سزا اسی کوڑے ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں' پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں' ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو'' (نور: 4)۔

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو حقیر جانا جائے۔ قرآن میں آیا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان (مذاق اڑانے والوں) سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں (حجرات: 11)۔

اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک دوسرے پر طعن کی جائے یا ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کیا جائے۔ قرآن میں آیا:

''آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو'' (حجرات: 11)۔

بدزبانی اور شہدپن میں نام پیدا کرنے کی اجازت نہیں۔ فرمایا:

''ایمان لانے کے بعد فسق و فجور میں نام پیدا نہ کرو۔ یہ بُری عادت ہے جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں'' (حجرات: 11)۔

کس قدر کمال اسلام کا' بدگمانی' تجسس کرنے اور غیبت وغیرہ کرنے سے منع فرمایا۔ قرآن میں آیا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے

مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے'' (حجرات:12)۔

خون، رنگ، نسل، زبان وجہِ فضیلت نہیں۔ اللہ کے نزدیک افضل واعلیٰ وہ ہے جو اس سے ڈرنے والا ہے۔ وہ اتنا ہی اللہ کے نزدیک جتنا تقویٰ میں زیادہ۔ قرآن میں آیا:

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے'' (حجرات:13)۔

کچھ لوگ عزت حاصل کرنے کی خاطر کسی اونچی کلغی والے، کسی اونچے عہدے والے، کسی اونچی مسند والے کا دم چھلا بننے کی سعی کرتے ہیں۔ بزعم خویش وہ کسی بلند منصب سے منسلک ہو کر اپنی عزت و بڑائی کے متلاشی ہوتے ہیں۔ یوں معزز ہونے والے اصل میں خود کو معزز بنانے کی دھن میں ذلت و رسوائی کا رستہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن مجید پتہ دیتا ہے کہ یوں عزت گنوانے والے سن لیں کہ عزت کا سرچشمہ تو صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔ عزت بھی اسی ایک کے ہاتھ میں ہے تو ذلت بھی۔ قرآن میں آیا:

''کہو! خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے، عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے (آل عمران:26)۔

اور یہ بھی آیا:

''اور جو منافق اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ مژدہ سنا دو کہ ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے'' (نساء:139)۔

اسلام نے امیر اور غریب کے مالی فرق کو کم کرنے اور روپے پیسے کو سرکولیشن میں رکھنے کے لئے زکوٰۃ کا نظام اپنا رکھا ہے بلکہ اسے ایک عبادت قرار دیا ہے۔اس نظام میں سرمائے کا بہاؤ امیر سے غریب کی طرف ہوتا ہے لیکن انتقالِ مال کا یہ براہِ راست یعنی ایک آدمی سے بالمشافہ دوسرے کی طرف نہیں ہوتا بلکہ زکوٰۃ ادا کرنے والا اپنی رقم سرکاری خزانے یعنی بیت المال میں جمع کراتا ہے اور وہاں سے رقوم مستحقین کو بطور وظائف ادا ہوتی ہیں۔ظاہر ہے براہ راست ادائیگی کی صورت میں زکوٰۃ لینے والے کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے جو اسلام کو قطعاً گوارا نہیں۔ ہاں کسی وقت ایمرجنسی میں کوئی صاحبِ مال اپنا مال کسی غریب کے سپرد کرے تو اس کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنا ثواب احسان جتلا کر اور اذیت دے کر کم نہ کرے۔فرمایا:

’’جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتلاتے‘ نہ دکھ دیتے ہیں‘ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذراسی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے‘‘(بقرہ:263-262)۔

رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث بھی ایک دوسرے کی عزت و آبرو کے تحفظ کی تاکید میں ہیں۔چند ایک کا ذکر یہاں کرتے ہیں۔فرمایا:

’’مسلمان کی پشت محترم ہے (اس کی پٹائی نہیں ہونی چاہیے) اِلّا یہ کہ اس نے سزا کے قابل جرم کیا ہو۔جس نے بلا وجہ کسی مسلمان کو مارا، اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضبناک ہوگا‘‘ (طبرانی)۔

’’اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جارہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جارہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے مواقع پر نہیں کرتا ہے جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہو۔اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے مواقع پر کرتا ہے جہاں اس کی عزت پر حملہ کیا جارہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جارہی ہو تو اللہ عزوجل اس کی مدد ایسے

مواقع پر کرتا ہے جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کی مدد کرے'' (داؤد)۔

''بدترین زیادتی کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا ہے'' (داؤد)۔

''جس کسی نے دوسرے کی بے عزتی یا آبروریزی کی ہو تو وہ آج معاف کرالے، اس دن سے پہلے جب نہ روپیہ پیسہ ہوگا نہ مال وزر، البتہ نیک عمل اس کے پاس ہوگا جو لے لیا جائے گا اس ظلم کے موافق۔ اور اگر نیک عمل نہ ہوگا تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس کے کھاتے میں ڈال دی جائیں گی''۔ (بخاری)۔

یہ ہے اسلام! انسان وانسانیت کا محافظ! کیا اسلام کی مخالفت کرنے والوں کو ایسا تحفظ نہیں چاہئے؟ تنہائی میں ذرا وہ سوچیں کہ وہ انسانیت کی کیا خدمت کر رہے ہیں؟

نجی زندگی کا تحفظ

نجی زندگی کے تحفظ کا کماحقہٗ انتظام ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ مرد اور عورت کے درمیان اس تقسیمِ کار کو مدنظر نہ رکھا جائے جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسلام عورت کے دائرۂ کار کو اس مملکت میں محدود کرتا ہے جس کا نام ''گھر'' ہے۔ بیرونِ گھر جو مختلف نوع کی ذمہ داریاں ہیں وہ مرد کے سپرد کی گئی ہیں۔ دائرہ کار کی اس تقسیم میں غیر معمولی حالات میں۔ تھوڑے بہت انحراف کی اجازت ہے۔ عام حالات میں قطعاً نہیں۔ آج کی دنیا میں بہت سے معاشروں نے اللہ تعالیٰ کی طے کردہ اس فطری تقسیمِ کار سے انحراف کر کے بچشم سر دیکھ لیا ہے کہ انہوں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ گھر ویران ہو گئے۔ اولاد بے راہ ہو گئی۔ مرنے جینے پر ایک دوسرے سے رابطے ٹوٹ گئے۔ شوہر کو بیوی اور بیوی کو شوہر پر اعتماد نہ رہا۔ اطمینانِ قلب جیسی سب اقدار گنوا بیٹھے۔ آ جا کر کتوں اور بلیوں سے دل بہلانے لگے۔ ایسے میں نجی زندگی خود کہیں نہیں، اس کے تحفظ کا کیا سوال؟

اسلام اس فطری تقسیمِ کار کو لے کر نجی زندگی کے تحفظ کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ آئیں، دیکھیں کیسے؟

اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ جب کسی دوسرے کے گھر جاؤ تو وہاں داخل ہونے سے پہلے اہلِ خانہ سے اجازت لو اور ان پر سلام بھیجو۔ قرآن مجید میں آیا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور اہلِ خانہ پر سلام نہ بھیج لو۔ یہ طریقہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔ پھر اگر وہاں پر کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دے دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس چلے جاؤ۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے'' (نور: 27-28)۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی تاکید فرمائی ہے کہ کسی کے گھر دستک دینے کے بعد اس کے باہر آنے تک کے انتظار میں دروازے کے سامنے کھڑا ہونے کی بجائے اس سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہونا چاہئے۔ یہ بھی فرمایا کہ اپنے گھر میں داخل ہوتے ہوئے بھی آواز یا دستک دے کر داخل ہوا جائے تاکہ ماں، بہنوں اور بیٹیوں پر ایسی حالت میں نظر نہ پڑے کہ خفت کا باعث ہو۔

ان مکانوں، دکانوں، دفتروں وغیرہ کو ایسی پابندیوں سے مستثنیٰ کر دیا جہاں رہائش نہ ہو۔ فرمایا:

''تمہارے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے (یا کام) کی کوئی چیز ہو'' (نور: 29)۔

کسی دوسرے کے گھر داخل ہونے کی اجازت کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی پھر وہاں دھرنا دے کر بیٹھ جائے۔ احسن یہ ہے کہ وہاں بقدرِ ضرورت وقت گزارنے کے بعد فوراً اٹھ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ صاحبِ خانہ دقت محسوس کرے۔ بالخصوص نبئ رحمت ﷺ کے گھر کے حوالے سے فرمایا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نبی کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ مگر جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ' باتیں کرنے میں نہ لگے رہو'' (احزاب: 53)۔

یہ بھی اسلام کی ہدایت ہے کہ اگر دروازے سے ہی کوئی چیز لینی ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ فرمایا:

''نبیؐ کی بیویوں سے اگر تم نے کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو'' (احزاب: 53)۔

انسان کی ایک اور ضرورت ہے کہ استراحت کے اوقات میں اس کی پرائیویسی میں کوئی خلل انداز نہ ہو۔ اسلام نے اس معاملے کو بھی ہاتھ میں لیا ہے۔ فرمایا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! لازم ہے کہ تمہارے مملوک (نوکر، لونڈی وغیرہ) اور تمہارے وہ بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں' تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں۔ صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو جب تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین اوقات تمہارے لئے پردے کے اوقات ہیں۔ ان کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان پر۔ تمہیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے اور وہ علیم وحکیم ہے۔ (نور: 58)۔

آج کے دور میں حکومتی سطح پر بہت سے ایجنسیاں ایسی ہیں جو شہریوں کی ٹوہ اور تجسس میں لگی رہتی ہیں۔ اسلام یہ خواہ مخواہ کا جاسوسی کا جال بچھانے، کسی شہری کے پیچھے مخبر لگانے' لوگوں کے گھروں میں آلاتِ جاسوسی نصب کرنے، ٹیلیفون ٹیپ کرنے، خطوط سنسر کرنے اور یوں مخالفین کو بلیک میل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ فرمایا گیا:

''اور تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے'' (حجرات: 12)۔

رسول اللہ ﷺ نے تو فرمایا کہ اگر تم تجسس کے درپے ہو گے تو لوگوں کو بگاڑ دو گے۔ ملاحظہ ہو آپ کا ارشاد مبارک:

''تم اگر لوگوں کے مخفی حالات معلوم کرنے کے درپے ہو گے تو ان کو بگاڑ دو گے یا کم از کم بگاڑ کے قریب پہنچا دو گے'' (ابوداؤد)۔

حکمرانوں کی طرف سے آج مختلف معاشروں میں ایسے بگاڑ کی شکلیں ہمارے سامنے ہیں۔ایک اور حدیث میں آیا:

''جس نے کسی کے عیب کو دیکھا اور اس کی پردہ پوشی کی اس نے گویا ایک زندہ درگور انسان کو زندہ کردیا'' (ابوداؤد، نسائی)۔

ایک اور حدیث میں فرمایا:

اگر کوئی شخص کسی کو گھر میں جھانکتے دیکھے اور اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

آپ ﷺ نے کسی کا خط پڑھنے کی بھی ممانعت کی۔

یہ ہے اسلام! کیا اسلام پر یلغار کرنے والوں کو گھر اور گھر والوں کو بیرونی مداخلت سے بچانے، راز ٹٹولنے، کھوج لگانے سے پرہیز کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا تنہائی میں غور فرمائیں وہ انسانیت کی کونسی خدمت کررہے ہیں؟

حقِ آزادی

اس موضوع پر ہم دو ذیلی عنوانات کے تحت بحث کرتے ہیں۔یعنی آزادئ عمل اور آزادئ رائے۔

1۔آزادئ عمل: آج کی دنیا میں خواہ وہ مسلم دنیا ہو یا غیر مسلم ایک شخص بھی آزاد نہیں۔انسان اللہ تعالیٰ کی فیکٹری کا پروڈکٹ ہے۔جس طرح ایک عام فیکٹری کے پروڈکٹ والے کو اپنی تیار کردہ چیز کو استعمال میں لانے کی ہدایات دینی ہوتی ہے اسی طرح فطرت کی فیکٹری میں تیار ہونے والے انسان کو زندگی گذارنے کے قوانین وضوابط دینا صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے پوری انسانی تاریخ پر وقتاً فوقتاً آسمانی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔لیکن دنیا بھر میں ایک انسان بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو ایسے نظام زندگی میں رہ بس رہا ہو جو خالص اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قوانین پر مبنی ہو۔اس لئے کہ ایسا نظام خود کسی خطۂ زمین میں

نافذ نہیں۔ دنیا بھر میں دو طرح کے نظام رواں دواں ہیں یعنی یا تو وہ جو خالص بندوں کے خود ساختہ قوانین پر مبنی ہیں جیسے آمریت جمہوریت یا اشتراکیت وغیرہ اور یا نظام ایسے قوانین پر مبنی ہیں جو کچھ اللہ کے قوانین پر اور کچھ بندوں کے خود ساختہ قوانین پر مبنی ہیں یعنی ان کی حیثیت ملغوبہ کی سی ہے۔ اللہ کے دیئے ہوئے قوانین تو ظاہر ہے آزادی کو یقینی بناتے ہیں اس لئے کہ وہ اس ہستی کے بنے ہیں جو غیر جانبدار ہے' جسکا نظام کے ساتھ کوئی مفاد وابستہ نہیں۔ نہ اس کی اولاد ہے نہ برادری۔ اس کے مقابلہ میں جہاں بھی بندوں سے قانون سازی کا عنصر آ گھستا ہے وہیں انسانوں اور انسانی طبقوں کا مفاد چپکے چپکے یا بابانگِ دہل آ شامل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب آج کی دنیا میں خالص اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام رائج نہیں تو کسی نہ کسی طور دنیا کا ہر شخص محکوم ہے۔ الٰہی قوانین اور انسانی قوانین کی نسبت تناسب کے مطابق' کہیں افراد تھوڑے جکڑے ہوئے ہیں کہیں بہت لیکن ہیں ہر جگہ پر محکوم۔

محکوم ہونے کا جو سب سے زیادہ نقصان ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو آزادئ عمل کی نعمت سے نواز رکھا ہے وہ چھینی جاتی ہے اور کوئی بھی فرد ان صوابدیدی اختیارات (Discritional powers) سے استفادہ نہیں کرسکتا جو اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کی آزمائش کے لئے وضع اور عطا کر رکھے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام ہو تو انسانیت اس سہولت سے فائدہ مند ہوسکتی ہے ورنہ نہیں۔

اسلام ان صوابدیدی اختیارات کا بدرجۂ اتم تحفظ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا:

''دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔ صحیح بات غلط خیالات سے علیحدہ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے''(بقرہ:256)۔

اور کون اس آزادی پر دھاوا بول سکتا ہے جب کہ کسی نبی کو بھی ایسا کرنے کا اختیار نہیں۔ قرآن میں آیا:

''کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتابِ اور حکم اور نبوت عطا کرے اور وہ

لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم میرے محکوم بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ ربانی (اللہ کے محکوم) بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو" (آلِ عمران: 79)۔

خود رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"اے نبی ﷺ! نصیحت کئے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، ان پر جبر کرنے والے نہیں" (غاشیہ: 21-22)۔

عمل کی یہ آزادی کوئی مادر پدر آزادی نہیں۔ اس پر ایک بڑی قدغن ہے اور وہ قدغن یہ کہ عمل فرد سے ہو یا اجتماعی طور پر کسی ادارے حتیٰ کہ پوری امتِ مسلمہ سے' یہ اسلام کے کسی ضابطے، چھوٹا ہو یا بڑا' کے خلاف نہ ہو۔ یہ قدغن یا پابندی اسی نوعیت کی ہے جیسے ہائی وے پر لگے ہدائیتی اشارات جن کا مقصد مسافر کے سفر کو محض محفوظ بنانا ہوتا ہے، عملِ سفر پر ناجائز پابندی لگانا نہیں۔

2۔ آزادئ رائے: کوئی بھی معاشرہ، کوئی بھی گروہ تیزی کے ساتھ تباہی و بربادی کی طرف بڑھتا ہے جب اس کی زبان، قلم پر تالے لگا دیئے جائیں۔ اس لئے اسلام دو بڑے اداروں یا منسٹریوں کو' آزادئ رائے' اظہارِ آزادی رائے اور مشاورت کے لئے مختص کرنے کو لازم قرار دیتا ہے۔ یہ قرآنی تقاضا ہے یعنی ان کے وجود کی خود قرآن میں باصرار تاکید کی گئی ہے۔ یہ دو ادارے ہیں:

(i)۔ شوریٰ

(ii)۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

ہم ان کی اہمیت اور طریق کار پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں۔

(i)۔ شوریٰ: اسلام ایک شورائی نظام ہے یعنی یہ نظام لوگوں کے مشورے سے چلایا جاتا ہے۔ قرآن میں آیا:

"(جو کچھ اللہ کے پاس ہے) وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں

اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کرتے ہیں، جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ رزق انہیں دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں'' (شوریٰ:37-38)۔

اسلام میں پارلیمنٹ کی بجائے شوریٰ کا ادارہ ہوتا ہے۔ شوریٰ کا ادارہ اصل میں مجتہدین کا گروہ ہوتا ہے یعنی ایسے لوگ جن کا قرآن وسنت پر بھی مکمل عبور ہوتا ہے تو حالاتِ حاضرہ پر بھی۔ انہوں نے ہر اس معاملے میں قرآن وسنت کی روشنی میں انبساط کر کے خلیفۃ المسلمین کو اپنی رائے اور مشورے سے نوازنا ہوتا ہے جس کے متعلق قرآن وسنت میں براہِ راست نص یا کوئی ضابطہ نہ ہو۔ اسلام کی یہ عظمت کہ اس نے رائے اور مشورے کو محکمانی حیثیت میں (Institutionalize) کر دیا ہے۔

خلیفۃ المسلمین پوری اسلامی دنیا کا واحد سربراہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑا آمر ہوگا۔ لیکن وہ اتنا بے بس کہ کوئی فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتا۔ وہ قرآن وسنت کے احکامات کا پابند ہے خواہ ان کا اطلاق خود اس پر، اس کے بچوں اور دیگر اعزہ واقارب پر ہو۔ ہاں، ایک شکل ایسی پیدا ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو کہ جس کے متعلق قرآن وسنت میں براہ راست کوئی ضابطہ نہ ملے۔ ایسے میں بھی خلیفۃ المسلمین بغیر شوریٰ کا مشورہ اور رائے لئے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یہی وہ صورت حال ہے کہ جہاں شوریٰ اور مشورے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ہر رکنِ شوریٰ مشورہ دینے میں کلی آزاد ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی رائے کا ماخذ اس کی اپنی مرضی نہیں، قرآن وسنت ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ اسلام میں نبی ﷺ کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ عوام سے مشورہ کرے، ظاہر ہے ایسا مشورہ کارِ رسالت میں نہیں کارِ خلافت میں درکار ہوتا ہے۔

(ii)۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر: ایک اچھے معاشرے کی علامت یہ ہے کہ وہاں نیکی کو فروغ تو برائی کا قلع قمع ہو۔ اس کے برعکس اگر کسی معاشرے میں معاملہ الٹ ہو یعنی جہاں برائی کو فروغ اور نیکی کا قلع قمع ہو تو وہ معاشرہ آج گرا یا کل، بس تباہی کی طرف گامزن ہونے کی

وجہ سے جلد صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ اسلام ایک ایک فرد، ایک ایک ادرے اور بالآخر پوری امت کے لئے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ نیکی کو فروغ اور برائی کا انسداد کرے۔ ایسا تبھی ممکن ہوسکتا ہے کہ جہاں برائی ہورہی ہو دیکھنے والا اسے روکے اور جہاں نیکی ہورہی ہو اس کا معاون بنے۔ یعنی دیکھنے والا محض تماشائی نہ بنے۔ بھلائی دیکھے یا برائی اپنی رائے کا اظہار ضرور کرے۔ مسلمان سوسائٹی کا فرد یا ادارہ ہوتے ہوئے ایسا کرنا اس کا فرضِ منصبی ہے۔ رائے کے اظہار کے لئے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر وہ کسی طور نگران اور حکمرانی کی پوزیشن میں ہے تو اپنی رائے کو بزور نافذ کرے۔ ایسا ممکن نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں تنگی محسوس کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''جو شخص برائی کو دیکھے تو اسے طاقت سے بدل ڈالے، اگر وہ ایسا نہ کرسکے تو پھر زبان سے (اس کے خلاف) جہاد کرے، اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو پھر کم از کم اپنے دل میں ہی اس سے نفرت کرے اور یہ آخری کیفیت کمزور ایمان کی نشانی ہے'' (مسلم، ترمذی)۔

فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اتنا اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول نہیں فرماتا جو یہ فرضِ منصبی ادا کرنے سے قاصر رہیں۔ رسول ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری زندگی ہے (اے امتِ مسلمہ!) تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک ایسے (خطرناک) عذاب میں مبتلا کر دے گا کہ اس سے نجات پانے کے لئے تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو گے مگر وہ تمہاری دعاؤں کو قبول نہیں کرے گا'' (ترمذی، مسندِ احمد)۔

چونکہ یہ رائے دینا ایک دینی فریضہ ہے اس لئے اسلامی تاریخ میں بسا اوقات ایک عام شہری خلیفۃ المسلمین کا احتساب تک کرسکتا ہے۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں مقام پر قیام کریں اور پڑاؤ ڈالیں۔ ایک صحابیؓ نے دریافت کیا ''یہ ارشاد وحی سے ہے یا آپ ﷺ کی ذاتی

رائے ہے''؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ میری ذاتی رائے ہے۔ صحابیؓ نے عرض کیا ''پھر تو یہ منزل مناسب نہیں۔ اس کے بجائے فلاں فلاں منزل مناسب ہوگی''۔ چنانچہ اسی کی رائے پر عمل کیا گیا۔ (یہ رائے لینا خلافت کا حصہ تھا رسالت کے معاملہ میں کسی رائے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اللہ اور رسول ﷺ کا معاملہ ہے۔)

ایک خاتون راہ چلتے خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ پر برس پڑیں اور بولیں ''عمر تمہارے حال پر افسوس ہے' میں نے تمہارا وہ زمانہ دیکھا ہے جب تم عمیر کہلاتے تھے اور لاٹھی لئے دن بھر عکاظ میں بکریاں چراتے پھرتے تھے۔ اس کے بعد میں نے تمہارا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب تم عمر کہلانے لگے اور اب یہ زمانہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ امیر المومنین بنے پھرتے ہو۔ رعایا کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرے گا اور آخرت کے بعید عالم سے اپنے آپ کو بالکل قریب پائے گا اور جس کو موت کا ڈر ہوگا وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہے گا کہ اللہ کی دی ہوئی کوئی فرصت رائیگاں نہ جائے۔''

یہ ہے اسلام! پوری انسانی تاریخ میں آزادئ عمل، آزادئ اظہارِ رائے، اظہارِ ضمیر و اعتقاد کے ایسے مناظر اب نہیں ملیں گے۔ کیا مخالفینِ اسلام کو ایسی آزادی کی ضرورت نہیں؟ تنہائی میں ذرا سوچیں اسلام پر یلغار کر کے وہ انسانیت کی کونسی خدمت کر رہے ہیں؟

ظلم کے خلاف احتجاج کا حق

ظلم کا متبادل مفہوم حق تلفی ہے۔ حق تلفی خواہ کسی فرد کے خلاف ہو، خود کسی کے اپنے خلاف ہو، اللہ تعالیٰ کے خلاف ہو' ظلم ہے۔ شرک کو اسی لئے ''ظلمِ عظیم'' کہا گیا ہے کہ اس میں وہ اوصاف و اعزازات جو صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہیں کسی دوسرے میں بھی گردانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر حاکمیت و قانون سازی صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ لیکن جب انسان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قوانین کو نافذ نہ کریں جس کا دوسرا مطلب ہے کہ وہ خود ساختہ قوانین نافذ کریں تو ایسوں کو کافر بھی کہا گیا ہے، ظالم بھی اور فاسق بھی۔ (مائدہ:47,45,44)۔ بنا بریں قرآن مجید میں کئی

مقامات پر گناہ کے لئے ظلم اور گناہگار کے لئے ظالم کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔قرآن مجید میں بار بار صرف یہی نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ناپسند کرتا ہے(آلِ عمران: 57) بلکہ یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا(مائدہ:52) صرف مظلوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ محض احتجاج تو کیا بدکلامی کی اجازت دیتا ہے۔فرمایا:

''اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے''(نساء:148)۔

حدیث میں آیا:

''افضل ترین جہاد اس شخص کا ہے جو کسی حق سے ہٹے ہوئے سلطان کے آگے کلمۂ حق کہے''(ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ)۔

یہ بھی فرمایا:

''لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ ان پر عذابِ عام نازل کردے''(ابوداؤد، ترمذی)۔

آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد مبارک ہے:

''اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔عرض کیا گیا، یا رسول اللہ ﷺ وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کریں گے مگر ظالم کی کیسے مدد کریں؟ فرمایا: اسے ظلم سے روک دو''(بخاری)۔

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرض کی ادائیگی کا تقاضا کرنے لگا۔اس نے بھری محفل میں سخت کلامی کی۔اس کے گستاخانہ طرزِ تخاطب پر صحابہؓ چونک گئے اور وہ اس کی مرمت کے لئے اٹھے۔آپ ﷺ نے فرمایا''اسے کہنے دو، اسے کہنے دو، جس کا کچھ حق نکلتا ہو وہ ایسی باتیں کرسکتا ہے''(بخاری)۔

یہ ہے اسلام! ظلم کے خلاف احتجاج کو نہ صرف حق بلکہ فرض قرار دیتا ہے۔اسلام پر یلغار کرنے والے سوچیں کہ اسلام پر یلغار کیا انسانیت پر یلغار نہیں؟

عملِ غیر سے برأت

آج کی سیکولر اور جمہوری دنیا میں رواج ہے کہ اگر مجرم اِدھر اُدھر چھپ جائے تو اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ ان پر تشدد کیا جاتا ہے تاکہ کسی طور مجرم دستیاب ہو جائے۔ اسلام اس کی سختی سے تردید کرتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں آیا:

''ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے، کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا'' (انعام:164)۔

ایک اور جگہ پر فرمایا:

''سمجھ لو ظالموں کے سوا کسی اور پر دست درازی روا نہیں'' (بقرہ:193)۔

یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی اور۔ یہ وہی ضابطہ ہے جو قیامت کے دن بروئے کار لایا جائے گا۔ چنانچہ قرآن میں یہ بھی آیا:

''جو کوئی راہِ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لیئے مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا'' (بنی اسرائیل:15)۔

جب یوسفؑ نے اپنے بھائی کی خرجی سے اپنا گم شدہ پیالہ برآمد کر لیا تو اس کے بھائیوں نے یوسفؑ سے استدعا کی کہ اس بھائی کی بجائے کسی اور کو محبوس کر لیا جائے لیکن یوسفؑ نے یہاں اسی ضابطے کی وضاحت کی۔ قرآن میں آیا:

''انہوں (یوسفؑ کے بھائیوں) نے کہا ''اے سردار ذی اقتدار، اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے، ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں'' یوسفؑ نے کہا ''اللہ کی پناہ! دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے رکھ سکتے ہیں۔ جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرے کو رکھیں گے تو ہم ظالم ہونگے'' (یوسف:78-79)۔

یہ ہے اسلام! اسلام کے مخالفین کیا اس دین کے قلع قمع پر تلے بیٹھے ہیں جو ''حق بحق دار

رسید“ کے سنہری اصول کا داعی ہے۔ان کی یلغار کیا اسلام پر یلغار نہیں؟

حقِ مساوات

آج کی دنیا میں ”مساوات، مساوات“ کا بہت غوغا ہے۔ایسا ہی ہے جیسے کہ چور کو احساسِ ندامت ہو تو وہ شور مچانا شروع کر دے کہ ”چور، چور، چور“۔کہنے کو تو جمہوریت کا طرۂ امتیاز ہی یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر کہہ ومہہ کی برابر کی رائے لیکن خود جمہوریت کو قائم کرنے کے لئے جو طریقِ انتخاب اختیار کیا جاتا ہے وہ صرف سرمایہ داروں کا من پسند کھیل ہے۔الیکشن میں لاکھوں کروڑوں کی سرمایہ کاری ہوتی ہے۔ایک غریب، وہ خواہ لاکھوں صلاحیتوں کا مالک ہو الیکشن میں حصہ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔سرمایہ داروں کا یہ موج میلہ صرف انتخابات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس نظام کا ایک لازمی حصہ بن جاتا ہے۔پارلیمنٹ میں اگر کاشتکاروں کی اکثریت ہو تو قانون سازی خود بخود کاشتکاروں کے حق میں ہوتی ہے۔اگر تاجروں کا پارلیمنٹ پر قبضہ ہو تو زیادہ تر مراعات تاجروں کے حصہ میں آتی ہیں۔غرباء بیچارے بس خاموش تماشائی یا بے بس شہریوں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔اسلام ”سرمائے“ کو معیارِ اہلیت بناتا ہی نہیں بلکہ علم وجسم کی مثبت صلاحیتوں کو بناتا ہے۔قرآن میں آیا:

”(اُن کی درخواست پر) ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے۔یہ سن کر وہ بولے ”ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے“ نبی نے جواب دیا ”اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اس لئے کہ اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے“ (بقرہ: 247)۔

اسلام کے نزدیک اعلیٰ وادنیٰ کا معیار ہے لیکن رنگ، نسل، زبان، عہدے، سرمائے وغیرہ کی بنیاد پر نہیں اللہ کے ڈر کی بنا پر پیدا ہونے والے مزاج، کردار اور ساکھ پر۔فرمایا گیا:

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار (اللہ سے ڈرنے والا) ہے یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے'' (حجرات: 13)۔ یاد رہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو'' (بیہقی)۔

دنیا بھر کے دساتیر میں ''مساوات'' کا ذکر اکثر و بیشتر ملتا ہے لیکن انہی دساتیر میں ایک شق یہ بھی ہوتی ہے کہ سربراہ مملکت اور سربراہ حکومت کی ان کے دوران حکومت میں عدالتی حاضری بوقت ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ شاید اسی لئے کہ سیکولر نظام میں یہ عدالت میں حاضری کی نوبت اکثر آتی رہتی ہے۔ اسلام پہلے تو نظام ہی ایسا دیتا ہے کہ خلیفۃ المسلمین کی عدالت میں حاضری کی نوبت ہی نہیں پڑتی اس لئے اللہ کا قانون خود اس پر اسی طرح نافذ ہوتا ہے جس طرح کہ عام شہری پر۔ خلیفۃ المسلمین اس معاملے میں ایک عام شہری کی طرح بے بس ہوتا ہے۔ قانون سے بچ نہیں سکتا ہے۔ بنابریں اس پورے نظام کی کارگزاری ایسی ہے کہ خلیفۃ المسلمین کو عدالت میں حاضر ہونے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی لیکن اگر کبھی کبھار ایسی ضرورت پڑ جائے تو خلیفۃ المسلمین کے عدالت میں حاضر ہونے میں کوئی ضابطہ حائل نہیں۔ شاید تاریخ میں پہلی بار دورِ خلافتِ راشدہ میں ضرورت پڑنے پر خلیفۃ المسلمین کو عدالت کے کٹہرے میں نہ صرف دیکھا گیا بلکہ اس کے خلاف اور ایک یہودی کے حق میں فیصلہ ہوتے بھی دیکھا گیا۔

قریش کی ایک عورت فاطمہ نے چوری کی۔ ایک صحابی حضرت اسامہؓ نے اسے معاف کرنے کی سفارش کی۔ نبی رحمت ﷺ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا جائے۔ مسلمان جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ اسی لئے تباہ ہوئی ہیں کہ وہ کم درجے کے لوگوں کو تو قانون کے مطابق سزا دیتی تھیں اونچے درجے کے لوگوں کو چھوڑ دیتی تھیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ بھی ایسا کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا“ (بخاری، مسلم)۔

اسلام کے مخالفین خود تاریخ کی ورق گردانی کریں اور پھر فیصلہ کریں کہ محض وطنی، لسانی، نسلی طرز کی مساوات ہی نہیں کیا انسانی سطح کی مساوات کی ان کو ضرورت نہیں؟ کیا وہ بھول میں نہیں؟

معاشی تحفظ کا حق

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح بالخصوص انسان تک ہدایت کی رسائی اپنے ذمہ لے رکھی ہے اسی طرح اس نے ہر ذی روح بالخصوص انسان تک رزق رسائی کو اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ قرآن مجید میں آیا:

”زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے۔ سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے“ (ہود: 6)۔

ایک اور جگہ پر فرمایا:

”کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے“ (عنکبوت: 60)۔

یعنی اسلام معاشی تحفظ کے حق کو اس قدر ترجیح دیتا ہے کہ ہدایت رسائی کے علاوہ یہ رزق رسائی ہے کہ جس کی ذمے داری خالق کائنات نے خود اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ ایسے میں ایسا تو نہیں ہونا چاہئے کہ کوئی شخص بھوکا یا ننگا رہے۔ لیکن واقعات کی دنیا میں تو ایسا ہے کہ بھوکا و ننگا رہنا تو درکنار، فاقوں سے مرنے والے اور سردی و گرمی کی شدت سے نڈھال ہونے والے آج ہماری

دنیا میں لاکھوں کروڑوں ہیں۔ اصل میں جس ہستی نے یہ رزق رسانی کی ذمہ داری لے رکھی ہے اس نے انسان کے لئے ایک ضابطۂ حیات بھی دے رکھا ہے۔ اگر دنیا بھر کے انسان وقت کے کسی بھی موڑ پر اس ضابطۂ حیات کو اس کے پورے لوازمات وکوائف کے ساتھ نظامِ حیات میں تبدیل کئے رکھیں تو دنیا میں کوئی بھوکا ننگا نہ رہے۔ بھوکا ننگا آج ہے تو اس لئے کہ انسانوں نے یا تو وہ ضابطۂ حیات اپنا ہی نہیں رکھا یعنی دیئے گئے ضابطۂ حیات کی بجائے خودساختہ ضابطۂ حیات نافذ کر رکھا ہے یا ضابطۂ حیات نافذ تو کر رکھا ہے لیکن اس کی پوری تفصیلات کے ساتھ نہیں بلکہ اس اصل ضابطۂ حیات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے دیئے گئے ضابطہ کے ساتھ اپنی خواہشات ومفادات پر مبنی ضابطہ حیات ملا رکھا ہے۔ بالفاظِ دیگر جب بھی دنیا میں معاشی نشیب وفراز ہوتا ہے تو اس وقت جب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ضابطۂ حیات خالص شکل میں نافذ نہیں ہوتا۔ یعنی ضابطۂ حیات اور نظامِ حیات ایسی صورت میں کچھ اسلام اور کچھ غیر اسلام کا ملغوبہ ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے آج ہماری دنیا میں بھوکوں اور ننگوں کے مرنے کی۔ یعنی ہماری اس زمین پر فراہمی رزق تو ہر انسان کے لئے ہے اگر کچھ لوگ بھوکے مرتے ہیں تو اس لئے کہ کچھ لوگوں کے کتے اور بلیاں ان بھوکے مرنے والوں کا رزق کھا جاتے ہیں اور ایسا ہوتا ہے تو اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام جو ہر فرد تک رزق رسائی کرتا ہے، بندوں کی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں درہم برہم ہوتا ہے' جیسے کہ آج کی دنیا میں ہمارے سامنے ہے۔ ہے تو وہ اسلامی نظامِ حیات انسانی زندگی کے ہر دائرہ کے متعلق لیکن موضوع کے اعتبار سے ہم اب اس کے معاشی پہلو کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

اسلام ہر فرد پر واجب کرتا ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھے بلکہ بقدرِ استطاعت اپنی تمام توانائیوں اور صلاحیتوں کو کچھ بہتر پیدا کرنے میں لگا دے۔ قرآن میں آیا:

''انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی'' (نجم:39)۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت حرام ہے۔ یعنی اسلام میں پادریوں' پروہتوں' پنڈتوں، پیروں وغیرہ جیسی اکاس بیلوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ پرائی روٹیوں پر گزر بسر کرنے والے

اسلام کے نہیں غیر اسلام کا جز ہوتے ہیں۔

پھر اسلام ہر فرد کی کمائی میں دوسرے افراد کا حصہ طے کر کے اسے اجتماعی نظامِ خلافت کا معاون بناتا ہے۔ ایسے انفاق کی تین اقسام ہیں:

1۔ نفقاتِ واجبہ یعنی ان لوگوں پر خرچ کرنا جو ایسا قرابتی حق رکھتے ہیں جیسے والدین، بیوی بچے، بہن بھائی، دادا دادی، نانا نانی، پوتے نواسے اور دوسرے صلبی و رحمی رشتے دار۔

2۔ زکوٰۃ جو بیت المال میں جمع ہو کر آگے مستحقین بشمل فقراء، مساکین، عاملینِ زکوٰۃ، نو مسلموں کی تالیفِ قلوب، غلاموں کو آزاد کرانے، قرضداروں کا قرض ادا کرانے، اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے اور مسافروں کی ضروریات پوری کرنے وغیرہ میں تقسیم ہو گی۔

3۔ رشتہ داروں کی کفالت اور ادائیگی زکوٰۃ کے علاوہ صدقات و خیرات کی شکل میں ناداروں اور حاجتمندوں کی مدد کرنا۔ سائل و محروم کی ایسی مدد کو قرآن مجید اہل ثروت پر یوں فرض کرتا ہے جیسے وراثت میں وارثین کو۔ گو اسے چھوڑا گیا ہے ہر اہل ثروت کی اپنی صوابدید پر۔ قرآن میں آیا:

”(بخل سے بچنے والے وہ ہیں) جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے“ (معارج:24-25) یعنی گو ہے تو صوابدیدی لیکن ہے ضروری جسے وہ خود طے کرتے ہیں۔

چونکہ سارے معاشی نظام کی بنیاد اس انفاق پر ہے جو انفرادی سطح سے شروع ہوتا ہے لہذا چند آیات ملاحظہ ہوں جو فرد کو انفاق پر آمادہ کرتی ہیں:

”تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کر دے۔ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے (بقرہ:245)۔

”دردناک سزا کی وعید سنا دو ان لوگوں کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی

جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ سو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو" (توبہ:33-36)۔

"اور لوگ پوچھتے ہیں ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو" (بقرہ:219)۔

کسی مسلمان کو پھر کھلی چھٹی نہیں کہ وہ حلال وحرام کی تمیز کئے بغیر کمائے یا خرچ کرے۔ اسے ان حدود کا پابند کیا گیا ہے جو معاشرے کی ترقی و بہبود اور پورے نظام کی صفائی وستھرائی کے لئے ضروری ہیں۔ ہم چند ایک حدود کا ذکر کرتے ہیں:

1۔ شراب، جوا، رشوت، فحاشی وبدکاری کے ذرائع آمدنی، ممنوعہ اشیاء کی خرید وفروخت، ناپ تول میں کمی، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا اور یوں معاشی استحصال کی راہ روک دی گئی۔

2۔ غیر شرعی مصارف، اسراف وفضول خرچی اور تنعم کی ممانعت۔ ضیاع کا اس قدر انسداد کہ اسلام کھانے والے کے لئے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ پلیٹ کو خوب صاف کرے، باقیات سے لتھڑا نہ چھوڑے۔

3۔ وراثت، وصیت، مہر اور طلاق کی صورت میں بیوی بچوں کے لئے مقررہ مدت تک نان ونفقہ وغیرہ کی ادائیگی، غرض یہ کہ سرمایہ چند ہاتھوں میں مجتمع نہ ہو اور یہ بھی کہ گردش میں رہے۔

اب کچھ ریاست کی ذمہ داریوں کا جائزہ لیجئے۔ ریاست کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بیت المال کے نظام کو اس کی پوری تفصیلات کے ساتھ جاری وساری رکھے۔ پوری اسلامی دنیا میں ایک فرد بھی ایسا نہ ہو کہ جو روٹی، کپڑا، مکان، سواری، علاج، تعلیم وغیرہ سے محروم رہے۔ نیز وہ معاشرہ میں کسب حرام کے تمام دروازے بند کرے، کسبِ حلال کی راہیں کشادہ کرے اور تعلیم وتربیت کے مواقع فراہم کر کے حصولِ روزگار آسان اور یقینی بنائے۔ خلافتِ وقت کی یہ بھی ذمہ داری کہ وہ لوگوں کو اللہ کے مقرر کردہ حقوق دلانے میں ان کی مدد کرے۔ کوئی بیٹا باپ کی کفالت سے انکار

کرے تو وہ قانوناً اسے کفالت کا پابند کرے۔ کوئی شوہر بیوی اور بال بچوں کے حقوق سے اعراض کرے تو انہیں ان کا حق بزور دلایا جائے۔ چوروں، ڈاکوؤں، رہزنوں، راشیوں، بدعنوانی کے مرتکبوں کو شرعی سزائیں دلوانے کا بسرعت انتظام کرے۔ نیز معاشی نظام کو اسلام کے دوسرے نظام ہائے زندگی سے ہم آہنگ کرے۔

یہ ہے اسلام کا معاشی نظام! ایسے جنت نشاں معاشرے کو جنم دیتا ہے جس میں کوئی ایک فرد بھی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے۔ جس کا کوئی کفیل نہ ہو اس کی کفالت کا بندوبست خلافتِ وقت کرے۔ کیا انسانیت کو ایسے نظام کی ضرورت نہیں؟ اسلام پر یلغار کرنے والے کیا انسانیت پر یلغار نہیں کرتے؟

حصولِ انصاف کا حق

انسان کی ایک بنیادی ضرورت ''حصولِ انصاف'' ہے۔ جس معاشرے میں انصاف ہوگا وہاں امن ہوگا، راحت وسکون ہوگا، خوشحالی ہوگی، امیر و مامور میں محبت و ہم آہنگی کا ماحول ہوگا اور سب سے بڑھ کر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوگا۔ اسلام نے انسان کے اس حق کو اتنی اہمیت دی ہے کہ انبیاء کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا مقصد ہی ''قیامِ انصاف'' قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں'' (حدید:25)۔

رسول اللہ ﷺ سے باہتمام اعلان کروایا گیا، فرمایا:

''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل قائم کروں'' (شوریٰ:15)۔

حصولِ عدل کا مقصد پورا نہیں ہوتا جب تک انصاف دینے والا نظام درج ذیل شرائط پر پورا نہ اترے:

1۔ عدل نہ صرف قائم ہو بلکہ اس کا پرچم بلند ہو۔ کسی قسم کا لالچ، دباؤ، خوف نفاذِ انصاف

کی راہ میں حائل نہ ہو۔

2۔ گواہی سچی اور ہر قسم کے لالچ، خوف، جانبداری سے پاک ہو خواہ اس کی زد خود گواہ پر، اس کے والدین اور دیگر اعزہ واقارب پر پڑتی ہو۔ سچی گواہی دی جائے خواہ اس کے نتیجہ میں بیٹے کو پھانسی سے دوچار ہونا پڑے۔

3۔ گواہی دیتے وقت فریقین کا مقام ومنصب، ان کی معاشی ومعاشرتی حیثیت کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ مقصد صرف اللہ کی رضا ہو۔

4۔ گواہی وانصاف کو اپنی ذاتی خواہشات سے آلودہ نہ کیا جائے۔

5۔ گواہی بے لاگ صریح اور واضح ہو۔ ذومعنی، لگی لپٹی اور لاٹھی بھی بچ جائے اور سانپ بھی مرجائے جیسی پالیسی سے پاک ہو۔

ملاحظہ ہو اسلام ان شرائط کو کیسے احسن اور بھرپور انداز سے پورا کرتا ہے۔ قرآنِ مجید میں آیا:

''اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار اور اللہ واسطے کے گواہ بنو۔ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑے۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اس کا خیر خواہ ہے کہ تم اس کا لحاظ کرو۔ اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے'' (نساء:135)۔

قربان جائیں اس دین پر جو یہ بھی یقینی بناتا ہے کہ کسی دشمن کی دشمنی بھی انصاف دہی کی راہ میں حائل نہ ہو۔ فرمایا گیا:

''کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا پرستی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے'' (مائدہ:8)۔

اسی آیت کی روشنی میں حضرت عمرؓ نے اپنے قاضیوں کو ہدایات جاری کیں۔ فرمایا:

''دو آدمیوں کے درمیان ایسی حالت میں فیصلہ نہ کرو کہ تم غصہ میں ہو''۔

اسلام بدلہ لینے کا حق تو دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

''جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ''۔ (مائدہ:45)۔

لیکن مضروب کو یہ ترغیب بھی دیتا ہے کہ اگر وہ معاف کر دے تو یہ بڑے دل گُردے اور صبر کا کام ہے۔ قرآن میں آیا:

''نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی ہے وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں۔ اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیب والے ہوتے ہیں'' (حٰم سجدہ:34-35)۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا:

''اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم وزیادتی سے منع کرتا ہے'' (نحل:90)۔

یعنی اگر کوئی بدلہ لینے کی بجائے معاف کر دے تو یہ ''احسان'' ہے۔ لیکن یہ احسان اس کا ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے ورنہ عدلیہ تو استغاثہ پیش ہونے پر عدل ہی کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہے۔ امامِ عادل تو ہوتا ہی وہ ہے جو عدل سے سرِ مو ادھر ادھر نہ ہٹے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعریف کی ہے۔ فرمایا:

''امامِ عادل کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے'' (مسند احمد)۔

یہ ہے اسلام کا عدلِ اجتماعی! انسانیت کو کیا ایسے عدل کی ضرورت نہیں؟ اسلام کے مخالفین کچھ تو سمجھ کریں۔

تنظیم سازی کا حق

اسلام تعمیر و اصلاح کا دین ہے۔تخریب و فساد کا قلع قمع کرتا ہے۔جس طرح ایک باغ اپنی ہستی اور خوبصورتی کو قائم اسی صورت میں رکھ سکتا ہے کہ کوئی مالی اس کی دیکھ بھال، کانٹ چھانٹ اور پرورش و پرداخت پر معمور ہو اسی طرح کوئی گھر، کوئی معاشرہ اور خود انسانیت اپنے وجود اور شان کو قائم نہیں رکھ سکتی اگر کوئی نگران اور گروہ اس کو بگاڑ سے بچانے اور سنوار کر رکھنے پر معمور نہ ہو۔اسلام نے بگاڑ سے بچانے اور سنوار کر رکھنے، تعمیر کرنے اور تخرب سے روکنے کے لئے ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' جیسے کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کی خاص اصطلاح استعمال کی ہے۔عام اس کا مطلب نیکی کو فروغ دینے اور برائی کا قلع قمع کرنے کے لئے جاتا ہے لیکن ظاہر ہے نیکی کو فروغ دینا اور بدی کا قلع قمع کرنا خود ہی معنی رکھتا ہے کہ سنوار کر رکھا جائے اور بگاڑ سے بچا جائے۔یہ کام انفرادی سطح پر بھی کرنے کا ہے' معاشرتی سطح پر بھی اور عالمی سطح پر بھی۔معاشرتی اور عالمی سطح پر ظاہر ہے یہ کام ایک ٹیم، ایک تنظیم اور بالآخر امت کی سطح پر ہی ہو سکتا ہے۔چنانچہ فرد کو بھی اس کا پابند بنایا۔مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے اور اے نبی ان مومنوں کو بشارت دے دو'' (توبہ:112)۔

معاشرے کی سطح پر ایک ایسی جماعت کا ہونا ضروری قرار دیا جو یہی کام کرے۔فرمایا:

''تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم اور برائیوں سے روکتی رہے۔جو لوگ یہ کام کریں وہی فلاح پائیں گے'' (آلِ عمران:104)۔

یعنی اصلاح و فلاح کی تنظیموں کا ہونا لازمی قرار دیا۔چنانچہ یہی کام عالمی سطح پر کرنے کے لئے پوری امتِ مسلمہ کو ذمہ دار قرار دیا۔فرمایا:

''(اے امتِ مسلمہ!) اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے

ہو‘‘ (آلِ عمران:110)۔

مل جل کر اصلاحی وفلاحی کام کرنے والی تنظیموں کے ہونے کو نبیٔ کائنات ﷺ نے بھی لازمی قرار دیا جب فرمایا:

’’جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ جو شخص جماعت سے علیحدہ ہوا وہ تنہا رہ کر دوزخ میں گیا‘‘ (ترمذی)۔

آپ ﷺ نے جماعت ہونے کے ساتھ اس میں نظم وضبط کی بھی تاکید کی۔ فرمایا:

’’جب تین آدمی سفر پر نکلیں تو اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں‘‘ (ابوداوٗد)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کس کو فکر ہے دنیا والوں کو سنوار کر رکھنے اور بگاڑ سے بچانے کی؟ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ طریقِ زندگی یعنی اسلام کو۔ اسلام پر حملہ آور ہونے والے کیا ایسی اصلاح و فلاح نہیں چاہتے؟

معصیت سے اجتناب کا حق

اسلام کا یہ منفرد اعزاز کہ اس نے اپنے ہر شہری کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ایسے حکم کی تعمیل سے انکار کردے جس سے معصیت کا ارتکاب ہوتا ہو۔ ایسا انکار اسلامی قانون کی نگاہ میں کوئی جرم نہیں بلکہ مجرم قرار پائے گی تو وہ اتھارٹی جو ایسا حکم دیتی ہے۔ ایسے میں بوقت ضرورت عدالت سے رجوع کیا جاسکتا ہے جو نہ صرف اطاعت سے انکار کرنے والے کو تحفظ مہیا کرے گی بلکہ معصیت کا حکم کرنے والوں کو سزا بھی دے گی۔ حدیث میں آیا:

’’امراء کی اطاعت واجب ہے جب تک کہ اللہ و رسول ﷺ کی نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے، جب اللہ ورسول ﷺ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے نہ ماننا‘‘ (بخاری)۔

قرآن مجید میں اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اور تحت اولی الامر (صاحبِ امر حضرات) کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی اسلام کا نظامِ اطاعت محض اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت سے مکمل نہیں ہوتا جب تک اولی الامر کی اطاعت شامل نہ ہو۔ البتہ وہی بات اولی الامر کی

اطاعت مشروط ہے اس بات سے کہ وہ خود اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت میں ہوں۔ قرآن میں آیا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع (اختلاف) ہو جائے تو اسے اللہ و رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقۂ کار ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہے'' (نساء:59)۔

یہ ہے اسلام! کیا اسلام کے مخالفین کو ایسی آزادیٔ عمل کی ضرورت نہیں؟

سیاسی زندگی میں شرکت کا حق

انسانیت کی ایک اور اہم ضرورت ہے کہ اجتماعی معاملات طے کرنے میں ہر کس و ناکس کو شمولیت کا حق ہو۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

''اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں'' (شوریٰ:38)۔

البتہ جیسے کہ ایک عمارت کی تعمیر میں متعلقہ انجینئیر وں اور ماہرین سے مشورہ لینا ہی سود مند ہوتا ہے، کارِ خلافت چلانے کے لئے اگر کبھی قرآن و سنت سے براہِ راست کوئی نص نہ ملے تو خلیفۃ المسلین کو مشورہ ارکانِ شوریٰ سے لینا ہوتا ہے جو پوری امت کے اسی طرح معتمد نمائندے ہوتے ہیں جس طرح کہ خود خلیفۃ المسلمین۔ ان حضرات کو ان کی اہلیت کی بنا پر آگے لایا جاتا ہے جو قرآنی معیارِ اہلیت کے مطابق پانچ اوصاف یعنی ایمان (نور:55)، تقویٰ (حجرات:13) صلاح (نور:55)، علم اور جسم (بقرہ:247) پر مشتمل ہے۔ ارکانِ شوریٰ ہوں یا اور عہدے دار اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ ان پر صرف اہل حضرات کو تعینات کیا جائے۔ قرآن میں آیا:

''مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت (بشمول عہدے) اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے'' (نساء:58)۔

مطلب یہ کہ سیاسی زندگی میں شرکت کا حق تو اسلام ہر کس و ناکس کو دیتا ہے لیکن ایسے

معتمد نمائندوں کے ذریعہ سے جو قرآنی معیارِ اہلیت پر پورے اترتے ہوں۔ یاد رہے آج کی رواں دواں جمہوریت میں ''سرمایہ'' ہی عوامی نمائندوں کے انتخاب میں واحد اہلیت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اسلام ایک تو ''سرمائے'' کو معیار اہلیت ہی قرار نہیں دیتا، ایک محنت کش اور دور دراز کا دیہاتی بھی معتمد نمائندہ چنا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ قرآنی معیارِ اہلیت پر پورا اترتا ہو۔ دوسرے اسلام میں کسی بھی عہدے کے لئے کوئی بطور امیدوار کھڑا ہو کر عہدہ حاصل کرنے کی تگ و دو نہیں کرسکتا۔ اسلام کسی بھی شہری کو ووٹ کا محتاج بناتا ہی نہیں اس لئے کہ محتاجِ ووٹ ہی سب خرابیوں کی جڑ ہے۔ رسول ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''نہیں دیتے ہم عہدہ اسے جو اسے مانگتا اور تانکتا پھرے'' (بخاری و مسلم)۔

اسلام ہر کس و ناکس کو ایک اور ذریعہ سے سیاسی زندگی میں شرکت کا حق دیتا ہے اور وہ ہے بطورِ محتسب۔ اسلام میں مروجہ متحارب حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا کوئی وجود نہیں۔ صاحبِ اقتدار لوگ تو حزبِ اقتدار ہوتے ہی ہیں باقی ساری امت حزب اختلاف ہوتی ہے۔ کوئی بھی شہری خود خلیفۃ المسلمین کا احتساب کرسکتا ہے، دامن پکڑ کر یا بذریعہ عدالت۔ اس کے لئے اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ خلیفۃ المسلمین روز و شب کے چوبیس گھنٹوں میں کم از کم پانچ دفعہ خود دارالخلافہ کی مرکزی مسجد میں حاضر ہو اور امامت کرے۔ یہ بھی اسلام کا اعزاز کہ وہ سائلوں اور درخواست گذاروں کو زحمت نہیں دیتا کہ وہ حکمرانوں کے پاس جائیں بلکہ حکمرانوں کو کم از کم پانچ اوقات میں لوگوں کے درمیان لاتا ہے اور وہ بھی ایک پاکیزہ اور خداترس ماحول میں۔

یہ ہے اسلام! ہر کس و ناکس کو سیاسی زندگی میں بھرپور شرکت کا حق دینے والا۔ اصل میں اسلام کی مخالفت کرنے والے نہ صرف پوری انسانیت کی بلکہ بالواسطہ خود اپنی مخالفت کرتے ہیں، اکثر و بیشتر انجان پن میں۔

آزادیٔ نقل و حرکت اور سکونت کا حق

اسلام اپنے ہر شہری کو نہ صرف اپنی مرضی کی جگہ آنے جانے اور وہاں سکونت اختیار کرنے

کی اجازت دیتا ہے بلکہ ایسا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا:

''تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے اللہ کے احکامات وہدایات کو جھٹلایا'' (آلِ عمران: 137)۔

بوقتِ ضرورت ہجرت کرنے کی ترغیب دی۔ فرمایا:

''جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا۔ اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے پھر راستے ہی میں اسے موت آجائے، اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ اللہ بہت بخشنے والا اور رحیم ہے'' (نساء: 100)۔

کسی جگہ پر اگر رواں دواں نظام ایسا ہو کہ وہ کسی کو اسلامی زندگی گزارنے کی راہ میں حائل ہو تو ایسی جگہ سے کسی ایسی جگہ پر ہجرت کرنا کہ جہاں اسلامی زندگی گزارنا ممکن ہو لازم قرار دے دیا بلکہ ایسے میں ہجرت نہ کرنا خود پر ظلم قرار دیا۔ قرآن میں آیا:

''جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہیں ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانہ ہے'' (نساء: 97)۔

اس آیۂ مبارکہ سے یہ بھی ماخوذ ہوتا ہے کہ ایسی جگہ جہاں پر اسلامی زندگی گزارنے کے زیادہ مواقع ہوں کو چھوڑ کر ایسی جگہ پر جانا کہ جہاں مقابلۃً مواقع کم ہوں نہ صرف ممنوع بلکہ خود پر ظلم کرنا ہے۔ یہی وہ ایک شکل ہے جو من مرضی کی جگہ جانے کی اجازت نہیں دیتی اور یہ بھی اس لئے کہ ایسی صورت میں ایک مسلمان اپنے آپ پر خود ظلم کرتا ہے۔ البتہ یہ بھی کہ ایسی جگہ پر بغرضِ تعلیم، علاج، تبلیغ جانے اور مقصد حاصل ہوتے ہی اولین فرصت میں واپسی کی اجازت ہے۔ جس خوبصورت انداز سے اسلام دنیا بھر میں نقل و حرکت اور سکونت کی اجازت دیتا ہے، اسلام کے

مخالفین کو کیا ایسی انسانی ضرورت کے پورا ہونے کے حق میں نہیں؟

اجرت اور معاوضہ کا حق

آج کی دنیا میں آجر واجیر، مالک ومزدور کے درمیان اکثر و بیشتر کشیدگی کی صورت پائی جاتی ہے۔جن وجوہات کی بنا پر ایسی صورتِ حال پیدا ہوتی' ہڑتالوں اور تالہ بندیوں تک نوبت آئی ہے' اسلام ان میں سے ایک ایک کا مداوا کرتا ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ پیشۂ مزدوری کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔کئی معاشروں میں تو ان سے جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔اسلام نہ صرف ایسی ذہنیت کا سخت مخالف ہے بالخصوص وہ ہاتھ سے کمائی کرنے والے کو عزت بخشتا ہے۔نبیٔ کائنات ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''ہاتھ سے کمائی کرنے والا اللہ کا محبوب ہے''

اسلام میں، جیسے کہ پہلے ذکر ہوا رنگ، نسل، زبان، علاقہ، عہدہ وغیرہ معیارِ فضیلت نہیں' ادنیٰ واعلیٰ ہونے کا معیار صرف تقویٰ ہے۔

دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ کارکن کا استحصال کرتے ہوئے اس سے طے شدہ قرارداد سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔اسلام نے اس رجحان کا سختی سے قلع قمع کیا ہے۔فرمایا:

''ہم کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے...''(مومنون:62)۔

اسی بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''مزدوروں کو معروف کے مطابق مناسب غذا اور لباس دیا جائے اور ان پر کام کا اتنا ہی بار ڈالا جائے جتنا کہ وہ برداشت کر سکتے ہوں''(موطا امام مالک)۔

یعنی اس حدیث پاک میں یہ بھی تاکید کی گئی کہ کارکن کو مناسب معاوضہ دیا جائے اس لیئے کہ معاوضے کا پہلو بھی اکثر مالک ومزدور میں نزاع کا باعث بنا رہتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ مزدور کو مزدوری کی ادائیگی میں تاخیر کی جاتی ہے۔اس بارے میں اسلام نے جو سنہری اصول دیئے ان میں سے محض ایک اصول صنعت وحرفت کے پورے

نظام کو رحمت و شفقت کا مظہر بنا دیتا ہے۔ فرمایا:

''مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کی جائے'' (بیہقی، ابن ماجہ)۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''مزدور کی اجرت طے کئے بغیر اسے کام پر نہ لگایا جائے'' (بیہقی)۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن میں تین آدمیوں کا دشمن ہونگا۔ ایک وہ جس نے میرا نام لے کر عہد کیا اور اس سے پھر گیا۔ دوسرا وہ جس نے آزاد کو بیچ کر اس کا مول کھایا اور تیسرا وہ جس نے مزدور سے پوری محنت لی اور پھر اس کی اجرت ادا نہ کی'' (بخاری)۔

ایک اور پہلو جو مالک و مزدور میں نزاع کا باعث بن جاتا ہے یہ ہوتا ہے کہ مزدور مزدوری تو لینے کے درپے ہوتا ہے لیکن کام کرنے میں ڈنڈی مارتا ہے یعنی کام چور ہوتا ہے۔ اسلام نے اس ذہنیت کا بھی نوٹس لیا ہے۔ فرمایا:

''اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا'' (نجم:39-41)۔

یعنی معاملہ صرف اس دنیا تک محدود نہیں۔ واسطہ اس ہستی سے ہے جو اندرونِ دل اور نیتوں تک کو جاننے والا ہے۔ جان بوجھ کر کام میں ڈنڈی مارنے والے کو اپنے ہر عمل کا حساب ایک دن بھگتنا ہے۔

ایک اور وجہ جو آجر اور اجیر کے مابین اکثر کشیدگی و نفرت کا باعث بنتی ہے وہ ہے آجر کی بالادستی (High handedness) اور اجیر کا گستاخانہ رویہ (Rudeness) اسلام ان امراض کا مجموعی زندگی میں مداوا کرتا ہے۔ فرمایا:

''ایک میٹھا بول اور غلطی معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے''۔ (بقرہ:263)۔

قرآن مجید بڑے پیار سے رسول اللہ ﷺ کی ایک صفت کو بیان کرتا ہے۔ فرمایا:

”(اے پیغمبر!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ان کی غلطیوں سے درگزر کرو۔ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور معاملات میں ان کو بھی شریکِ مشورہ کرو...“(بقرہ:159)۔

دنیا میں اسلام کے علاوہ کیا کوئی دوسرا نظام ایسا ہے جو آجر و آجیر کے مابین اس قدر خیر خواہی' الفت اور جذبۂ محبت پیدا کرے؟ کیا اسلام کی مخالفت کرنے والوں کو ایسے مبارک نظام کی ضرورت نہیں؟ کس قدر نادانی اسلام پر یلغار کرنے والوں کی!

خلاصۂ کلام و چند شبہات اور ان کی وضاحت

اسلام کیا ہے؟ انسانیت کی بھلائی' خیر خواہی اور بہتری کا دوسرا نام اسلام ہے۔مثال کے طور پر اسلام کا صرف یہ مطالبہ ہی نہیں کہ صاف ستھرے رہو بلکہ اس کے نزدیک صفائی نصف ایمان ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ صفائی کیا انسانیت کی ضرورت نہیں؟ کیا انسان کو غلیظ رہنا چاہئے؟ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ حلال کمائی کرو۔ناجائز ذرائع سے یا کسی کو دھوکا فریب دے کر یا کسی دوسرے کے نقصان پر خود فائدہ حاصل نہ کرو۔ذخیرہ اندوزی مت کرو یعنی مال کو اس لئے نہ روکو کہ مہنگا ہوگا تو دوگنے کمائیں گے۔ملاوٹ، سمگلنگ، رشوت، بدعنوانی، کام چوری وغیرہ یعنی ہر وہ روش جس سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو اسلام اسے ناجائز اور گناہ قرار دیتا ہے۔کیا رزق حلال کے متعلق یہ تعلیمات انسانیت کے حق میں سراپا رحمت نہیں؟ اسلام سچائی کے ساتھ معاملہ کرنے والے تاجر کو قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کا ساتھی قرار دیتا ہے تو کیا یہ امانت دارانہ تجارت انسانیت ہی کی بھلائی کے لئے نہیں؟ اسلام کا مطالبہ ہے کہ کوئی شخص' کسی دوسرے پر ظلم نہ کرے۔یہاں تک فرمایا کہ ”جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین ظلماً لے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق اس کی گردن میں ڈالے گا۔ظلم کا قلع قمع کرنا کیا انسانیت کے حق میں مفید نہیں؟ اسلام کی ہدایت یہ بھی ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے

سے پہلے ادا کرو۔ یقین جانیں اگر پوری انسانیت اس ایک اصول کی پابندی کرتی تو سرمائے اور محنت کے درمیان آج جو گمبھیر مسائل پیدا ہو چکے ہیں کبھی پیدا نہ ہوتے۔ اسلام کی یہ بھی تعلیم ہے کہ ضرورت سے زائد پانی نہ روکو یعنی اپنا حصہ تو ضرور لو لیکن دوسروں کا حصہ ان کو دو۔ اسلام کا یہ بھی سنہری اصول ہے کہ جو کچھ تم اپنے لئے پسند کرو، اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرو۔ جنت نشاں بن جائے یہ دنیا اگر اس بے مثل اصول پر پوری انسانیت عمل پیرا ہو۔ اسلام کا یہ بھی قانون ہے کہ مرنے والے کی جائیداد، اس کے وارثوں میں، مرد ہوں یا عورتیں، تقسیم کرو۔ پھر اسلام اس تقسیم کو یوں متناسب و متوازن بناتا ہے کہ معاشرے میں جتنا کسی پر زیادہ بوجھ ہے اتنا ہی وراثت میں اسے زیادہ حصہ دیا گیا ہے۔ ورثاء کو یوں اپنا اپنا مقرر حصہ و حق کا حصول کیا انسانی فلاح کا ضامن نہیں؟ اسلام سود کو حرام قرار دیتا ہے۔ دیکھیئے اسلام کی اس ایک تعلیم سے انحراف نے آج پوری دنیا کو عالمی سودی نظام کی شکل میں جسقدر تباہی کے دہانے لا کھڑا کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اسلام رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں پر لعنت بھیجتا ہے تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ رشوت کا دھندہ انسانیت کے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہے؟

اسلام نکاح کی ترغیب و تاکید اور زنا کی قطعاً ممانعت کرتا ہے۔ مغربی دنیا اس کے برعکس اگر آج عمل پیرا ہے تو خود محسوس کر رہی ہے کہ یہ ایک گمراہی شاید اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔ انسانی رشتوں کا تقدس ماضی کی داستاں بن چکا ہے۔ گھر ویران ہو گئے۔ خاندانی یونٹ کا شیرازہ بکھر گیا۔ بظاہر انسان لیکن گرے تو اس حد تک کہ بلیوں اور کتوں سے دل بہلانے لگے۔ پھر یہ بھی اسلامی ہدایت ہے کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اس ہدایت سے بھی مغرب والوں نے روگردانی کی تو آج بڑی عمر والے ''معمر خانوں'' میں مقید اپنی اپنی اولاد کا منہ دیکھنے کو ترس گئے۔ اسلام کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ ہر زیردست و ماتحت یعنی نوکر' خادم وغیرہ سے شفقت سے پیش آؤ تو کیا ایسا کرنا انسانیت کے حق میں نہیں؟ اسلامی امت کا ایک فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ اپنے ہاں کفالتِ عامہ کا نظام رائج کرے یعنی ہر معذور' بے روزگار' بے سہارا وغیرہ کا وظیفہ مقرر کرے تو

کیا ایسا پروگرام انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن نہیں؟ سلام کا یہ بھی دستور ہے کہ ہر اس فرد کی طرف جو گردشِ دوراں کا شکار ہو گیا ہو مثلاً بیوہ ہو یا بے سہارا بیٹی‘ مسکین ہو یا یتیم‘ مسافر ہو یا قیدی دستِ تعاون بڑھاؤ۔ سائل و محروم کو تو کھاتے پیتے لوگوں کا شریکِ دولت بنا دیا۔ دنیا بھر کے اقتصادیات کے ماہرین اگر صرف اسلام کے نظامِ زکوٰۃ کا تجزیہ کریں تو مانے بغیر نہ رہیں کہ کتنا برکتوں اور سعادتوں بھرا ہے یہ نظامِ بے بدل۔ والدین‘ اولاد‘ رشتے داروں‘ استاد‘ شاگرد‘ آجر‘ مزدور‘ میاں بیوی کے حقوق کی فہرست دی تو لمبی چوڑی۔ کیا ایسا نظام انسانیت ہی کے حق میں سراپا رحمت نہیں؟

اسلام ہی کی یہ تعلیمات ہیں کہ وقت کی پابندی کرو‘ عہد کا پاس کرو‘ سچ بولو‘ جھوٹ مت بولو‘ جھوٹی گواہی نہ دو‘ فریب و دھوکا دہی کے قریب نہ جاؤ‘ عجز و انکساری کا دامن تھامو‘ تکبر و غرور کو قریب نہ پھٹکنے دو‘ حق سے زیادہ کی حرص نہ کرو‘ عہدوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے نہ دیکھو‘ بے جا حمایت اور طرفداری نہ کرو‘ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو‘ چغل خوری اور غیبت سے پرہیز کرو‘ کسی کو گالی نہ بکو‘ نہ کسی کو برے القاب سے یاد کرو‘ کسی کی تحقیر نہ کرو‘ کم درجے والوں کا احترام کرو‘ بے جا تعریف نہ کرو‘ حسد سے بچو‘ بدنگاہی سے بچو‘ جذبات کا شکار نہ ہو‘ وقار اور سنجیدگی کا دامن تھامو‘ زبان کی حفاظت کرو‘ ایذا رسانی کا رویہ ممنوع‘ آشنا ہو یا ناآشنا جو سامنے آئے اسے سلام کرو‘ خیر خواہی و بھلائی کا وطیرہ اختیار کرو‘ علم حاصل کرو‘ جہالت سے بچو‘ جماعتی زندگی گزارو‘ ایک دوسرے کے ہمدرد و ساجھی بنو‘ ضبط و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے‘ نظم و ضبط کی پابندی کرو‘ امیر کی اطاعت لازم‘ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ عین۔ بتائیے ان احکامات میں سے کوئی ایک بھی ہے جو انسانیت کے حق میں سراپا خیر نہ ہو؟ اسلام کا تو یہ بھی طرۂ امتیاز ہے کہ وہ اِن اَحسن اوصاف و عادات کو ایک یا چند افراد تک محدود نہیں کرتا‘ لازمی قرار دیتا ہے کہ دنیا کے ہر فرد تک خواہ وہ کہیں ہمالہ پر ہی کیوں نہ ہو پہنچایا جائے تاکہ یہ پوری دنیا حسن و خوبی کا مرقع ہو۔

پھر دینِ حق.....اسلام شکرِ نعمت کی تعلیم دیتا ہے،صبر واستقامت کا درس دیتا ہے۔شرم و حیا کی تلقین کرتا ہے، عریانی و فحاشی کو انسانیت کے لئے تباہی و بربادی ٹھہراتا ہے۔ پردے کے مفصل قوانین دیتا ہے۔ انسانیت کو بے راہ روی سے روکنے کے لئے عبادات کا ایک جامع اور مستقل پروگرام دیتا ہے۔ اللہ پر بھروسے کی تلقین کرتا ہے۔ خدمت خلق، امن وسلامتی، حلم و بردباری کی تاکید کرتا ہے۔شراب' جوئے' سٹے وغیرہ کو حرام قرار دیتا ہے۔ جزاوسزا' جنت ودوزخ کا نظام وضع کر کے بندوبست کرتا ہے کہ ہرانسان اپنی خیر خواہی وفلاح کی خاطر مذکورہ احکامات کو اپنی زندگی میں نافذ کرے۔شتر بے مہار اور مادر پدر آزاد ہو کر من مانیاں نہ کرے۔

ایک طرف تو اس سے انکار ناممکن ہے کہ اسلام ہے ہی سچائیوں' بھلائیوں اور خیر خواہیوں کا دوسرا نام لیکن دوسری طرف اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دنیا کی ایک عظیم آبادی اسلام کے فیوض وبرکات سے محروم ہی نہیں بلکہ اس کی مخالف ہے۔سوال یہ ہے کہ آخر کیوں؟ تجزیہ کریں تو بات دواور دو چار کی طرح واضح ہے کہ سچائیوں کا حصول اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ انسان کچھ پابندیاں قبول کرے، کچھ قربانیاں دے اور کچھ مشقتیں جھیلے۔سڑک پر نصب کردہ ٹریفک کے اشارات یوں تو پابندیاں لگاتے ہیں لیکن ظاہر ہے منزلِ مقصود پر بہ حفاظت پہنچنے کے لئے ان کی پابندی کرنا ازبس ضروری ہے۔اس طرح پابندیاں قبول کرنا،قربانیاں دینا اور مشقتیں جھیلنا ہے تو انسانی فلاح و بہبود کا ضامن لیکن سہل پسند انسان ان سے حیلے بہانے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ٹریفک کے اشارات کی پابندی نہ کرنے کے نتائج تو خیر فوراً سامنے آجاتے ہیں لیکن اخلاقی اقدار کو ملیا میٹ کرنے کے نتائج آخرت میں تو یقیناً برآمد ہوں گے ہی' اس دنیا میں بھی برآمد ہو کر رہتے ہیں خواہ کچھ دیر کے بعد ہی کیوں نہ ہوں۔آج کی دنیا اگر ظلم وستم، انتشار وخلفشار، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، دوہرے معیار، نفسانفسی اور افراط وتفریط کا شکار ہے تو اس کی بنیادی وجہ انسانوں کی ایک عظیم اکثریت کا سچائیوں سے فرار ہے۔ایسے دانشور بھی آدھمکے ہیں جنہوں نے اسلام ہی کو متنازع اور حرفِ تنقید بنا دیا تاکہ فرار' فرار ہی نظر نہ آئے بالکل اسی طرح جس طرح کہ

کوئی غاصب اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لئے کئی جواز ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسے کوئی شرابی شراب پی کر جب احساسِ گناہ سے مغلوب ہونے لگتا ہے تو خود کو یہ کہہ کر اس احساس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے کہ ''چلو شراب ہی پی ہے کسی کا خون تو نہیں پیا''۔

اسلام کے چند ایسے پہلو کہ جنہیں ان دانشوروں نے ہدفِ تنقید ہی نہیں ہدفِ تحقیر و استہزاء بھی بنایا ہے کا ذیل میں ذکر اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان کی اصلیت سے آگاہی ہو۔ یعنی یہ وضاحتیں بس معترضین کے ایک خاص طبقہ کے لئے ہیں ورنہ ایک مسلمان کے لئے اللہ و رسول ﷺ کی طرف سے ثابت ہونے کے بعد کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

☆ تعددِ ازواج یعنی ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا۔

☆ مرد و عورت کے حقوق میں عدم مساوات۔

☆ اسلامی سزاؤں کا سخت ہونا۔

☆ جہاد فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستے میں مسلح جدوجہد۔

ذیل میں ان پہلوؤں میں سے ہر ایک کا ہم جائزہ لیتے ہیں یہ جاننے کے لئے کہ آیا زیر بحث و تنقید یہ پہلو انسانیت کے حق میں ہیں یا کہ مخالف۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان موضوعات کی طرف آئیں دو بنیادی باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام کا مرکزی تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو ملیا میٹ نہیں ہو جاتا بلکہ ایک ایسی زندگی میں داخل ہوتا ہے جس کا کوئی کنارا نہیں۔ اس دنیا میں کیئے گئے اس کے ہر فعل کو ریکارڈ کیا جا رہا ہے اور قیامت کے دن یہ ریکارڈ نکال لایا جائے گا یہ طے کرنے کے لئے کہ اس انسان کی نیکیاں زیادہ ہیں یا برائیاں؟ نیکیوں کا پلڑا جھک گیا تو اسے جنت نصیب ہوگی اور برائیوں کا پلڑا جھکا تو دوزخ اس کا مقدر ٹھہرے گا۔ دوسری بات جو نوٹ کرنے کے قابل ہے یہ ہے کہ اسلام کا یہ منفرد اعزاز ہے کہ وہ ہر فرد، مرد ہو یا عورت کو وراثت میں حصہ دار بناتا ہے اور وراثت کا یہ نظام ظاہر ہے تبھی چل سکتا ہے جب ہر فرد کی نسلی شناخت ہو یعنی یقینی پتہ ہو کہ اس کی ماں کون ہے اور باپ کون؟ اب تفصیل ملاحظہ ہو:

تعددِ ازواج

تعددِ ازواج (polygamy) کے بارے میں یہ ذہن میں رہے کہ اسلام نے اسے دنیا میں متعارف نہیں کرایا بلکہ اَن گنت معاشروں میں یہ پہلے سے موجود تھی۔ اسلام نے صرف اسے محدود و باقاعدہ کیا۔ اس میں سب سے بڑی جو بے قاعدگی موجود تھی وہ بیک وقت بیویوں کی تعداد میں کسی حد (Ceiling) کا نہ ہونا تھا۔ کھاتے پیتے حضرات سینکڑوں بلکہ ہزاروں بیویوں کی فوج ظفر موج اکٹھی کر لیتے تھے اور اس ہجومِ بے کنار کے لئے ایک خاص اصطلاح یعنی ''حرم'' کا چرچا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں عورت کی حیثیت ایک محترم و معزز انسان سے کم ہو کر صرف ایک قابلِ استعمال چیز (Commodity) کی رہ جاتی تھی۔ اسلام نے تعددِ ازواج پر پابندی لگائی اور اب کوئی ارب پتی مسلمان بھی کہ جس کی جائیداد دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہو بیک وقت چار بیویوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ تاہم ہمارا آج کا موضوع، صرف یہ ہے کہ یہ چار بیویاں بھی مشروع کیوں ہیں، ایک ہی کیوں نہیں؟

ابتدا ہی میں یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ دنیا میں کوئی معاشرہ خالص یک زوجگی (mono gamous) نہیں رہا اور نہ ہے۔ جس طرح اس دنیا کے کئی معاشروں نے رہبانیت اور بے زوجگی کا تجربہ کیا لیکن انجام کار فطرت سے اس انحراف کو نباہ نہ سکے بلکہ اکثر و بیشتر نے ازدواجی تعلقات کو عبادت ہی کا حصہ بنا دیا اسی طرح دعویٰ تو آج بھی کئی معاشرے یک زوجگی کا کرتے ہیں لیکن واقعات کی دنیا میں متعدد بیویوں کا کسی نہ کسی طور رستہ نکال لیا ہے۔ یہ عصمت فروشی (prostitution) زنا (adultry) اغوا (abduction) ورغلانا (seduction) عارضی شادی (temporary marriage) آزمائشی شادی (Trial marriage) محبت کی شادی (love marriage) مخلوط رہائش (mixed living) مشترکہ رہائش (cohabitation) ہمدردانہ شادی (compassionate marriage)، آخرِ ہفتہ آوارہ گردیاں (week-end wanderings) ساحلی عیاشیاں (beach

(picnics) ہم جنس شادیاں (one sex marriages) بعد از طلاق شادیاں (re marriages) آخر کس شرارت اور کس رجحان کا شاخسانہ ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب انسانی فطرت پر مصنوعی پابندیاں لگائی گئیں تو اس ایک سر اور دو ہاتھوں والے انسان نے کئی راستے خود نکال لیئے۔

اسلام جو دینِ فطرت ہے کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ وہ انسانوں کو بے قاعدگیوں، بے ہودگیوں اور بے راہ رویوں کے حوالے کر دیتا؟ اس نے اس بے ہنگم و بے قاعدہ ڈرامے کو با قاعدہ (systematize) کیا ہے۔ آپ اس بارے میں جتنا بھی سوچیں بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکیں گے کہ اسلام نے تعددِ ازواج کی اجازت دے کر اور اس اجازت کو ایک حد یعنی چار بیویوں تک محدود کر کے انسانیت کی بے مثل خدمت کی ہے۔

مذکورہ بالا بحث تو ہم نے محض انسانی سرشت کے حوالہ سے کی ہے لیکن واقعات کی دنیا میں اَن گنت ایسے عملی حقائق ہیں جن سے بہر حال اس دنیا کے مکینوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ چند ایسے حقائق، جن سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں، کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ گو پیدائش پر اس دنیا میں مردوں اور عورتوں کی تعداد پچاس پچاس فیصد ہوتی ہے لیکن چونکہ مرد حضرات اپنے فرائض کی نوعیت کے اعتبار سے سماوی بلاؤں اور حادثات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں لہٰذا وقت کے کسی بھی موڑ پر دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہمارے ہاں پاکستان میں مثال کے طور پر عورتوں کی تعداد 52 فیصد ہے تو مردوں کی 48 فیصد۔ اس طرح دنیا بھر میں عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد سے کروڑوں زیادہ ہے۔ لیکن اگر ایک کروڑ زائد بھی فرض کر لی جائے تو اس کا مطلب ہے کہ یک زوجگی کی صورت میں ایک کروڑ عورت کا یہ حق چھن جائے گا کہ وہ شوہر والی ہو۔ بتایئے اس سے بڑا ظلم کسی عورت پر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے تاحیات حقِ زوجیت سے محروم کر دیا جائے۔ وہ بے شوہر، بے اولاد اور بے گھر رہے۔ اگر تعدد ازواج کو ایک برائی فرض کر لیا جائے تو یہ بے

زوجگی تو اس سے کئی گنا بڑی برائی ہے۔ جنگِ عظیم اول و دوم میں جب عورتوں اور مردوں کا باہمی تناسب غیر معمولی طور پر درہم برہم ہو گیا یعنی مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلہ میں متعد بہ کم ہو گئی تو اس مسئلے کو جس طرح کئی غیر مسلم معاشروں نے حل کیا یا بے حل ہی رہنے دیا، انسانیت کے ماتھے پر وہ کلنک کے ٹیکے سے کم نہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ جنگ تو کبھی کسی ایک ملک میں ہوگئی یا نہ ہی ہوئی لیکن تعددِ ازواج کو ہمیشہ کے لئے ایک ضابطے کی حیثیت دے دینا کیا حماقت نہیں؟ یاد رہے اول تو کوئی جنگ کسی ایک ملک تک محدود نہیں رہتی اور اگر رہے بھی تو بین الاقوامی شادیوں کی اس دنیا میں ایک عام ریت ہے۔ پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آج کی دنیا کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور جنگ و جدل کی زد میں رہتا ہے۔ پھر مرد تو پائلٹ بھی ہوتے ہیں، ڈرائیور بھی، ملاح بھی، مزدور بھی، مکینک بھی اور فوجی جوان بھی' بتایئے بالعموم حادثات کا شکار مرد زیادہ ہوتے ہیں یا عورتیں؟

ایک اعتراض یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہر آدمی چار چار شادیاں کرے تو کیا اس صورت میں عورتوں کی کمی واقع نہیں ہو جائے گی؟ ایسا نہ ہونے کا ویسے تو یہی ثبوت کافی ہے کہ دنیا کی شماریات کا جائزہ لیں غیر مسلم دنیا کی تو بات درکنار، مسلم ممالک میں بھی باوجود چار بیویوں کی اجازت کے عورتوں کی تعداد اکثر و بیشتر مردوں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ دنیا میں 99.9 فیصد مسلمان ایسے ہیں کہ جو یک زوج ہیں۔ اصل میں دو، تین یا زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کی اجازت ہے، حکم نہیں اور یہ اجازت بھی غیر معمولی حالات کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہے ورنہ اس میں کیا شک ہے کہ یک زوج ہونا ایک بہت بڑی نعمت ہے (nothing like one wife)۔ عمل کی دنیا میں جتنا گھریلو سکون و راحت ایک بیوی سے ہوتا ہے، دو یا دو سے زیادہ سے نہیں ہوتا۔ کسی کو شک ہو تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔ تعدد ازواج کی صورت میں ویسے تو بے اعتمادی کی فضا کا ہونا ایک لازمی امر ہے، پھر اکثر و بیشتر اولاد کی باہمی چپقلش اور جائدادوں کے جھگڑے بسا اوقات بڑے ہولناک نتائج کو جنم دیتے ہیں۔

ایک اعتراض یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب (چار تک) متعدد بیویاں ہوں گی تو امکان اغلب ہے کہ شوہر کسی ایک بیوی کو دوسری پر ترجیح دے اور اس طرح دوسری بیوی / بیویوں کی حق تلفی بلکہ دل شکنی ہو۔ اجازت دینے والا اللہ اس جھول کو خوب جانتا تھا لہٰذا اس نے متعدد بیویوں کی اجازت غیر مشروط نہیں مشروط دی ہے اور اس بارے میں شرط ہے ہی یہ کہ ہر بیوی سے مساوی سلوک کیا جائے۔ قرآن میں آیا:

''اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو' تین تین' چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو'' (النساء:3)۔

بالفاظِ دیگر دو اور دو سے زیادہ بیویاں اور چار تک رکھنے کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ ہے۔ اگر کوئی عدل کی شرط پوری نہ کر سکے تو اس کے لئے تعدد ازواج کی اجازت ہے ہی نہیں۔ کوئی معترض یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ چلو اجازت مشروط سہی لیکن کوئی مرد اس اجازت سے ناجائز فائدہ بھی تو اٹھا سکتا ہے یعنی وہ دوسری شادی تو شرط قبول کرتے ہوئے کرتا ہے لیکن بعد میں شرط پر قائم نہیں رہتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی شوہر ایسا بھی کر سکتا ہے لیکن اگر وہ ایسا کرے تو اسلام کی نگاہ میں اسی طرح گناہگار اور مجرم ہے جیسے کہ وہ کوئی اور گناہ کرے۔ گناہ کے مرتکب کو تو بہر حال روزِ محشر احتساب کی چھلنی سے گزرنا ہے وہ کسی طور اپنے کیئے کی سزا سے بچ نہیں سکتا۔ تاہم اسلام ایسے شخص کی گرفت کو صرف آخرت میں ہی یقینی نہیں بناتا اس دنیا میں اسلامی حکومت کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف کرنے سے قاصر رہا ہو ان کی دادرسی کرے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو شخص تعدد ازواج کی سہولت کو غلط استعمال کر سکتا ہے وہ تو یک زوجگی کو بھی غلط استعمال کر سکتا ہے۔ کیا دنیا میں ایسے انسانوں کا وجود نہیں کہ جو طلاق پر طلاق دے کر نت نئی شادیاں کرتے ہیں؟ تاریخ میں ایسے ایسے یک زوج بھی پائے گئے ہیں کہ جنہوں نے سو سو تک شادیاں کیں۔

انسانوں کی دوسری ضرورت جس کے لئے تعدد ازواج کی سہولت ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوسکتی ہے وہ صورت ہے کہ جب بیوی بانجھ ہو، بیمار ہو یا مجذوب وغیرہ ہو۔ ایسے میں ایک شخص کو مجبور و محدود رکھنا کہ وہ دوسری شادی نہ کرے ظاہر ہے اسے ایک بڑے انسانی حق سے محروم رکھنا ہے۔ فطرت کے خلاف لڑنے کے عادی معاشرے تو شاید اس حق کو غصب ہونے دیں لیکن اللہ کی دی ہوئی شریعت یہ برداشت کرے تو کیسے؟

آخر میں ہم ایک اور اعتراض کا جائزہ لینا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کوئی شریر یہ اعتراض بھی تو کرسکتا ہے کہ جب شوہر کو چار تک متعدد بیویاں رکھنے کی اجازت ہے تو بیوی کو ایسی اجازت کیوں نہیں کہ وہ متعدد شوہر (polyandry) رکھے؟ بظاہر یہ اعتراض ذہن کو بڑا اپیل کرتا ہے۔ لیکن ذرا گہرائی میں جائیں تو اس حماقت کا بھید کھل جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اسلام کا یہ منفرد پہلو کہ وہ مرد ہو یا عورت کسی کو وراثت سے محروم نہیں کرتا۔ قرآن میں آیا:

''مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔ تھوڑا ہو یا بہت حصہ (ہر دو کا) بہر حال ہے'' (النساء: 7)۔

لاریب، وراثت کا یہ نظام تبھی روبہ عمل ہوسکتا ہے جب کہ ہر فرد، مرد و عورت کا نسلی تشخص ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہو یعنی روز روشن کی طرح واضح اور مسلمہ ہو کہ اس کا باپ فلاں ہے اور ماں فلاں۔ اس میں بھی کیا شک کہ متعدد شوہروں کی صورت میں یہ نسلی تشخص مشکوک و مبہم ہی نہیں کلیۃً درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ متعدد شوہروں میں سے ہر ایک کی یہ حتمی کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ہوسکے اولاد کا بوجھ اس کی بجائے، کسی دوسرے شوہر پر پڑے۔ یہی نہیں بلکہ ہر شوہر کی کوشش وخواہش ہوگی کہ گھریلو اخراجات اسے کم سے کم برداشت کرنے پڑیں۔ شاید یہاں تک نوبت آجائے کہ بیوی کو ان شوہروں کے نرغے سے نکل کر اور خود کما کر اولاد کا پیٹ پالنا پڑے۔ اسلام تو بیوی اور اولاد کے نان ونفقہ کا ذمے دار مرد کو قرار دیتا ہے لیکن متعدد شوہروں والے گھر میں

صورتِ حال بالکل اس کے برعکس ہو جائے گی۔ زیرِ آسماں شاید ظلم کی اس سے بڑی انتہا کوئی نہ ہو۔ تجربہ شاہد، فطری نظم میں انسانی مداخلت ہوئی تو بدنظمی، بے چینی، بے سکونی، بربادی وتباہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

اصل میں کئی معاشروں میں شروع سے متعدد شوہروں کا رواج رہا ہے لیکن بتدریج گھٹتا گیا اور آج نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ خود اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ روش اور طریقِ تہذیب و تمدن ہے ہی ناقابلِ عمل۔ بھلا ہو اسلام کا دنیا والے تو تجربات کر کے اس نتیجے پر پہنچے لیکن اسلام نے اول روز ہی سے اس کی نشاندہی کر دی۔ کیوں نہ انسانیت ممنونِ احسان ہو اسلام کی؟

مرد وعورت کے حقوق میں عدم مساوات

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اسلام نے راعی ورعیت، آجر ومزدور، سرمایہ ومحنت، یتیم و بیوہ، معذور ومحروم، مسافر وقیدی وغیرہ میں سے ہر ایک کے حقوق کی پاسداری کی ہے۔ ایسے میں یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ عورت اور مرد میں سے ہر ایک کے حقوق کا منصفانہ تعین نہ کرتا۔ ان کے مابین انصاف ہی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے تو اسلام کا یہ منفرد کردار ہے کہ اس نے مرد وعورت دونوں کو وراثت میں حصہ دار بنا دیا۔ اصل میں سطح بیں لوگوں کو ان کے حقوق کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی یا کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں اور عورت کی شخصیت کے بھی۔ جس طرح مرد کی ایک حیثیت انسان کی ہے اور دوسری باپ، شوہر، بیٹے وغیرہ کی اسی طرح عورت کی بھی ایک حیثیت انسان کی ہے اور دوسری ماں، بیوی اور بیٹی وغیرہ کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بطور انسان باپ اور بیٹے کے حقوق یکساں ہیں لیکن کوئی بالکل پاگل نہ ہو گیا ہو ورنہ سوچے گا بھی نہیں کہ بطور باپ کے حقوق بھی وہی ہوں جو بیٹے کے۔ گھریلو نظام میں ہی اگر، آپ باپ اور بیٹے کے حقوق ایک جیسے کر دیں، گھر تباہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اس میں کوئی شک نہیں کہ بطور انسان میاں بیوی کی حیثیت میں رتی بھر فرق نہیں۔ ایسا نہیں کہ کوئی شوہر نیکی کرے تو اسے دوہرا اجر ملے اور وہی نیکی بیوی کرے تو اسے اکہرہ اجر۔ البتہ گھریلو نظام میں جیسے باپ اور

بیٹے کے حقوق یکساں نہیں ہو سکتے، میاں بیوی کے حقوق بھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ جیسے کہ دفتر یا کوئی اور ایسا ادارہ عمل کی دنیا میں چند دن نہیں چل سکتا جس کے یکساں اختیارات کے دو انچارج ہوں۔ بالکل اسی طرح ایسے گھر کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا جس میں شوہر اور بیوی یکساں حقوق کے دعوے دار ہوں۔ مغربی دنیا نے ایسا تجربہ کرنے کی کوشش کی لیکن نتائج جو اس تجربے سے برآمد ہوئے تو یہ کہ وہاں گھر کا وجود برائے نام ہو کر رہ گیا۔ یاد رہے گھر معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ بالفاظِ دیگر متعدد گھر مل کر معاشرے کو جنم دیتے ہیں اور متعدد معاشرے ملیں تو قوم بنتی ہے اور متعدد اقوام باہم ملیں تو انسانیت معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اگر گھر یا بنیادی اکائی کا ادارہ درہم برہم ہو جائے تو انجام کار پوری انسانیت کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ گھر کی بے سکونی بالآخر پوری انسانیت کو بے سکون کر دیتی ہے جیسے کہ آج پوری انسانیت بے سکون ہے۔ وقت کے اس موڑ پر مغربی دنیا کی بالادستی نے اس بے سکونی کے عمل کو یقینی ہی نہیں تیز تر کر دیا ہے۔

اسلام اسی لئے تو دینِ فطرت ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی فطری جگہ پر رکھتا ہے اسے یہ قطعاً گوارا نہیں کہ کوئی چیز اپنی فطرت سے تجاوز کرے۔ گھریلو نظام میں شوہر، بیوی، بیٹے اور بیٹیوں وغیرہ کا اپنا اپنا ایک مقام تو بطورِ انسان ہے۔ اس حیثیت میں اسلام مرد اور عورت ہر دو کو مساوی حقوق دیتا ہے۔ گھر میں اہلِ خانہ کی دوسری حیثیت بطورِ شوہر، بیوی، بیٹیوں اور بیٹوں کی ہے۔ ان حیثیتوں میں اسلام انہیں مختلف حقوق دیتا ہے، ایک جیسے ہرگز نہیں۔ اصل میں ایسا کرنا گھر کے ادارے کی پیش رفت کے لئے از بس ضروری ہے۔ ثبوت اس کا یہی ہے کہ اسلامی ممالک میں گھر کا ادارہ آج بھی کامیابی سے رواں دواں ہے جب کہ گھریلو نظام کی تباہی نے مغربی دنیا کو کتوں اور بلیوں کی قوم بنا دیا ہے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ غیر اسلامی معاشرے مرد و زن کے حقوق کے بارے میں ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں یعنی کچھ معاشرے تو ایسے ہیں کہ جنہوں نے مرد و عورت کو بطورِ

انسان بھی مساوی حقوق نہیں دیئے اور کچھ دوسرے غیر اسلامی معاشرے اس حد تک آگے چلے گئے کہ، جیسا اوپر ذکر ہوا، انہوں نے مرد وزن کو بطور میاں بیوی بھی مساوی حقوق دیئے۔ جن معاشروں نے مرد وعورت کو گھریلو نظام میں مساوی حقوق دیئے ان کی گھریلو زندگی کیسے اجیرن ہوئی، اس کا تو اوپر ذکر ہو چکا یعنی گھریلو نظام کا جنازہ ہی نکل گیا، گھر سے میاں بیوی، بچے ویسے ہی راہ فرار اختیار کر گئے۔ اپنے گھر حوالے کر گئے، کتوں اور بلیوں کے۔ کسی گھر میں چلے جائیں اس میں انسان تو کم ملیں گے، ہاں حیوان بہت۔ ذیل میں ایک جھلک ان معاشروں کی بھی پیش کی جاتی ہے جنہوں نے مرد وعورت کو بطور انسان بھی مساوی قرار نہ دیا۔

دل خون کے آنسو روتا ہے یہ سپرد قلم کرتے ہوئے کہ دنیا میں ایسے غیر اسلامی اور غیر فطری معاشرے رہے ہیں (بلکہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہیں) کہ جن میں لڑکی کو پیدا ہوتے ہی بوجوہ زندہ درگور کر دیا جاتا رہا ہے۔ ''ستی'' کی رسم کہ جس میں زندہ بیوی کو مرنے والے خاوند کے ساتھ شعلوں کی نذر کر دیا جاتا ہے، کم ہی سہی، لیکن کئی معاشروں میں آج تک موجود ہے۔ زیرِ آسماں عورت کو پُر معصیت وحشی گردانا گیا ہے۔ دنیا میں آج بھی جتنی طلاق شدہ عورتیں ہیں، طلاق سے جدا ہونے والوں مردوں کی تعداد اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ گم گشتہ معاشروں نے تعددِ ازواج کا انکار تو کیا لیکن طلاق کو نت نئی شادیاں کرنے کے لئے بطور ہتھیار استعمال کیا۔ امریکہ جیسا ملک تو اس سے بھی ایک قدم آگے چلا گیا۔ طلاق لی اور دی ہی اس لئے جاتی ہے کہ پھر شادی کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ تمام ضروریات جب بغیر شادی کے پوری ہو جاتی ہیں تو پھر شادی کی بندشیں گوارا کی جائیں تو کیوں؟ کئی ممالک میں تو عورت کو ایک ایسی نقد آور فصل کی شکل دے دی گئی ہے جس کی برآمد درآمد ہوتی ہے۔ ڈھونڈ کر اور تلاش کر کے ایسے نام رکھے جاتے ہیں جیسے کتیوں اور بلیوں کے۔ "Marriage East & West" کا مصنف ایسے معاشروں کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ جن میں عورت اور مرد کے کپڑے اکٹھے پانی میں نہیں ڈالے جاتے۔ ایک ہی بالٹی میں لے جائے نہیں جاتے اور ایک ہی تار پر سکھائے نہیں جاتے۔ عورت کے کپڑوں والی

تار کو مرد کے کپڑوں والی تار سے نیچے رکھا جاتا ہے۔ آج کی دنیا کے کئی مذاہب عورت کو گناہ کی دیوی تصور کرتے ہیں۔ ممنوع ہے کہ کئی مذہبی رسومات شادی شدہ مرد ادا کریں اس لئے کہ وہ تو عورت سے ملوث ہو کر ناپاک ہو گئے۔ ایسی رسومات کے لئے غیر شادی شدہ مردوں کو موزوں گردانا جاتا ہے۔ پنڈتوں اور راہبوں کی فوج ظفر موج جو کئی معاشروں میں گھر کر آئی ہے تو آخر اس کی کوئی وجہ تو ہے؟ کئی معاشروں میں بیوی کو خاوند کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کی اجازت نہیں۔ ظلم کی انتہا ہے کہ کئی معاشروں میں بیوہ عورت کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ ایسے بھی معاشروں کی کمی نہیں جن میں عورت کے لئے پیٹ پالنے کے لئے کوئی آبرومندانہ راستہ نہیں۔ راستہ کھلا ہے تو ایک اور وہ راستہ ہے عصمت فروشی کا۔ پھر ایک طرح کی ڈیوٹی کے لئے بھی اسے مرد سے آدھا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اس بیچاری کو بچوں میں سے ایک بچہ سمجھا جاتا ہے۔ کئی شوہر یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ میں بچوں کو چھوڑ کر آیا ہوں حالانکہ ان بچوں میں بیوی بھی شامل ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو بیوی ہی بیوی ہوتی ہے بچوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ امریکہ میں چھپی ایک کتاب بعنوان "The Underside of History" عورت کے مقام و حیثیت کو مرد کے مقابلے میں یوں بیان کرتی ہے:

Life	Death	Right	Left
Good	Bad	Male	Female
High	Low	Strong	Weak
Sacred	Profane	Day	Night

الغرض کس قدر بھیانک حیثیت ہے جو مختلف ادوار میں مختلف معاشروں نے عورت کو دی لیکن شومئی قسمت ابھی شاید اس بیچاری کے دن مزید گردش میں ہیں کہ رہی سہی کسر مغربی دنیا نے آج کے جدید دور میں پوری کر دی ہے۔ قدرت نے مرد و زن کی جسمانی ساخت اور جذباتی پرداخت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے مابین ایک موزوں تر قدرتی تقسیمِ کار کر رکھی ہے۔ مرد کا

دائرہ کار اگر گھر سے باہر ہے تو عورت کا گھر کے اندر۔ ایسی تقسیمِ کار کسی مخصوص اعزاز کی وجہ سے نہیں پیدائشی صلاحیتوں کی وجہ سے ہے۔ مغرب والوں نے اس فطری تقسیمِ کار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عورت کو گھر کی سلطنت سے اٹھا کر بیرونِ خانہ مردوں کی طرح مشقت میں لگا دیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ اسے ''مساوات'' کا نام دے دیا۔ عورت بیچاری فیکٹری یا کھیت میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ بچے بھی جنے اور پالے بھی لیکن مرد کی موج ہی موج، اپنے فرائض کا بوجھ بھی صنفِ نازک پر ڈال دیا۔ یہ کیسی مساوات ہے؟ مساوات کا نام ہی دینا تھا تو پھر چاہئے تو یہ تھا کہ مرد بھی اپنی ازلی تقسیمِ کار یعنی کمانے کے ساتھ ساتھ بچے جنتا بھی اور پالتا بھی۔ عورت کی تقسیمِ کار کو بدلا تو وہ پھر بھی کسی طور ہی سہی نباہ کر رہی ہے' مرد کے فرائض کو بدل کر دیکھیں منہ کی کھائے گا' ناکام و نامراد ہوگا۔

دنیا کی آدھی آبادی سے زیادہ پر مشتمل اور افراط و تفریط کی شکار عورت کو اسلام قصرِ مذلت سے اٹھا کر بطورِ انسان مرد کے برابر لاتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ:

''جواب میں ان کے رب نے فرمایا! میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو'' (ایک سطح پر ہو) (آل عمران:195)۔

مرد ہو یا عورت ہر دو کو وراثت میں حصہ دار بنا دیا۔ فرمایا:

''مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال مین حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو۔ تھوڑا ہو یا بہت حصہ (ہر دو کا) مقرر ہے'' (النساء:7)۔

مرد و عورت کو مساوی قرار دیا تو اس حد تک جیسے کہ ایک گاڑی کے دو پہیے، لازم و ملزوم۔ فرمایا: وہ (عورتیں) تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے (البقرہ:87)۔

یہ تو ہے مرد و عورت کی وہ حیثیت جو اسلام ان دونوں کو بطورِ انسان دیتا ہے لیکن گھر کے ادارے کو چلانے کے لئے چونکہ ضروری تھا کہ دونوں میں سے ایک کو گھر کا سربراہ و نگران بنا دیا جاتا

لہٰذا دو متبادل راستے تھے ایک یہ کہ گھر کی سربراہی ونگرانی کا یہ منصب عورت کو دے دیا جاتا اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ یہ منصب مرد کو دیا جاتا۔ اسلام نے یہ منصب مرد کو تفویض فرمایا تو اس کی کئی وجوہات ہیں لیکن جو سب سے بڑی وجہ ہے وہ یہ ہے کہ مرد جسمانی طور پر عورت سے قوی ہے۔ اگر جسمانی طور پر کمزور کو قوی کا نگران بنا دیا جائے تو آج بھی کوئی یہ تجربہ کر کے دیکھ لے، بیل کبھی منڈھے ہی نہ چڑھے۔ یہ منصب دیا تو بوجوہ مرد کو دیا لیکن مرد کو یہ اعزاز مفت میں نہ دیا گیا بلکہ دینِ فطرت نے شوہر و بیوی کے درمیان توازن اس طرح کیا کہ مرد کو عورت اور بچوں کے نان ونفقہ کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ صورتِ حال متوازن کی تو اس حد تک کہ شوہر اگر کسی وجہ سے عورت کو طلاق بھی دے دے تو مطلقہ بیوی کے جملہ اخراجات ایک وقت تک سابقہ شوہر کو برداشت کرنے ہوتے ہیں۔

پھر یہی نہیں بلکہ گھریلو نظام میں تو ماں کا درجہ باپ سے بڑھا ہوا قرار دیا۔ گھریلو نظام میں تین فریق ہوتے ہیں، ماں، باپ اور بچے۔ اس انتظامی یونٹ میں بغرض انتظامی امور مرد کو جیسے قوام یعنی نگران و مددگار ٹھہرایا گیا اولاد کو بھی پابند کیا گیا کہ وہ والدین کا احترام بھی کریں اور خدمت بھی۔ خدمت کے لحاظ سے ماں کو باپ پر ترجیح دی گئی۔ چنانچہ سورۂ لقمان میں اللہ تعالیٰ نے جہاں والدین کی شکر گزاری کا تاکیدی حکم دیا وہاں فوراً بعد یہ فرمایا ''اس کی ماں نے اس کو تکلیف پر تکلیف جھیل کر نو مہینے تک اپنے شکم میں اٹھایا، پھر دو سال تک اپنے خون سے اس کو پالا'' یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں یوں آیا:

''ایک آدمی نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''تیری ماں''۔ اس نے کہا پھر کون؟ فرمایا ''تیری ماں''۔ اس نے کہا پھر کون؟ فرمایا ''تیری ماں''۔ اس نے کہا پھر کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''پھر تیرا باپ'' پھر درجہ بدرجہ جو تیرے قریبی لوگ ہیں'' (بخاری، مسلم)۔

ایک مسلمان کے لئے دنیا و آخرت میں جنت ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کے حصول کو ربِ کائنات ''بڑی کامیابی'' قرار دیتا ہے۔ ایک طرف یہ بہت بڑی نعمت اور بہت بڑی کامیابی

ہے اور دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ یہ ”جنت تمہاری ماؤں کے پاؤں تلے ہے“۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے اس حیثیت و مقام کا جو اسلام عورت کو بطور انسان، بطور بیوی اور بطور ماں دیتا ہے۔ مرد و عورت کی ان مختلف حیثیتوں اور زمہ داریوں کو الٹ کر دیکھیں، منفی نتائج فوراً سامنے آئیں گے۔ کئی نادان معاشرے ایسے تجربات کر بھی چکے۔ پچھتاوا ہی ان کا مقدر ٹھہرا تو پھر کیوں نہ انسانیت ممنون ہو اسلام کی۔

اسلامی سزاؤں کا سخت ہونا

جرائم پر دی جانے والی سزاؤں کو بھی اسلام کے مخالفین نے اکثر و بیشتر اپنے دلائل کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلامی سزائیں:۔

☆ ایک تو بڑی ظالمانہ بلکہ وحشیانہ ہیں اور

☆ دوسرے یہ کہ یہ ساتویں صدی کے وحشی، بدوی اور غیر مہذب قبائل کے لئے وضع کی گئی تھیں لہٰذا آج کی مہذب دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔

پیشتر اس کے کہ ہم ان سزاؤں کے محاسن و قبائح کی طرف آئیں یہ جان لینا از بس ضروری ہے کہ اسلامی سزائیں واقعی بہت کڑی ہیں۔ مثال کے طور پر زنا کی سزا یہ ہے کہ:

”زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیتے وقت اہلِ ایمان کا ایک گروہ موجود رہے“ (النور:2)۔

پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا یہ ہے:

”اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کر لیں۔ اللہ غفور و رحیم ہے“ (النور:5)۔

چور کی سزا یہ ہے:

''اور چور، خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے'' (المائدہ:38)۔

انسانی اعضاء ضائع کرنے کی سزا:

''توراۃ میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ۔ پھر جو قصاص کا بدلہ صدقہ کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ ظالم ہیں'' المائدہ:45)۔

قتل کی سزا یہ ہے:

''اور کسی مومن کے لئے روا نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے ذمہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور خون بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے الّا یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پس اگر مقتول تمہاری دشمن قوم کا فرد ہو لیکن وہ بذاتِ خود مسلمان ہو تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد ہے جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو خون بہا بھی ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی۔ جس کو یہ استطاعت نہ ہو تو وہ لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اللہ کی طرف سے اس گناہ پر توبہ کرنے کا طریقہ ہے۔ اللہ علیم و حلیم ہے۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کو عمداً قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے'' (النساء:92-93)۔

اسلامی نظامِ حکومت کو درہم برہم کرنے کی سزا:

''جو لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے

پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں میں کاٹے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے'' (المائدہ: 33-34)۔

روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ سزائیں جن کا اوپر ذکر ہوا سخت بھی ہیں اور شدید بھی لیکن سخت اور کڑی ہونے کے علاوہ ان کے درج ذیل تین اور اوصاف بھی ہیں جن کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو اسلامی سزاؤں کی نوعیت کو سمجھا نہیں جا سکتا۔

1۔ یہ سزائیں آخری چارۂ کار ہیں۔

2۔ یہ سزائیں جرائم کے راستے میں بھاری پتھر ہیں (Deterrent) ہیں۔

3۔ یہ سزائیں اصلاحی (Reformative) ہیں۔

ضرورت ہے کہ اسلامی سزاؤں کے ان تین پہلوؤں کو ذرا تفصیل سے زیرِ بحث لایا جائے۔

سزائیں بطورِ آخری چارۂ کار

ایسا نہیں ہے کہ اسلام متلاشی رہتا ہو کہ کوئی مجرم ہاتھ لگے تا کہ اسے سزا دی جائے۔ اس کے برعکس اسلام کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا اس کوشش میں کہ کوئی جرم کرنے ہی نہ پائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ جس کھیت میں تم چاہتے ہو کہ کوئی چرنے والا مویشی منہ نہ مارے اسے اس کھیت کے نزدیک چرنے ہی نہ دو تا کہ اسے منہ مارنے کا موقع ہی نہ ملے۔ مثال کے طور پر فعلِ زنا کو روکنے کے لئے اسلام جو اَن گنت رکاوٹیں اور مشکلات اس رجحان کے راستے میں حائل کرتا ہے کہ جو بالآخر اس فعل پر منتج ہوتی ہیں ان پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں۔

☆ بدکاری کے راستے میں سب سے بڑی چٹان جو اسلام رکھتا ہے وہ آخرت

میں جواب دہی کا تصور ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا' ہر فرد کا ہر فعل' چھوٹا ہو یا بڑا ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ جب کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو اس کا یہ ریکارڈ محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ قیامت کو ہر فرد کا ریکارڈ اس کے سامنے رکھا جائے گا اور اسے کہا جائے گا کہ آج تو اپنا محتسب خود ہی ہے۔ نتیجہ کے طور پر کسی بھی فرد کا کوئی بھی عمل اچھا ہو یا برا دنیا کی کسی عدالت کے نوٹس میں نہ آئے تو نہ آئے' قیامت کے دن جزا و سزا کی چھلنی سے ضرور گزرے گا۔ جزا کی صورت میں صاحبِ عمل کو جنت میں داخلہ ملے گا اور سزا کی صورت میں دوزخ میں۔

☆ خوفِ خدا اور آخرت کی اس ''بڑی روک'' کے علاوہ جو بطور پولیس چوکی ہر مسلمان کے دل میں ہر وقت جاگزیں رہتی ہے اسلام بیرونی رکاوٹیں بھی کھڑی کرتا ہے۔ یہ رکاوٹیں مزید دو طرح کی ہیں۔ ایک پہلو تو مثبت رکاوٹوں کا ہے یعنی اسلام ہر فرد کو شادی کی ترغیب دیتا ہے اور مجرد رہنے کو پسند نہیں کرتا اور دوسری رکاوٹیں اپنے اندر منفی پہلو رکھتی ہیں یعنی وہ گناہ کے راستے کا پتھر بنتی ہیں۔ جہاں تک شادی کرنے کی ترغیبات کا تعلق ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

- غیر شادی شدہ رہنا اسلامی تعلیمات کے مطابق احسن نہیں گردانا گیا۔ قرآن و سنت میں شادی کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک تو یہاں تک ہے کہ جو کوئی شادی کرتا ہے، آدھا دین مکمل کر لیتا ہے۔
- رہبانیت اور تجرد کی کوئی گنجائش نہیں۔
- بیوہ کو دوبارہ شادی کی کھلی اجازت دی گئی ہے۔
- اگر کوئی جوڑا ایک دوسرے سے نالاں ہو جائے تو طلاق کی اجازت دی گئی ہے۔ طلاق کا حق شوہر اور بیوی میں سے کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے گو اس کا طریقِ کار ذرا مختلف ہے۔
- جلد شادی کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان باپوں کو آخرت میں انعامات سے نوازا جائے گا جو اپنی بیٹیوں کی شادی بلوغت ہوتے ہی کر دیں۔

- جائز ازدواجی تعلقات کو عبادت گردانا گیا ہے۔

بیرونی رکاوٹوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں مردوں اور عورتوں کے عمومی اختلاط کی ممانعت کی گئی ہے۔ایسی چند بندشیں درج ذیل ہیں

- بدکاری اور زنا کے لئے سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے۔

- عورت کے دائرہ کار کو زیادہ تر گھر کی چار دیواری کے اندر محدود کر دیا گیا ہے۔کبھی کبھار اگر اسے گھر سے باہر جانے کی ضرورت ہو تو اسے شائستگی کا دامن تھامنے کی تاکید کی گئی ہے۔ لازم قرار دیا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں اور منہ کے کچھ حصوں کے علاوہ پورے جسم کو ڈھیلی ڈھالی چادر سے ڈھانپ کر رکھے۔کسی قسم کی زینت کی نمائش نہ کرے۔زیورات پہنے تو ایسے کہ جن کی کوئی جھنکار وغیرہ نہ ہو۔کسی سے بات کرے تو مضبوط طور پر نہ کہ لوچدار لہجے میں کرے۔

- محرم اور غیر محرم رشتوں کی باقاعدہ تقسیم و تخصیص کی گئی ہے۔محرم رشتے وہ ہیں کہ جن کے ساتھ کسی عورت کی شادی ممنوع ہے جیسے باپ، بھائی، بیٹا وغیرہ۔تمام وہ رشتے جن کے ساتھ شادی کی اجازت دی گئی ہے نامحرم کی فہرست میں آتے ہیں۔

- ایسی محفلوں، مجلسوں اور نشستوں میں مسلمان مرد و عورت کی شمولیت ممنوع جو نامحرموں پر یا نامحرموں اور محرموں دونوں پر مشتمل ہوں۔

- کوئی غیر محرم مرد اور غیر محرم عورت تنہائی میں نشست نہیں کر سکتے۔

- ہدایات دی گئی ہیں کہ عورتیں اور مرد جب آمنے سامنے گزریں تو نظریں نیچی رکھیں۔ شہوت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنا گناہ ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمانا تو یہاں تک ہے کہ غیر محرم مردوں اور عورتوں کا ایک دوسرے کو دیکھنا آنکھوں کا زنا ہے (پہلی سرسری نظر پڑ جائے تو البتہ معاف ہے)۔غیر شائستہ گفتگو زبان کا زنا ہے۔بے ہودہ اور شہوت بھری سماعت کانوں کا زنا ہے۔غیر محرم کو چھونا اور اس کی طرف عیاشانہ پیش رفت ہاتھوں اور پاؤں کا زنا ہے۔

- اسلام گھریلو خلوت اور رازداری (Privacy) پر بہت زور دیتا ہے۔بغیر اجازت

کسی دوسرے کے گھر داخل ہونے کی اور گھر کے اندر جھانکنے کی قطعاً ممانعت ہے۔ کسی دوسرے کے گھر میں داخلے کے لئے تین دفعہ اجازت مانگنے کے باوجود اگر جواب نہ ملے اور اگر ملے تو معذرت کا تو پھر واپس جانا ہوتا ہے۔ اجازت لیتے وقت کسی کے دروازے کے سامنے کھڑے ہونے کی ممانعت ہے۔ اپنے ہی گھر کے نابالغوں کو منع کیا گیا ہے کہ وہ تین اوقات یعنی صبح کی نماز سے پہلے، گرمیوں میں دوپہر کے وقت جب زیادہ تر کپڑے اتارے ہوتے ہیں اور عشاء کی نماز کے بعد بالغوں کے کمروں میں نہ جائیں۔ دوسروں کے خطوط ان کی اجازت کے بغیر پڑھنا ممنوع ہے۔ صرف دوسروں کے ہی نہیں بغیر اجازت کے ماں اور بہن کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

- اسلام جب نامحرموں کو مخلوط مجلسوں اور روبرو گفتگو کرنے کی ممانعت کرتا ہے تو ظاہر ہے مخلوط تعلیم، مخلوط کاروبار، مخلوط اور مشترکہ رہائش وغیرہ کا قطعاً کوئی سوال نہیں۔

- ان تمام بندشوں کے علاوہ اسلام لازم قرار دیتا ہے کہ مسلم معاشروں کا عمومی اور مجموعی ماحول خدا ترسی، بھائی چارے اور خیر خواہی کا مظہر ہو۔ جنسی افواہوں، فحش گانوں، لچر تصویروں، ناچ وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ تہمتیں داغنا تو اس قدر گناہ گردانا گیا کہ تقریباً تقریباً جیسے بدکاری وزنا۔ اندازہ لگائیں اس ماحول کا کہ جس میں بعض حالتوں میں آنکھوں دیکھے زناکاروں کا بھی اس وقت تک انکشاف نہیں کیا جائے گا جب تک کہ چار گواہ نہ ہوں۔

رکاوٹوں، مزاحمتوں اور بندشوں کا یہ بھرپور بندوبست صرف ایک جرم یعنی زنا کو روکنے کے لئے کیا گیا۔ دوسرے بڑے بڑے جرائم کی راہ میں بھی اسی طرح کی بندشوں کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ قرآن وسنت نے حائل کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے ان بھرپور رکاوٹوں اور بچاؤ کی ترغیبوں کے علی الرّغم اگر پھر بھی کوئی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ تو ایسا گلا سڑا پھل ہے کہ جس کا درخت پر رہنا تندرست پھلوں کے ساتھ انتہائی ظلم وزیادتی ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے گلے سڑے پھل کو صرف درخت سے علیحدہ ہی نہ کیا جائے بلکہ اسے اس طور مروڑا، کچلا اور زیرِ زمین دفن کر دیا جائے کہ اس

کی ہوا تک تندرست پھلوں کو نہ لگے۔ اسی طرح ایک ایسا فرد جوان تمام رکاوٹوں اور ترغیبات کے باوجود گناہ کا ارتکاب کرتا ہے بظاہر تو چلتا پھرتا انسان ہوتا ہے حقیقتاً ایک ایسی لاش ہوتا ہے جس کی انسانیت طبعی موت سے بہت پہلے مر چکی ہوتی ہے۔ ایسی لاش کو زندہ انسانوں کے درمیان رہنے دینا معاشرے اور انسانیت پر ظلم ہے۔ دینِ فطرت ایسے ظلم کی کیسے اجازت دیتا؟

اسلامی سزاؤں کا مزاحمتی پہلو

اس میں کسی کو کوئی کلام نہ ہوگا کہ ایٹم بم ایک انتہائی بھیانک، مہلک اور تباہ کن ہتھیار ہے لیکن اس میں کیا شک ہے کہ اس دنیا میں اس کا موجود ہونا عالمی جنگ کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ (Deterrent) ہے۔ اسی طرح اسلامی سزاؤں کا بظاہر سخت اور کڑا ہونا تو ایک مسلمہ امر ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کا یہی بظاہر سخت اور بھیانک ہونا جرائم کے راستے کا بھاری پتھر ہونا ہے۔ جرم کرنے والے کو سو بار سوچنا پڑتا ہے کہ کیا وہ ان سزاؤں کا متحمل ہوسکتا ہے؟ ان سزاؤں کے کڑا ہونے کی افادیت تو اب تجربے سے بھی عیاں ہے۔ ایسے ممالک میں خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، جہاں اسلامی سزائیں نافذ نہیں جرائم کا تناسب سعودی عرب سے کئی گنا زیادہ ہے کیونکہ سعودی عرب میں اسلامی سزائیں عملاً نافذ ہیں۔ کسی بھی نظام کی خوبی تو یہی ہوسکتی ہے کہ جرائم کی وجہ سے وہاں انسانی جانوں کا ضیاع کم سے کم ہو۔ سعودی عرب میں ان جانوں کا ضیاع جو جرائم کی وجہ سے ہوتی ہیں یا جرائم کی سزا کے طور پر وارد کی جاتی ہیں کی تعداد امریکہ میں انہی مدات میں ضائع ہونے والی جانوں کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ بتایئے ظالمانہ و وحشیانہ سزاؤں کا نظام امریکہ میں ہوا یا سعودی عرب میں؟ کس قدر ضرورت ہے انسانیت کو اسلام اور اسلامی سزاؤں کے نفاذ کی؟

اسلامی سزاؤں کا اصلاحی اور تطہیری پہلو

گلے سڑے انسان کو ٹھکانے تو لگانا ہی ہوتا ہے لیکن اسلام کی یہ عظمت واعزاز دیکھئے کہ وہ اس ضائع کی جانے والی انسانی جان سے بھی فائدہ اٹھانا لازمی سمجھتا ہے۔ اسلام اس مقصد کو کئی

پہلوؤں سے حاصل کرتا ہے جن میں سے کم از کم تین کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں:

1۔ اسلام ایسا نہیں کرتا کہ مجرم کو رات کے اندھیرے اور کسی کال کوٹھڑی میں سزا دے دے۔ بلکہ اکثر و بیشتر وہ لازم قرار دیتا ہے کہ مجرم کو کھلے عام سزا دی جائے اور سزا دیتے وقت عوام کا ایک جمِ غفیر موجود ہوتا کہ دنیا کے انسان بہ چشمِ سر دیکھ لیں کہ جرم کرنا کتنا مہنگا پڑتا ہے۔ اسلام کا یہ کہنا کہ سزا دیتے وقت سزا دینے والوں کے دل میں مجرم کے لئے کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہونا چاہئے اسی لئے کہ کہ درسِ عبرت حاصل ہو تو مکمل اور حتمی۔ ہاتھ پاؤں کا کاٹنا بھی اسی لئے ہے کہ ہاتھ پاؤں کٹا جدھر سے بھی گزرے تو ساتھ ساتھ یہ اشتہار بھی لئے پھرے کہ چوری کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟

2۔ ہاتھ کٹوائے جانے والے شخص کے لئے ہاتھ کے کٹنے سے لازم نہیں آتا کہ اس کے نفس کی اصلاح بھی ہوگئی ہو۔ لہٰذا اسلام کی رو سے ہاتھ پاؤں کا کفارہ دے دینے والوں سے بھی آخرت میں جرم کے بارے میں مزید باز پرس ہوگی۔ ایسی باز پرس سے چھٹکارا ممکن ہے بشرطیکہ مجرم اس دنیا کی سزا پانے کے ساتھ ساتھ توبہ بھی کرے اور سچی توبہ کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کی اس قدر اصلاح ہو چکی ہو کہ باقی عمر میں پھر کبھی اس سے وہ جرم صادر نہ ہو۔ یہی مطلب ہے یہ کہنے کا کہ ''مجرموں کی شہادت قبول نہ کرو سوائے ان لوگوں کے کہ جو (مجرمانہ) حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں''۔

3۔ اسلام مجرموں کو مایوس نہیں کرتا کہ وہ اپنے اندر یہ احساس لیئے ہوئے رہیں کہ اب وہ سوسائٹی میں ہمیشہ کے لئے عضوِ فاسد ہیں۔ وہ سزا پانے والوں اور تائب ہو جانے والوں کو معافی کی بشارت دیتا ہے۔ یہ ایسی ہی بشارت کے حصول کا مظہر تھا کہ زیرِ آسمان کئی مجرم جو انسانی نگاہ سے بچ گئے، سزا پانے کے لئے خود حاضر ہوتے رہے۔ بہت سی آیات جن میں اسلامی قوانین کی سزا بیان ہوئی ہے اسی وجہ سے ایسے الفاظ سے ختم کی گئی ہیں جیسے ''اللہ غفور و رحیم ہے'' ''اللہ دانا و بینا ہے'' وغیرہ۔ ایک جگہ پر تو ایسے الفاظ آئے کہ ''جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے

کہ تم ان پر قابو پاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔

مذکورہ بالا ہدایات سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام مجرموں کو محض سزا دینے کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ اسے سزا دینے سے بھی زیادہ معاشرے سے مجرمانہ ذہنیت ختم کرنے کی فکر دامن گیر ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلامی سزاؤں کا اصل ہدف معاشرے کی اصلاح و تطہیر ہے۔ کیا انسانیت کو اصلاح و تطہیر کی ضرورت نہیں؟

اسلامی جہاد (مسلح جدوجہد) کیوں؟

جیسا کہ ذکر ہو چکا اسلام ہے ہی ایسے احکام اور اوامر و نواہی پر مشتمل کہ جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے ضامن ہیں۔ اس بارے میں اگر کسی کے ذہن میں کوئی الجھن ہو تو وہ اس وجہ سے نہیں کہ اسلام میں کوئی نقص ہے بلکہ اس لئے ہی ہوگی کہ وہ خود بھولے پن اور نادانی میں اسلام کی حقانیت کو سمجھنے میں قاصر رہا ہے ورنہ یہ مسلمہ امر ہے کہ اسلام ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے کہ جو پوری انسانیت کے لئے بھلائی اور خیر خواہی کا ضامن ہے۔ اسلام کا ایسے ہونا اس لئے لازمی امر ہے کہ یہ دین انسانوں کا بنایا ہوا ہے نہیں بلکہ انسانوں کے خالق کا بنایا ہوا ہے۔ بندے اگر یہ ضابطۂ حیات بناتے تو وہ ضرور طبقاتی، گروہی، نسلی اور علاقائی مصلحتوں کو مدِ نظر رکھ کر بناتے جیسا کہ پوری انسانی تاریخ میں بنائے جاتے رہے ہیں اور آج بھی بنائے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے جو ضابطۂ حیات علاقائی یا طبقاتی ہوگا انسانیت کے لئے کس طرح قابلِ عمل ہو سکتا ہے؟ اسلامی ضابطۂ حیات کا اعزاز ہی یہ ہے کہ وہ اس خالق و مالک و حاکم کا بنا ہوا ہے جو ربِ کائنات ہے، جو غیر جانبدار ہے، جو کسی جرمن کا رب ہے تو کسی مصری کا رب بھی، جو کالے کا رب ہے تو گورے کا رب بھی، جو مرد کا رب ہے تو عورت کا رب بھی، جو اس وقت بھی موجود تھا جبکہ پہلے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا، آج بھی موجود ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موجود رہے گا۔ یہی نہیں بلکہ ایک فیکٹری والے کو جیسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی فیکٹری کے پروڈکٹ کو استعمال میں لانے کی ہدایات دے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو ہی یہ حق حاصل ہے کہ وہ انسان کے لئے ضابطۂ حیات وضع کرے اس لئے کہ

انسان فطرت کی فیکٹری کا ہی تو پروڈکٹ ہے۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام پوری انسانیت کے لئے ضابطۂ حیات ہے تو اسے اس انسان کا بھی ضابطۂ حیات ہونا چاہئے جو اس دنیا میں پہلے پہل وارد ہوا تھا۔ان انسانوں کے لئے بھی جو آج اس دھرتی پر موجود ہیں اور ان انسانوں کا بھی جو تا قیامت اس دنیا میں پیدا ہوتے رہیں گے۔کیا ہی مطابقت ہے کہ واقعات کی دنیا میں ایسا ہی ہے!اس دنیا میں پیدا ہونے والا پہلا شخص حضرت آدمؑ خود نبیؑ تھا۔بذریعہ وحی اس کا براہِ راست رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھا۔پھر جتنے انبیاءؑ ورسلؑ اس دنیا میں وقتاً فوقتاً آتے رہے وہ ایک ہی سرچشمے سے منسلک تھے،ایک ہی ضابطۂ حیات یعنی اسلام کے علمبردار تھے اور بالآخر انہیں ایک ہی ہستی یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہونا ہے۔مختلف ادوار میں کچھ امتیں اپنی نسبت اور تشخص کو اجاگر کرنے کے لئے اس ''ایک ضابطہ حیات'' کو یہودیت،عیسائیت وغیرہ کے سے نام دیتی رہیں ورنہ ازل سے ابد تک اس ضابطۂ حیات کا نام اسلام ہی ہے اور جو اس ضابطۂ حیات کو اختیار کرے اسے ہمیشہ مسلمان یعنی اللہ تعالیٰ کے مطیع فرمان کا نام دیا گیا ہے۔قران میں آیا:

''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی'ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لئے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات سے انکار کردے' اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی'' (آل عمران:19)۔

پھر چونکہ یہ تمام انبیاءؑ ایک ہی ہستی کے نمائندے اور ایک ہی سرچشمے کے ترجمان تھے لہٰذا فرمایا گیا کہ وہ ایک ہی برادری کے لوگ تھے'ان میں اور ان کتابوں میں جو وہ لائے کوئی فرق نہ کیا جائے بلکہ ان تمام پر ایمان لانا اسی طرح ضروری ہے جیسے کہ اس نبیؑ پر جو وقت کا نبیؑ ہو، قرآن میں آیا:

''مسلمانو! کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروںؑ کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں'' (البقرہ:136)۔

نامِ مسلم کے متعلق یوں بھی فرمایا:

''اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام ''مسلم'' رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی'' (الحج:78)

جب اسلام پوری انسانیت کا ازل سے ابد تک دین ہے تو ایک اور سوال کا ذہن میں آنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ پھر اس کی تعلیمات و ہدایات وقت کے کسی بھی موڑ پر ان تمام انسانوں تک پہنچنی چاہئیں جو کہ اس وقت موجود ہوں تاکہ وہ ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنی اس دنیا کی فلاح اور آخرت میں نجات کا بندوبست کر سکیں۔ واقعات کی دنیا میں ایسا ہی ہے اور پوری انسانی تاریخ میں یہ جو انبیاءؑ و رسلؑ آتے رہے تو اسی وجہ سے کہ وہ اللہ کے دین کو اس دھرتی کے مکینوں تک پہنچاتے رہے۔ پھر چونکہ یہ پہنچانے کا کام اتنا اہم تھا کہ لوگوں کی نجات کا دارومدار اسی پر تھا کہ وہ ان تعلیمات پر عمل کریں لہٰذا اس پہنچانے یا رسالت کے کام کو انبیاءؑ و رسلؑ کو بطور چیلنج دیا گیا۔ یہ رسالت کا کام آج تک بلکہ تاقیامت جاری رہے گا کیونکہ ہر موجودہ اور آنے والے انسان کی یہ اسی طرح ضرورت ہے جیسے کہ اس انسان کی تھی کہ جو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ البتہ اس پہنچانے کے کام میں اس قدر فرق ضرور پڑ گیا کہ سلسلہ نبوت ختم کر کے یہ کام اللہ تعالیٰ نے آخری امت یعنی امتِ مسلمہ کے سپرد کر دیا۔ بالفاظِ دیگر امتِ مسلمہ اب نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کی حامل و محافظ ہے بلکہ یہ رسالت کا کام کرنے کی ذمہ دار بھی ہے۔ اصل میں وہ آسمانی ہدایات جو پہلے جزوی طور پر آتی تھیں، قرآن کی شکل میں حتمی اور مکمل کر دی گئیں لہٰذا ایسا ہونے کا لازمی نتیجہ تھا کہ انبیاءؑ و رسلؑ کی بعثت کا سلسلہ بھی ختم کر دیا جاتا۔

اب مسلمانوں کو یہ پہنچانے کا کام اس لئے کرنا ہے کہ یہ ان کا فرض منصبی ہے اور ظاہر ہے

کہ ان کی نجات تبھی ممکن ہے کہ وہ اس اہم ترین فرض کو بطریقۂ احسن ادا کریں۔ دوسروں تک ان تعلیمات کا پہنچنا اس لئے ضروری ہے کہ ان کی نجات کا دارومدار انہی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہے۔ ایک پتے کی بات یہ کہ پہنچانے کا کام تبھی ہوسکتا ہے کہ اسلام اور اسلام والے دنیا میں بطور غالب قوت موجود ہوں۔ بصورتِ دیگر ان پہنچانے والوں سے بڑھ کر اگر کوئی اور طاقت موجود ہوگی تو وہ یہ کام کرنے ہی نہ دے گی۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ فرض کریں ایک طرف کسی آدمی کے پاس کنواں اور کنوئیں سے پانی نکالنے کا پورا انتظام ہے اور دوسری طرف کچھ فاصلے پر بہت سے پیاسے ہیں۔ کنویں والا چاہتا بھی ہے کہ وہ جلد از جلد پیاسوں تک پانی پہنچائے لیکن راستے میں کسی طاقت ور زمیندار کی زمین پڑتی ہے اور وہ فتنہ کھڑا کر دیتا ہے کہ اس کی زمین سے گزر کر کوئی دوسری طرف پانی نہیں لے جاسکتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی ہولناک صورتِ حال کا کیا حل ہو؟ ہر سلیم الطبع انسان فوراً یہی فیصلہ دے گا کہ انسانی جانوں کو بچانے کی خاطر مزاحم ہونے والے ہٹ دھرم زمیندار سے کم از کم اُس طاقت کو چھین لیا جائے کہ جو انسانوں کے لئے وبالِ جان بن گئی۔ ہو بہو یہی صورت اسلامی جہاد کی ہے۔ اسلامی جہاد دنیا کے مادی فائدے حاصل کرنے کے لئے قطعا نہیں۔ اگر کوئی مادی فوائد بٹورنے کے لئے کرے تو خود قیامت کو پکڑا جائے گا۔ اسلامی جہاد صرف اس لئے ہے کہ گمراہ انسانوں سے وہ طاقت چھین لی جائے کہ جو دوسرے انسانوں کو گمراہ کرنے کا باعث ہو اور ماحول کو اس قدر سازگار بنا دیا جائے کہ اسلامی تعلیمات پہنچانے کے راستے میں کوئی فتنہ کھڑا نہ کردے۔ مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار ہی اس وقت کیا جاتا ہے جب مزاحم قوتیں دعوت وتبلیغ کے ذریعے رسالت کے کام کو ناممکن بنادیں۔ کسی انسان پر سب سے بڑا ظلم یہی ہے کہ آسمانی ہدایات کو اس تک پہنچنے نہ دیا جائے۔ دینِ فطرت ایسے ظلم کو کیسے برداشت کرتا؟

چونکہ اسلامی جہاد نہ مادی فوائد بٹورنے کے لئے ہے اور نہ ہی کسی کو مجبوراً مسلمان کرنے کے لئے (لا اکراہ فی الدین) لہذا اس کے ساتھ فی سبیل اللہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اسلامی جہاد کی اسی فی سبیل اللہ شرط کا اعزاز ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں اس جہاد کے ذریعہ اتنی

جانیں تلف نہیں ہوئی جتنی کہ مثال کے طور پر دو میں سے ایک عالمی جنگ میں۔ یاد رہے غزواتِ رسول اللہ ﷺ میں کل 7323 مخالفین قتل، زخمی یا اسیر ہوئے۔ اسی دوران محض 387 مسلمان شہید ہوئے۔ اس کے برعکس صرف جنگِ عظیم اول کے مقتولین کی تعداد 7469700 مجروحین کی 19432000 اور قیدیوں کی 6526500 تھی۔ جنگِ عظیم دوم میں ان اعداد و شمار سے بھی کئی گنا زیادہ تعداد متاثرین کی تھی۔ کن الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کیا جائے کہ اسلامی جنگ انسانیت کی خاطر جدوجہد ہے تو غیر اسلامی جنگ محض فساد ہے۔ ایک جنگ انسانیت کی فلاح و بہبود کی ضامن ہے تو دوسری انسانیت کی ویرانی و بربادی کا ذریعہ۔ ایسے میں کیا رتی بھر بھی کوئی شک ہے کہ ''اسلام پر یلغار اصل میں انسانیت پر ظلم ہے''۔ کاش اس دنیا کے مکیں اپنا برا بھلا پہچانیں۔

جیسا کہ ثابت ہو چکا اگر تعددِ ازواج، مرد و عورت کے حقوق میں عدم مساوات، اسلامی سزاؤں کا سخت ہونا اور جہاد فی سبیل اللہ جیسے متنازع موضوعات انسانیت کی بھلائی و خیر خواہی کے لئے ہیں تو پورے اسلام کی برکات و فیوض کا اندازہ لگائیں۔ یہ محض تصوراتی معاملہ ہی نہیں تاریخ شاہد ہے کہ اُس گیارہ سو سالہ دور میں جب اسلام اس دنیا میں بطورِ غالب قوت موجود رہا، صرف انسانوں ہی نے سکھ کا سانس نہ لیا، پرندوں اور چرندوں کا مقدر جاگ اٹھا۔ کسی کی کیا مجال کہ اس دور میں کسی دوسرے پر بھی زیادتی کرتا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ حکمرانوں نے اپنے آپ کو خادموں کی سطح پر رکھا اور آخرت کی باز پرس کا خوف انہیں اس قدر متفکر کئے رکھتا کہ وہ خود تو بھوکے ننگے رہے لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ ''فرات کے کنارے کوئی بکری کا بچہ تک بھوکا رہے''۔

آج انسانیت اسلام کی برکات سے محروم ہے تو اس وجہ سے کہ وہ امت جس نے اسلام کو دوسروں تک پہنچانا تھا خود نا اہلیت کا شکار ہو کر دنیا میں مغلوب و مجبور ہو گئی۔ جس امت نے اس دنیا کو سنوار کر رکھنا تھا خود تباہی و بربادی کا شکار ہو گئی۔ بحر و بر میں شر اور فساد نے ڈیرے آ جمائے تو اس کی کوئی تو وجہ ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کو انسانیت کی ضرورت ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انسانیت کو اسلام کی بہت ضرورت ہے۔

نظام ہائے خلافت

خلافت کا نظامِ حکومت

آغاز ہی میں دو اصولی باتیں نوٹ کرنے کی ہیں۔ پہلا اصول تو یہ کہ ''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی''۔ جس طرح نظامِ خلافت خود دنیا کے دوسرے مروجہ نظام ہائے زندگی سے سرتاپا مختلف ہے اسی طرح خلافت کا ہر دائرہ کار' خواہ وہ حکمرانی کا ہو' سماجی معاملات کا ہو یا اقتصادی امور وغیرہ کا سیکولر طرزِ زندگی کے ایسے نظاموں سے مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دوسرے نظام ہائے زندگی بندوں کے وضع کردہ ہیں' نظام خلافت تعلیماتِ وحی پر مبنی ہے' انسانوں کی مداخلت کا کوئی سوال نہیں۔ دوسری اصولی بات بلکہ اصل الاصول یہ ہے کہ کسی انسان کو حق نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے خواہ وہ انسان نبیؑ ہی کیوں نہ ہو۔ حکمرانی صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے' بندوں کا کام محض بندگی ہے' قرآنِ کریم میں آیا:

''کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کی بجائے میرے بندے بن جاؤ''۔ (آل عمران: 79)

لاریب' ایک انسان کا دوسرے انسانوں پر حکم و اختیار' خواہ وہ کسی روپ میں ہو' استبداد ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں انسان ساختہ جتنے نظام ہائے زندگی چلے' خواہ وہ شخصی تھے یا جمہوری بالآخر بری طرح فیل ہوئے اس لئے کہ طاقتور ہمیشہ کمزور کے حقوق غصب کرتا رہا ہے۔ اور قوت' عدل و انصاف کو مسلسل پامال کرتی رہی ہے۔ استثناء اس میں اگر ہے تو ان ادوار کی کہ جب وحی کا دور دورہ رہا ہے۔ بقولِ شاعر ؎

ہر عہد میں ہوتی رہی طاقت کی پرستش
ہر دور یزیدوں کا طرف دار رہا ہے

خلافت کا طرزِ حکومت

پہلے ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے۔ عام کہا جاتا ہے کہ اسلام کا طرزِ حکومت خلافت

ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ یہ کہا جائے کہ خلافت کا طرزِ حکومت خلافت ہے۔ اس لئے کہ اسلام اور خلافت ہم مرتبہ وہم وزن الفاظ ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ اسلام جو مکمل اور حتمی صورت میں قرآن وسنت میں موجود ہے' اگر قرآن وسنت کے صفحات تک محدود رہے تو محض ایک نظریہ اور فلسفہ ہے۔ ہاں' جب یہ حتمی نظریہ کسی خطۂ زمین میں بطور ضابطۂ حیات عملاً نافذ ہو جائے تو یہی خلافت ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلام کی طرح خلافت محض طرزِ حکومت کا نام نہیں' پورے نظامِ زندگی کا نام ہے۔

موضوعِ سخن کی طرف آئیں تو صورتِ حال کچھ اس طرح کہ خلافت کا طرزِ حکومت تین ستونوں پر استوار ہے۔ یہ تین ستون ہیں توحید' رسالت اور اولی الامر۔ آیئے' ہر ایک کے مقام ومرتبہ پر روشنی ڈالیں۔

توحید: ہم نے اوپر ذکر کیا کہ کسی انسان کو حق نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے' حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ ایک عام ذہن اس جملے کے مضمرات کو تسلیم نہیں کرتا اس لئے کہ واقعات کی دنیا میں کچھ انسان ہی ہیں جو دوسرے انسانوں پر حکومت کرتے ہیں' اللہ کو تو کسی نے دیکھا تک نہیں۔ غیر مسلم معاشروں کا تو باوا آدم ہی نرالا' وہاں پر تو بالفعل کچھ انسان دوسرے انسانوں پر مسلط ہوتے ہیں خواہ ذرّیت کی بنا پر' سازش کے ذریعہ، طاقت کے بل بوتے پر یا بذریعہ انتخابات' اسلام میں بھی حکومت چلانے والے اولی الامر انسان ہی ہوتے ہیں۔ تھوڑا سا گہرائی میں جا کر دیکھیں تو بات دو اور دو چار کی طرح واضح کہ اصل میں حکمران وہ ہوتا ہے کہ جس کا قانون چلے۔ دوسرے نظام ہائے حکومت بمثل کمیونزم' سوشلزم' مغربی جمہوریت وغیرہ میں جہاں انسان ساختہ قانون چلتا ہے' اسلام میں نہیں۔ اسلام میں اطاعت تو اللہ کے علاوہ رسول ﷺ اور اولی الامر کی بھی ہوتی ہے۔ قانون صرف اللہ تعالیٰ کا چلتا ہے۔ چنانچہ اطاعت کے بارے میں آیا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں' پھر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے

اللہ ورسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی صحیح طریقِ کار اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہے''۔ (نساء: 59)

البتہ حکمرانی وقانون سازی کے متعلق فرمایا:

''فیصلہ کا سارا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے، وہی امرِ حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے'' (انعام: 57)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں ضروری ہے کہ قانون سازی وحکمرانی (فیصلے) کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہو جب کہ انسان اپنی ضروریات کو سمجھتے بھی ہیں اور پھر یہ ضروریات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی بھی رہتی ہیں؟ لہٰذا ضروری ٹھہرا کہ کھوج لگایا جائے کہ قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے تو کیوں؟ غور کریں تو قانون ساز ہستی کے لئے چند اوصاف کا حامل ہونا ازبس ضروری ہے۔ تمام ایسے اوصاف کے بیان کرنے کا موقع تو نہیں، چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلا وصف جو قانون ساز میں ہونا لازمی ہے وہ یہ کہ اس کا علم مکمل، بھرپور اور ادنیٰ نقص کے بغیر ہو۔ اسے پتہ ہو کہ اس کائنات کا حدودِ اربعہ کیا ہے؟ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی اور اس کا انجام کیا ہے؟ سورج روزانہ مشرق سے ہی کیوں نکلتا ہے، مغرب سے کیوں نہیں؟ کسی دن یہ کیوں نہیں سنا جاتا کہ آج سورج تاخیر سے نکلے گا اس لئے کہ ''زیرِ مرمت'' ہے؟ لیل ونہار، بحر وبر، شجر وحجر وغیرہ کی غایت کیا ہے؟ قانون ساز کو زیرِ زمین معدنیات اور خلائی خزانوں کا کما حقہ علم ہوتا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ آج تو ''خاندانی منصوبہ بندی'' کا قانون وضع کرے اور کل کو اتنے وسائل برآمد ہو جائیں کہ جو کئی گنا آبادی کے متحمل ہو سکتے ہوں۔ پھر قانون ساز کو انسان کہ جس کے لئے قانون سازی کرنی ہے کی طبیعت وسرشت سے اس قدر بھرپور آگاہی ہو کہ کسی دل کے کسی کونے میں پیدا ہونے والا احساس قانون ساز سے اوجھل نہ ہو۔ الغرض قانون ساز کو تجربات کر کے یہ پتہ نہ کرنا ہو کہ کونسا قانون انسان کے لئے کفایت کریگا۔ اس کا علم اس سے بھی زیادہ انسان پر محیط ہو جس

طرح کہ ایک فیکٹری میں تیار ہونے والے پروڈکٹ پر فیکٹری کے مالک کا علم محیط ہوتا ہے۔ کسی اور سے اوجھل رہے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن قانون ساز اس جرم سے بھی سو فیصد آگاہ ہو کہ جو رات کی تاریکی میں کیا جائے۔ اسے اس قدر تفصیلاً علم ہو کہ وہ جانتا ہو کہ جرم قصداً کیا گیا یا سہواً کس کس کے اکسانے پر جرم ہوا اور ہر اکسانے والے کا جرم میں کس قدر حصہ ہے؟

ایک دوسری بڑی خوبی جو قانون ساز میں ہونی چاہئے وہ اس کا غیر جانبدار اور بے لوث ہونا ہے۔ اس کی اپنی کوئی قوم، کنبہ، رشتے دار وغیرہ نہ ہو۔ وہ کسی گروہ یا طبقے کی طرف جھکاؤ نہ رکھتا ہو۔ وہ کسی کا حتیٰ کہ نیند، بھوک وغیرہ کا بھی محتاج نہ ہو البتہ ہر دوسرا اس کا محتاج ہو۔ پھر اس کا کوئی ادنیٰ ذاتی مفاد نہ ہو کہ اسے قانون میں کہیں ڈنڈی مارنے کی ضرورت پڑے۔

ایک اور صفت جو قانون ساز میں ہونا لازمی ہے، اس کا سپریم مقتدر ہونا ہے۔ وہ بڑے سے بڑا ہو کوئی اس کے ارادے میں حائل ہونے والا اور اس کے کام میں مزاحمت پیدا کرنے والا نہ ہو۔ وہ اپنے قانون کو نافذ کرنے اور قانون شکن کی گرفت کرنے پر کلی طور پر قادر ہو۔ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو بلکہ ہر کوئی اس کے سامنے جوابدہ ہو۔ اس کا اقتدار صرف انسانوں پر ہی نہ ہو بلکہ ہر ذی روح غیر ذی روح پر بھی ہو۔ موت وحیات، جزا وسزا اور سلب وعطا اسی کے ہاتھ میں ہو۔ ہر چیز فنا ہو جائے لیکن قانون ساز نہ صرف لافانی بلکہ ہر وقت، ہر جگہ، ہر کسی کے ساتھ ہو۔

مندرجہ بالا اوصاف کو دیکھا جائے تو سوائے اللہ کی ذات بابرکات کے نہ ان پر کوئی انسان پورا اترتا ہے نہ کوئی پارلیمنٹ، نہ کوئی جن نہ فرشتہ۔ یہی مطلب ہے ''ان الحکم الا للہ'' اور ''الا لہ الحکم'' کا۔ بنابریں خلافت کے نظامِ حکومت میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ دوسری اطاعتیں اور فرمانبرداریاں صرف ایک صورت میں قابل قبول ہوں گی کہ وہ خود اللہ پاک کی اطاعت کے تابع اور تحت ہوں۔ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت کا کوئی سوال نہیں۔

رسالت: خلافت کے نظامِ حکومت میں اللہ تعالیٰ کو کوئی ایسی اطاعت قبول نہیں جو کہ رسالت کے راستہ سے نہ ہو اس لئے کہ خود اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا پتہ دینے والا اور اللہ اور

انسانیت کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ رسول ﷺ ہے۔ رسول ﷺ کی اطاعت ہو تو اللہ تعالیٰ کو اطاعت قبول ورنہ قطعاً نہیں۔ فرمایا گیا:

''کہو اللہ و رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ ایسا نہ کریں تو جانے رہیں کہ اللہ ایسے کافروں سے محبت نہیں کرتا''۔ (آل عمران:32)

رسولؐ صرف احکامات و ہدایات الٰہیہ کو پہنچانے والا ہی نہیں ہوتا' شارع بھی ہوتا ہے۔ وہ ان احکامات و تعلیمات کے مطابق ایک نظام زندگی کو استوار کر کے اسے رواں دواں رکھنے کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے۔ وہ نیکی و بدی' جزا و سزا اور جنت و دوزخ کی خبر دینے والا ہی نہیں ہوتا، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے۔

اولی الامر منکم: اسلام کے نظام حکومت میں اطاعت کا تیسرا ستون ''اولی الامر منکم'' ہوتے ہیں' البتہ اس کڑی شرط کے ساتھ کہ وہ خود اللہ و رسول ﷺ کی بدرجۂ اتم اطاعت میں ہوں۔ جونہی وہ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت سے نکل جائیں وہ اپنا حقِ اطاعت کھو دیتے ہیں۔ اگر اولی الامر کے آپس میں یا عوام اور اولی الامر کے مابین کوئی تنازع ہو جائے تو لازمی ہے کہ اسے اللہ و رسول ﷺ یا بالفاظِ دیگر قرآن و سنت کی طرف لوٹایا جائے۔ بڑے زور سے کہنے کی بات ہے کہ جس طرح رسول ﷺ کی اطاعت کے بغیر اللہ کی اطاعت کا کوئی سوال نہیں' اسی طرح مابعدِ رسول ﷺ' اولی الامر کی اطاعت کے بغیر اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کا کوئی تصور نہیں۔ پھر یہ اطاعت اسی طرح ''سمع و طاعت'' والی اطاعت ہے کہ جس طرح امامِ نماز کی کہ ادھر امام نے آواز دی اور ادھر لاکھوں کروڑوں مسلمان فی الفور سجدہ ریز ہو گئے۔ سب محمود و ایاز ایک ہی صف میں' ایک ہی آواز پر بغیر ادنیٰ توقف و ہچکچاہٹ لبیک کہنے کے پابند۔ نبی رحمت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا نہ پسند، تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سننا چاہئے' نہ ماننا چاہئے''۔ (بخاری و مسلم)

اولی الامر میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ ہوں خواہ وہ فکری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں' ملکی انتظام چلانے والے سیاسی لیڈر ہوں' عدالتی فیصلے کرنے والے جج ہوں یا تمدنی و معاشرتی امور چلانے کے ذمہ دار حکام و رہنما ہوں۔ اس بارے میں سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ حکومت میں خلیفہ کے بغیر اولی الامر کا کوئی تصور نہیں بلکہ اولی الامر میں خلیفہ کی حیثیت وہی ہے جو اجرام فلکی میں سورج کی یا درخت میں جڑ کی۔ جڑ جواب دے جائے' تنا کھوکھلا پڑ جاتا ہے' شاخیں سوکھ جاتی ہیں اور پتے دائیں بائیں بکھر جاتے ہیں۔ خلیفہ نہ رہے اولی الامر کا وجود معدوم ہو جاتا ہے۔ اولی الامر نہ رہیں اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت درہم برہم ہو جاتی ہے۔ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت درہم برہم ہو جائے امت تک کا وجود نہیں رہتا۔ متحارب اور متعصب قومیں معرضِ وجود میں آ جاتی ہیں۔ فرقے اور مسالک جنم لیتے ہیں اور ہر کوئی جدھر چاہے منہ اٹھائے چل پڑتا ہے۔ کفر غالب آ جاتا ہے' اسلام والے (برائے نام مسلمان) مغلوب ہو جاتے ہیں۔ ذلت و رسوائی مسلمان کا مقدر بن جاتی ہے۔ دنیا بھر میں ارزانی ہوتی ہے تو خونِ مسلم کی اور ویرانی ہوتی ہے تو عصمتِ مسلم کی۔ بنابریں ضروری ٹھہرا کہ آئندہ صفحات میں ہم خلیفہ اور دوسرے اعیانِ حکومت پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

خلیفۃ المسلمین

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا خلافت کے نظامِ حکومت میں بھی بظاہر تو انسان ہی انسانوں پر حکومت کرتے نظر آتے ہیں لیکن یہ حکمرانی کرنے والے افراد مجبورِ محض ہوتے ہیں۔ نہ خود قانون سازی کر سکتے ہیں نہ کسی دوسرے کی قانون سازی کے پابند ہوتے ہیں۔ ہاں' پابند ہوتے ہیں تو صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قانون کے۔ پوری انسانی تاریخ پر قانونِ الٰہی آسمانی صحیفوں کی شکل میں انبیاء و رسلؑ پر نازل ہوتا رہا ہے جو اس قانون کو نہ صرف اپنی امتوں کو پہنچاتے رہے ہیں بلکہ اس قانون پر خود عمل کر کے اسے عملی طور پر نافذ کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مصلحتاً قانون سازی و حکمرانی کا ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا کہ زمین پر کہیں خود دفتر کھول کر یہ کام کرے۔ اس نے انسان ہی کو کہ جس نے اس دنیا میں کاروبارِ حیات رواں دواں رکھنا تھا ایک مقررہ مدت تک کچھ

صوابدیدی اختیارات اور متعلقہ اہلیتیں دے کر اس دھرتی پر اپنا نمائندہ (خلیفہ) مقرر کر رکھا ہے۔ بالفاظ دیگر اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر مرد و زن اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہوتے ہوئے ہر انسان پابند تو ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی کو اسی کے عطا کردہ قوانین کے مطابق بروئے کار لائے لیکن چونکہ ایک مدت تک اسے صوابدیدی اختیارات حاصل ہیں' لہٰذا وہ چاہے تو قوانین الٰہی کی پابندی کرے اور چاہے تو خیانت کا مرتکب ہوتے ہوئے خودساختہ قوانین اپنائے۔ آج کی دنیا دو گروہوں میں منقسم ہے۔ ایک گروہ صحیح حقِ نمائندگی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کو اسی کے دیئے ہوئے قوانین کے مطابق بروئے کار لانے کے درپے ہے اور مسلم (ماننے والا) کہلاتا ہے جبکہ دوسرا گروہ قوانینِ الٰہی کو پس پشت ڈال کر خودساختہ قوانین کو اپنائے ہوئے ہے اور کافر (انکار کرنے والا) کہلاتا ہے۔ ہر دو گروہ البتہ زیرِ آزمائش ہیں اور روزِ محشر اپنی اس دنیا میں کی گئی کارکردگی کی بنیاد پر جزاوسزا کے مستحق قرار پائیں گے۔

جیسا کہ ذکر ہوا انبیاء کرامؑ نے صرف ہدایات وحی یا قوانینِ الٰہی کو صرف اپنی اپنی امتوں کو پہنچایا ہی نہیں ان پر عمل کر کے بھی دکھایا ہے۔ یہ پہنچانے کا کام فرائضِ نبوت کا حصہ ہوتا ہے اور عمل کر کے ایک معاشرہ اور ایک نظام کو معرض وجود میں لانے کے کام فرائضِ خلافت ہیں۔ بالفاظِ دیگر ہر نبیؑ بیک وقت نبیؑ بھی ہوتا ہے تو خلیفہ بھی۔ جب ارتقائی تمدنی اور حتمی ہدایات بھیج کر سلسلۂ نبوت کو منقطع کر دیا تو قرار پایا کہ آئندہ یعنی مابعدِ نبوت فرائض خلافت کا کام مخصوص اہلیتوں کا حامل مرد ادا کرے گا جسے خلیفۃ المسلمین، امیر المومنین وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ خلیفۂ خلافت کے نظامِ حکومت کا سربراہ اور اولی الامر کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔ اصل میں نظامِ خلافت کو چلانے کے لئے ہر مسلمان اپنی خلافت کا ایک حصہ خلیفۃ المسلمین کے ہاتھ دے دیتا ہے۔

خلیفہ کے بغیر جیسے اسلام میں اولی الامر کا کوئی تصور نہیں اسی طرح خلیفہ کے بغیر نظامِ خلافت کے معرضِ وجود میں آنے کا کوئی سوال نہیں۔ خلیفہ یا خلیفۃ المسلمین منفرد اوصاف کا حامل ہی نہیں منفرد اختیارات کا حامل بھی ہوتا ہے۔ ''ہاتھ بندھا'' اسقدر کہ صرف قوانین الٰہی یعنی قرآن

وسنت کے احکامات کو نافذ کرنے کا پابند، خود کوئی قانون سازی نہیں کر سکتا۔ مقتدر اسقدر کہ پوری اسلامی دنیا' خواہ وہ پورے کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ہو، کے تمام ذرائع اور وسائل اس کے ہاتھ میں مرتکز ہوتے ہیں۔ پھر سپہ سالار اعظم بھی وہی، صرف اس کے ایماء وحکم پر دشمنانِ اسلام سے جنگ ہوسکتی ہے۔ عدلیہ کا سربراہ تو قاضی القضاۃ ہی ہوتا ہے لیکن خلیفہ ایک لحاظ سے اس سے بھی اوپر اس لئے کہ شوریٰ کے مشورہ سے اجتہاد صرف خلیفہ کے فرائض میں آتا ہے۔ معلم امت بھی وہی یعنی امت مسلمہ کے اخلاق وکردار اور تربیت کا محافظ وذمہ دار وہی ہوتا ہے۔

ایک اور لحاظ سے بھی خلیفۃ المسلین کی حیثیت نہ صرف منفرد بلکہ عام حکمرانوں سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ ایک تو وہ قرآنی معیار اہلیت (جس کا ذکر بعد میں ہوگا) کا حامل ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر چنا جاتا ہے۔ دوسرے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اس نے دو بڑی نمایاں ذمہ داریاں نبھانا ہوتی ہیں۔ پہلی ذمہ داری تو یہ کہ دار الخلافہ کی مرکزی مسجد میں امامت وخلافت کے فرائض اسی نے ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اور دوسرے اس نے اپنی زندگی ایک اوسط شہری کے معیار کی گزارنا ہوتی ہے۔ کہنے کو تو یہ دو ذمہ داریاں ایک فقرے میں بیان ہو گئیں لیکن عملاً ان کے اسقدر دور رس نتائج کہ نظامِ خلافت کی برکات اور فیوض وفوائد کا اصل سرچشمہ یہی۔ فریضۂ امامت وخطابت ادا ہونے سے مملکت کے ہر شہری کی رسائی، شہری کی صوابدید پر ہوی ہے' جب چاہے خلیفہ سے مل لے۔ لوگوں کے مسائل جمع ہو ہی نہیں پاتے بلکہ سونے سے پہلے ہی حل ہو جاتے ہیں۔ اوسط سطح کا از خود اختیار کردہ معیار زندگی منصبِ خلافت کو پھولوں کی سیج تو کیا' کانٹوں کا بستر بناتا ہے۔ انسانیت کی حقیقی خدمت کرے والا ہی ایسا منصب قبول کرتا ہے ورنہ معذرت۔ یاد رہے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ خود کو اس سطح پر لایا تو سہی لیکن ان گنت لواحقین وقربت داروں کی ناراضگی مول لے کر۔ اسلام حلال ذرائع سے کمانے اور حلال مدوں پر خرچ کرنے کی شرط لگا کر اجازت دیتا ہے کہ ایک مسلمان بے شک لاکھوں کروڑوں کا مالک بن جائے' نہیں ایسی اجازت دیتا تو ایک خلیفۃ المسلمین کو۔ اسے بہر حال اوسط شہری کا معیارِ زندگی اختیار کرنا اور امت کے لئے سادگی وبچت کا

نمونہ بننا ہوتا ہے۔ اندازہ لگائیں جب خلیفہ خود اس معیارِ زندگی کا پابند ہوگا تو اور کون ہوگا جو ناجائز ذرائع اختیار کر کے دولت کے انبار لگائے۔

خلیفہ کے متعلق ایک اور اہم بات کا اعادہ ضروی ہے۔ ایک وقت میں پوری اسلامی دنیا کا صرف اک ہی خلیفہ ہوسکتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ نہیں۔ ایک خلیفہ کے ہوتے ہوئے اگر کوئی دوسرا سر اٹھانے کی کوشش کرے تو بار بار تاکید کی گئی کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ ظاہر ہے جب دوسرے کو دعویٰ کرتے ہی ختم کر دیا جائے گا تو دو سے زیادہ بیک وقت خلفاء ہونے کا کیا سوال؟

شوریٰ

خلافت کے نظامِ حکومت میں منصب خلافت کے بعد دوسرا بڑا اور بنیادی ادارہ شوریٰ کا ہے۔ اسلام شورائی نظام کا علمبردار ہے۔ قرآن مجید میں آیا ''امرہم شوریٰ بینھم'' یعنی مسلمان اپنے معاملات آپس کے مشورہ سے چلانے کے پابند ہیں'' (شوریٰ:38)۔ باہمی مشورے سے باہمی معاملات چلانے کی اس قدر اہمیت ہے کہ پیغمبر ﷺ کو بھی مشورے کا پابند کر دیا گیا۔ فرمایا ''شاورھم فی الامر'' یعنی انہیں شریکِ مشورہ رکھو (آلِ عمران:159)۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا پیغمبر وقت' خلیفہ وقت بھی ہوتا ہے۔ یہ کارِ خلافت ہی ہے جس میں پیغمبرؑ کو مشورے کا پابند کیا گیا' کار رسالت میں تو انسانی مشورہ نہ مطلوب نہ درکار۔ خلیفۃ المسلمین کے لئے مشورہ لینا تو لازم ہے' مشورے کو قبول کرنا لازم نہیں سوائے اس مشورے کے کہ جو اس کی ذات یعنی برطرفی' مشاہرے وغیرہ کے متعلق ہو۔ بالعموم تو اسے ارکانِ شوریٰ کی اکثریت پر عمل پیرا ہونا ہوتا ہے لیکن وہ اقلیت کے مشورے بلکہ ایک رکنِ شوریٰ پر بھی بلکہ اپنے فیصلے پر بھی عمل کر سکتا ہے بشرطیکہ ایسا مشورہ یا فیصلہ قرآن وسنت کی کسی نص پر مبنی ہو۔ خود رسول ﷺ نے ایک فرد کے مشورے پر بھی عمل کیا جیسے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر' زیادہ افراد کے مشورے کو بھی اپنایا جیسے کے غزوۂ احد کے موقع پر اور زیادہ بلکہ تمام موجود مسلمانوں کے مشورے کو ٹھکرا بھی دیا جیسے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر۔ اس موقع پر بھی اپنی بیوی سے مشورہ بہر حال کیا۔

اسلامی شوریٰ دنیا کے دستور ساز اداروں اور پارلیمنٹوں سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ خلافت میں خلیفہ اورارکانِ شوریٰ کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں، وہ اصولی اور بنیادی قانون سازی نہیں کر سکتے۔ ہاں' کسی بھی نئی صورتِ حال کے لئے قرآن وسنت سے استنباط کر کے اجتہاد کر سکتے ہیں۔ وہ انتظامی وملکی امور میں ایسی ذیلی قانون سازی بھی کر سکتے ہیں کہ جو قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو۔ مثال کے طور پر وہ یہ فیصلہ تو کر سکتے ہیں کہ ایک وقت میں اسلامی مملکت کے کتنے صوبے اور کتنے گورنر ہوں لیکن یہ فیصلہ کرنے کے ہرگز مجاز نہیں کہ کسی غیر مسلم کو گورنر بنادیں اس لئے کہ گورنر اولی الامر کا حصہ ہوتا ہے اور یہ اصولی قانون اللہ تعالیٰ نے خود دے دیا کہ ''اولی الامر منکم''یعنی اولی الامر صرف مسلمانوں میں سے ہوں۔ اصل میں جیسے کہ شوریٰ کے نام سے ظاہر ہے اس ادارے کا واحد کام ہر نئی صورت میں قرآن وسنت کی روشنی میں مشورہ دینا ہوتا ہے اور بس۔

عدلیہ

نظامِ خلافت میں عدلیہ آزاد اور خود مختار ہوتی ہے۔ قاضی القضاء کی تعیناتی تو حکومت ہی کرتی ہے لیکن تعیناتی ہونے کے بعد قاضی القضاء انتظامی امور میں خود مختار ہوتا ہے تو عدالتی امور میں صرف اللہ تعالیٰ کو جوابدہ۔ بوقتِ ضرورت خلیفۂ وقت کو بھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہوتا ہے اس لئے کہ اسلام میں قانون سے بالا کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قانون کا یہی اعزاز ہے کہ وہ شاہ وگدا پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔ ایک لحاظ سے خلیفۂ وقت عدلیہ کی رہنمائی ضرور کرتا ہے اور وہ اس طرح کہ شوریٰ کے مشورے سے اجتہاد یا ذیلی قانون سازی اسی کے فرائض کا حصہ ہے۔ عدلیہ نے تو قانون کے مطابق فیصلے کرنا ہوتے ہیں خواہ قانون پہلے سے قرآن وسنت میں موجود ہو یا قرآن وسنت کی روشنی میں خلیفہ وشوریٰ نے بذریعہ اجتہاد تیار کیا ہو۔

سیاسی جماعتیں

اسلام متحارب سیاسی جماعتوں اور متعصب مذہبی فرقوں کی پرزور نفی کرتا ہے حتیٰ کہ

معروف و مروجہ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کا بھی کوئی وجود نہیں۔ حکومتی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے حکومت وقت تو حزبِ اقتدار ہوتی ہی ہے باقی پوری امت حزبِ اختلاف ہوتی ہے۔ اس معنی میں کہ کوئی ادنیٰ شہری خلیفۂ وقت اور اعیانِ حکومت سے باز پرس کر سکتا ہے۔ اجازت ہے اسلام میں تو ایسی جماعتوں اور اداروں کی جو کوئی نہ کوئی امتی کام سنبھالے ہوئے ہوں جیسے دعوتِ دین، امر بالمعروف و نہی عن المنکر وغیرہ۔ نظامِ خلافت میں ایسے کاموں کے لئے وزارتوں کی تشکیل کرنا بھی ضروری ہے۔

فرائضِ حکومت

نظامِ خلافت کی حکومت کا فرض اللہ تعالیٰ کی عبادت' رسول ﷺ کی اطاعت اور عوام کی خدمت ہے۔ ایک حدیث میں رسول ﷺ نے اسلامی حکومت کے فرائض کو کوزے میں دریا بند کرنے کے مصداق فرمایا ''سید القوم خادمھم'' کہ قوم کا سردار عوام الناس کا خادم ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہر وہ کام جو امت مسلمہ اور انسانیت کی بھلائی کے لئے ہو حکومت کے فرائض منصبی میں شامل ہوتا ہے۔ بالخصوص جن فرائضِ منصبی کا ذکر ایک جگہ پر قرآن مجید میں یوں آیا:

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، ایتائے زکوٰۃ کا بندوبست کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ (حج: 41)

اقامتِ صلوٰۃ جس میں خلیفۂ وقت کا دار الخلافہ کی مرکزی مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض ادا کرنا اور مملکت کی باقی مساجد میں خلیفہ ہی کی ایما (On Behalf of) پر امامت و خطابت کا بندوبست شامل ہے' پورے سماجی و معاشرتی ڈھانچے کو صحیح اور موزوں اطوار پر رکھنے کا بہترین ہتھیار ہے۔ ایتائے زکوٰۃ و صدقات جس کا انتظام بیت المال کے ذریعہ کرنا ہوتا ہے اقتصادی ڈھانچے کو اس ڈھب پر رکھتا ہے کہ ایک طرف سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع نہ ہونے پائے تو دوسرے طرف ہر شہری کی بنیادی ضروریات بتمام و کمال پوری ہوں۔ اسی طرح امر بالمعروف و

نہی عن المنکر کے فرائض پوری انسانیت کو سنوار کر رکھنے اور بگاڑ سے بچانے کے لئے تریاق کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انعقادِ حکومت

حکومت سازی کے سلسلہ میں اس بات کو ذہن میں رکھنا بنیادی حیثیت کا حامل ہے کہ مکی دور نبوت ''قیامِ خلافت'' کا دور ہے تو مدنی دور نبوت بشمول دورِ خلافتِ راشدہ ''دوامِ خلافت'' کا دور ہے۔ قیامِ خلافت کا مسنون طریقہ تو انتخابی نہیں انقلابی ہے اور اصل میں وہی ہے کہ جو لا الہ الا اللہ میں مضمر ہے کہ جس نظام کو بدلنا ہے اس سے کنارہ کشی کی جائے اور جس نظام کو لانا ہے اس کی دعوت دی جائے۔ اس طریقے سے مصائب و مشکلات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ لیکن کچھ مدت بعد نصرتِ ایزدی انقلابیوں کے شامل حال ہو جاتی ہے لہٰذا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ حکومت سازی کا انتخابی طریقہ مدنی دورِ نبوت میں نبی ﷺ کی موجودگی میں درکار ہی نہ تھا' البتہ دورِ خلافت راشدہ میں مستعمل ہوا۔ چاروں خلفاء راشدین کا انتخاب قدرے مختلف انداز میں ہوا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انتظامی و ہنگامی امور میں طرزِ انتخاب میں بوقتِ ضرورت قدرے ردوبدل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ وہ بنیادی اصول جن کی ہر طرز انتخاب میں پیروی کی گئی اور جنہیں قرآن وسنت پر مبنی ہونے کی بنا پر لازماً اختیار کرنا ہوتا ہے درج ذیل ہیں:

☆ امیدوار کھڑے ہو کر اپنے حق میں کنوینسنگ کرنے کی دوٹوک نفی۔

☆ خلیفۂ وقت کا انتخاب محض اربابِ حل وعقد کی رائے (بیعت) سے ہوا، امت کے ہر بالغ فرد نے انتخاب میں حصہ نہ لیا۔ بصورتِ دیگر جہلاء ہی قیادت پر متمکن ہوتے ہیں۔ کیونکہ عوام الناس کی اکثریت ہمیشہ جاہل ہوتی ہے۔ (اکثر الناس لایعلمون)

☆ اہل اور قابل ترین قیادت کو آگے لانے کے لئے قرآنی معیارِ اہلیت جو پانچ اوصاف پر مشتمل ہے کی پابندی کی گئی۔ یہ پانچ اوصاف ہیں ایمان (نور:55)' تقویٰ (حجرات:13)' صلاح (نور:55)' علم اور جسم (بقرہ:247)۔ یہ اوصاف ایسے

جامع ہیں کہ ہر دوسرے وصف کا احاطہ کرتے ہیں۔

☆ ایک دفعہ منتخب ہو جانے والی قیادت کو ہٹانا درج ذیل تین صورتوں میں ہی جائز ورنہ تا حیات قائم ودائم:

- وفات پا جانے کی صورت میں
- ازخود معذرت کر لینے کی صورت میں اور
- قرآنی معیارِ اہلیت میں کسی ایک یا زیادہ اہلیتوں میں کمی آنے کی صورت میں۔

آج کے دور میں کوئی بھی طرزِ انتخاب اختیار کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ان اصولوں سے رتی بھر انحراف نہ ہو۔ ذیل میں ہم ایک ایسے ہی طرزِ انتخاب کا ذکر کرتے ہیں۔ یاد رہے خلافت قائم ہونے کی صورت میں موجودہ اسلامی ممالک کی حیثیت اس عظیم تر اسلامی مملکتِ واحدہ کے صوبوں کی ہوگی جسے ہم نے ''دارالسلام'' کا نام دے رکھا ہے۔ ہر صوبے کے سربراہ کا نام ''امیر'' ہوگا تو پوری اسلامی دنیا یعنی دارالسلام کے سربراہ کو امیرالمومنین کا نام دیا جائے گا۔ پہلے مرحلہ میں صوبوں کے امراء کا انتخاب ہوگا تو دوسرے میں امیرالمومنین کا۔

مجوزہ طرزِ انتخاب

جب معیاری لوگ آگے لانے ہوں تو ضروری ہے کہ وہ ادارہ یا معیار جو اہل لوگوں کی نشاندہی کرے ایک ہی ہو۔ دارالسلام کی سطح پر ایسا واحد ادارہ الیکشن کمیشن ہی ہو سکتا ہے یعنی ہر صوبہ میں صوبائی الیکشن کمیشن تو دارالسلام کی سطح پر وفاقی الیکشن کمیشن۔ پہلے مرحلے میں چونکہ صوبائی امراء کا انتخاب مطلوب ہے لہٰذا ہر صوبے میں مثال کے طور پر پاکستان میں پاکستان کا الیکشن کمیشن حسبِ ضرورت یا مثال کے طور پر پچاس الیکشن پینل بنائے گا۔ ہر پینل تین ایسے افراد پر مشتمل ہوگا جن کی شرافت اور دیانت دارانہ شہرت مسلّمہ ہو۔ یاد رہے اسلامی تعلیمات کے مطابق ایسے نیک سیرت انسان وقت کے ہر موڑ پر موجود ہوتے ہیں۔ الیکشن پینلوں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ

پورے پاکستان کو مناسب سائز کے حلقوں میں تقسیم کرلیا جائے (حلقے کا سائز موجودہ قومی اسمبلی کے حلقوں کے برابر بھی ہوسکتا ہے)۔ ہر حلقہ کے لئے مقرر کردہ الیکشن پینل اپنے حلقہ میں سات دن مختلف ریسٹ ہاؤسوں، یونین کونسل کے دفتروں یا دوسری مناسب جگہوں پر اس پروگرام کے تحت قیام کرے کہ جس کا پہلے سے اخبارات واشتہارات کے ذریعہ اعلان کیا جائے۔ اس ساری سعی کا مقصد یہ ہے کہ متعلقہ پینل حلقے کے لوگوں سے اس قدر قریب تر رابطہ قائم کرے کہ گویا اہالیانِ حلقہ کا ہی حصہ بن جائے۔ اپنے قیام کے دوران متعلقہ آبادی میں سے بہ مشورہ عوام ایسے لوگوں کی خفیہ فہرست تیار کی جائے کہ جو قرآنی معیارِ اہلیت کے حامل ہوں۔ فہرست تو پہلے ایسے تقریباً 150 افراد (مردوں) کی تیار کی جائے لیکن کانٹ چھانٹ اور کراس چیکنگ کے بعد اسے 100 افراد تک محدود کر دیا جائے۔ اس طرح سات دنوں میں 50 پینل پچاس حلقوں کی فہرستیں تیار کرلیں گے۔ اسی حساب سے کم وبیش 150 حلقوں کا سروے تقریباً تین ہفتوں میں مکمل ہو جائے گا۔ سروے مکمل ہونے کے دس دن کے اندر اندر صوبائی الیکشن کمیشن انہی ممبران پینل کی خدمات سے استفادہ کرتے ہوئے ہر حلقہ کی فہرست میں شامل کردہ 100 افراد کو متعلقہ حلقہ ہی میں کسی ایک جگہ پر برائے مشورہ طلب کرے۔ ضروری نہیں کہ ایسے تمام اجتماعات پورے صوبے میں ایک ہی دن ہوں۔ لیکن اگر ہوں بھی تو کوئی حرج نہیں۔

مشورہ کے اغراض ومقاصد بتانے کے بعد بلائے گئے افراد میں سے ہر ایک کو 100 افراد والی تیار کردہ فہرست کی ایک کاپی مہیا کی جائے اور اسے فہرست میں دیئے گئے افراد میں سے مطلوبہ (پاکستان کی صورت میں مثلاً دس) افراد کو جن کو کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ قرآنی معیار اہلیت پر بدرجۂ اتم پورے اترتے ہیں خفیہ طور پر ٹک کرنے کو کہا جائے۔ جو شخص اپنے نام کو بھی ٹک کرے اس کے مشورے کو نہ صرف مسترد کر دیا جائے بلکہ اسے کسی بھی عہدے کے لئے نااہل قرار دیا جائے۔ اس طرح سے جو شخصیت سب سے زیادہ ٹک ہوا سے متعلقہ صوبہ کی طرف سے وفاقی شوریٰ کا رکن ہونے کی سعادت ہو۔ جو دوسرے نمبر پر آئے اسے صوبائی شوریٰ کا رکن گردانا جائے۔ باقی ٹک

شدہ افراد میں سے مطلوبہ تعداد کو زونل شوریٰ کا رکن بنایا جائے۔اس کے لئے ہر صوبے کو ایک کروڑ آبادی پر مشتمل زونوں میں تقسیم کیا جائے۔ ہر زون کی انتظامیہ علیحدہ اور ایک گورنر کی سربراہی میں ہو(اس مرحلے پر پاکستان کے غالباً 15 زون بنانا ہوں گے) اگر کوئی منتخبہ شخص معذرت کر لے تو ظاہر ہے پھر فہرست میں ٹک کردہ اگلے فرد کو لیا جائے گا۔

امیر المومنین کا چناؤ وفاقی شوریٰ کے ارکان آپس میں اسی طرح بغیر کسی رکنِ شوریٰ کے امیدوار کھڑا ہونے کے خفیہ رائے دہی سے کریں۔صوبائی امراء کا چناؤ صوبائی شورائیں کریں اور زونل گورنروں کا انتخاب زونل شورائیں کریں۔ وفاقی وزراء کا انتخاب خلیفۂ وقت اور صوبائی وزراء کا چناؤ صوبائی امراء کی صوابدید پر ہو۔نیز ملکی سطح پر ایسے انتخابات پوری تاریخ میں صرف ایک ہی دفعہ ہوں۔کسی رکن شوریٰ کی سیٹ خالی ہونے کی صورت میں صرف متعلقہ حلقہ میں دوبارہ انتخاب ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا تجویز کردہ طرز انتخاب جملہ اسلامی تقاضوں کو پورا کرتا ہے' تاہم حرفِ آخر نہیں۔قرآن وسنت کی شرائط کی پابندی کرتے ہوئے طرزِ انتخاب میں حسبِ ضرورت ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ طرزِ انتخاب نہ صرف سستا' آسان' مختصر وقت میں اور معمولی عملہ سے مکمل ہونے والا ہے بلکہ مروجہ انتخابی شور شرابے' گروہی و جماعتی محاذ آرائیوں اور برادریوں کی مخاصمتوں سے بھی قطعی پاک ہے۔اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دارالسلام' صوبائی اور زونل سطح پر صرف ایک ہی دفعہ درکار ہے' پھر کبھی نہیں۔اس کا یہ بھی طرۂ امتیاز کہ صرف اہل اور امانتدار افراد ہی قیادت پر متمکن ہوسکتے ہیں' ووٹر کی محتاجی کا کوئی سوال نہیں۔ دور دراز کا ایک غریب دیہاتی بھی ذاتی اہلیت کی بنا پر عوامی نمائندہ اور حکمران منتخب ہوسکتا ہے۔

اقلیتیں

اسلام احترامِ مسلم کا ہی نہیں احترام آدمیت کا علمبردار ہے۔رنگ ونسل اور مذہب و عقیدہ کا لحاظ کئے بغیر ہر شہری کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔فرق اگر کچھ ہے تو اتنا کہ کلیدی

آسامیوں پر غیر مسلم نہیں لگائے جاسکتے اور وہ اس لئے کہ نظامِ خلافت مجموعی طور پر قرآن وسنت پر مبنی رکھنا ہوتا ہے اور غیر مسلم قرآن وسنت پر چونکہ یقین نہیں رکھتے لٰہذا کلیدی آسامیوں پر اپنا حقِ تعیناتی وہ خود تیاگ دیتے ہیں۔ انہیں بہر حال اپنے مذہب وعقیدہ کے مطابق زندگی گزارنے کا سو فیصد اختیار ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ تک کرسکتے ہیں اور مقامی سطح پر وہ اپنے نمائندے بھی منتخب کرسکتے ہیں۔ زکوٰۃ چونکہ ایک اسلامی فریضہ ہے اور غیر مسلموں کو کسی اسلامی فریضے کا پابند نہیں کیا جاسکتا لٰہذا وہ زکوٰۃ سے تو ماوراء ہوتے ہیں البتہ امورِ مملکت میں انہیں اپنا حصہ بطور جزیہ ادا کرنا ہوتا ہے۔

خلافت کا نظامِ عبادت

عبادت کے متعلق چند ابتدائی باتوں کا سمجھنا نہایت مفید رہے گا۔اس بارے میں پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ عبادت اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے جس طرح کہ حکومت، حمد اور ملکیت۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے سرفہرست ہے ہی عبادت۔حمد' حکومت اور ملکیت تو پھر بھی عارضی طور پر ہی سہی' کسی درجے کسی دوسری شے سے منسوب کی جاسکتی ہے' عبادت قطعاً نہیں۔ پھول خوبصورت ہوتو اتنا تو کہا جاتا ہے کہ پھول خوبصورت ہے۔حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے تعریف کے لائق خالقِ حسن ہے نہ کہ صاحبِ حسن۔خوبصورت ہونا اور خوبصورت رہنا اگر پھول کے بس میں ہوتا تو اس کا حسن دائمی ہوتا' وہ کبھی بھی خود کو خوبصورتی سے محروم نہ ہونے دیتا۔

جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت نمبر 59 میں آیا' اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول ﷺ اور اولی الامر کی اطاعت بھی لازمی ہے۔لیکن عبادت فی الذّات صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ رسول ﷺ کی اطاعت مستقل اور دائمی تو ہے' بالذّات ہرگز نہیں۔قرآن میں آیا:

" کسی انسان کا یہ کام نہیں کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو اپنا رب بنالو۔کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تم کو کفر کا حکم دے جب کہ تم مسلم ہو؟" (آلِ عمران:79-80)

"بعد از خدا بزرگ توئی" یعنی رسول ﷺ سے اعلان کروایا گیا تو یہ:

" کہو میری نماز' میری قربانی' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا

میں ہوں" (انعام:162)

اولی الامر کی اطاعت تو ہے ہی اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ مشروط۔ اسی لئے تو تنازع کی شکل میں ان کی حدودِ اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔ لازم ہو جاتا ہے کہ قرآن و سنّت یعنی اللہ و رسول ﷺ کے احکامات و تعلیمات کی طرف مراجعت کی جائے۔

عبادت کے متعلق ایک اور بنیادی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ عبادت اسی طریقے پر کی جانی چاہیے جس طرح کہ قرآن و سنّت میں مذکور ہے۔ انسان کی صوابدید پر نہیں چھوڑا گیا کہ وہ خود کو تجربات میں الجھائے اور عبادت کیلئے خود طریقے وضع کرتا پھرے۔ عبادت کے انہی مختص طریقوں، سلیقوں اور عقیدوں کا نام ہی تو اسلام ہے۔ بنابریں انسان خواہ تاریخِ انسانی کے کسی بھی مرحلہ پر اس دنیا میں آئے، اللہ کے نزدیک اس کے زندگی گزارنے کا پسندیدہ طریقہ اسلام ہی ہے۔ قرآن میں آیا: "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کیے جنہیں کتاب دی گئی تھی سوائے اس کے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ انہوں نے علم آنے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کیلئے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکامات و ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے، اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی" (آلِ عمران:19)۔

اسی بات کی مزید تاکید و وضاحت کی تو اس طرح

"اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرے گا اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا" (آلِ عمران:85)

عبادت کے طریقہ میں جو قرآن و سنّت میں آ چکا کوئی تبدیلی کرنا خواہ وہ بزعمِ خویش زیادہ عبادت کے ہی لئے کیوں نہ ہو عبادت کو باطل کر دینا ہے۔ یہی مطلب اس کا کہ " آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا"۔ پھر نیکی وہی ہے جسے قرآن و سنّت نیکی قرار دیں اور اسی طرح بدی وہی ہے جسے قرآن و سنّت میں بدی گردانا گیا ہے۔ فطرت کی فیکٹری میں تیار ہونے والے انسان

کو اللہ تعالیٰ نے یونہی اس دنیا میں نہیں بھیج دیا بلکہ جیسے کہ کوئی بھی فیکٹری والا اپنی فیکٹری میں تیار ہونے والے پروڈکٹ کے ساتھ ہدایت نامہ بھی دیتا ہے اسی طرح پوری انسانی تاریخ پر انبیاءؑ بھی تشریف لائے ہیں اور کتابیں بھی نازل کی گئی ہیں۔ کتاب یعنی قانون کے ساتھ پیغمبرؐ کو بھیجا ہی اسی لئے جاتا ہے کہ وہ ایک زندگی گزار کر ہر کام کرنے کا نمونہ فراہم کرے۔

اسلام نام ہی من مرضی کو اللہ کے سپرد کرنے کا ہے۔ خود کوئی طریقہ وضع کرنا یا اللہ و رسول ﷺ کے علاوہ کسی اور کے وضع کردہ طریقے کو اپنانا' خواہ وہ بظاہر نیکوکاری ہو، شرک ہے اور اللہ کے ہاں ناقابلِ معافی جرم۔

کام کرنے کے طریقے دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ کہ جن میں وقت گزرنے کے ساتھ کسی ترمیم کی ضرورت نہیں۔ مثال کے طور پر اذان دینی ہے یا نماز پڑھنی ہے تو ان میں سے ہر ایک کے لئے طے شدہ طریقہ قرآن و سنّت میں موجود ہے۔ کسی کی کیا مجال کہ اس طے شدہ طریقہ میں موئے بھر کمی بیشی کرے۔ نوعیت کے حساب سے کام کرنے کا دوسرا طریقہ وہ ہے کہ جس میں وقت گذرنے کے ساتھ تبدیلی کا امکان ہے۔ اسلام نے ایسے کام کے لئے خود گنجائش رکھ دی ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ قرآن و سنّت سے استنباط کر کے اس میں ترمیم کر لی جائے۔ مثال کے طور پر دورِ نبوت میں اونٹ گھوڑے وغیرہ سے کام لیا جاتا تھا۔ آج موٹر کار' بس' ہوائی جہاز وغیرہ کی سہولت دستیاب ہے۔ مستقبل میں کوئی اور ذریعہ ٹرانسپورٹ وجود پذیر ہو سکتا ہے۔ ان جدید ذرائع آمدورفت کو استعمال میں لانے پر کوئی قدغن نہیں' البتہ ان کو استعمال کرنے والے وہی ضوابط قابلِ قبول ہونگے جو اونٹ اور گھوڑے کو استعمال کرتے وقت اختیار کئے گئے۔ اس میں رتی بھر شک نہیں کہ اگر یہ طریقے کا فیصلہ نہ کر دیا جاتا تو دنیا میں اتنے ہی دین ہوتے جتنے کہ انسان۔ اس صورت میں فی الحقیقت ہر شخص کا دین اصل میں نفس پرستی کا مظہر ہوتا۔ مثال کے طور پر بھارت کا ایک سابقہ وزیراعظم اپنا پیشاب پی لیتا تھا اس لئے کہ وہ من مرضی کی زندگی گذار رہا تھا' کسی آفاقی دین کا پابند نہیں تھا۔ مختصراً عبادت تبھی قرار پائے گی جب کوئی کام اسی طریقے سے کیا جائے جیسے کہ

قرآن وسنّت میں بیان ہوا بصورتِ دیگر عبادت تو کیا بدعت بلکہ بعض صورتوں میں بغاوت قرار پاتی ہے۔

عبادت کے سلسلہ میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ انسان دو عناصر یعنی مادی جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ اللہ کے ہاں عبادت وہی مقبول ہے جو ان دونوں یعنی روح اور مادی جسم کی متوازن بالیدگی کو یقینی بنائے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو درخور اعتناء نہ سمجھنا یا ایک کی قیمت پر دوسرے کو وقعت دینا دجالی پن ہے جس کے مہلک اثرات متعلقہ فرد پر بھی مرتب ہوتے ہیں تو معاشرے پر بھی۔ عالمی تناظر میں مغربی دنیا آج محض مادیت کا شکار ہے تو مشرقی دنیا میں مادی جسم کو مار مار کر روحانی بالیدگی کی غیر فطری اور غیر انسانی سب کوششیں تباہی کا پیش خیمہ ہیں۔ انتہائی غلط تصور ہے کہ مادی جسم روح کا قید خانہ ہے اور یہ کہ قید خانے کو کمزور کرنے سے روحانی ترقی ہوتی ہے۔ روح اور مادی جسم کا باہمی تعلق ویسا ہے جیسے کارخانے میں مشینری اور بلڈنگ کا۔ بہتر نتائج کے لئے ضروری ہے کہ مشینری اور بلڈنگ دونوں توانا ہوں۔ کوئی ایک بھی ان میں سے فرسودہ اور ناکارہ ہوگی تو دوسری خواہ کس قدر جدید ہو بے معنی و بے کار۔ بنابریں اللہ تعالیٰ نے روح اور مادی جسم دونوں کی فلاح کے لئے وسائل فراہم کئے ہیں۔ اندازہ کریں زمین' پانی' ہوا' سورج' چاند' ستارے' خنکی' گرمی' دن' رات غرضیکہ اَن گنت عوامل اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں تو تب کہیں جا کر دانۂ گندم تیار ہوتا ہے جو مادی جسم کی خوراک ہے اسی طرح انبیاءؑ و رسلؑ کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا عظیم انتظام روحانی خوراک فراہم کرنے کے لئے ہے۔ فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر' فریضۂ شہادت علی الناس' نماز' روزے' حج' زکوٰۃ' قربانی وغیرہ سب روحانی بالیدگی کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اور تو اور مادی جسم اور روح میں سے ہر ایک دوسرے کی فلاح و ترقی کا باعث ہے۔

ان ابتدائی اشارات کے بعد ہم " خلافت کے نظامِ عبادت " پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اسلام کا نظامِ عبادت

اس دھرتی کے خالق و مالک کے نزدیک عبادت کی اتنی اہمیت وضرورت ہے کہ وہ

عبادت ہی کو انسان کی تخلیق کا مقصد قرار دیتا ہے۔قرآن میں آیا:

"میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں" (ذاریات:52)

اشارات کی زبان میں قرآنِ مجید میں تخلیقِ آدم کے اور مقاصد بھی بیان ہوئے ہیں لیکن دوٹوک اور جلی حروف میں مقصدِ تخلیق آدم بیان ہوا ہے تو اسی جگہ پر۔ پھر جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں دیکھیں گے اللہ کی عبادت ایک ایسا مقصد ہے کہ اسے ادا کرنے سے دوسرے تمام مقاصد کا احاطہ بھی خود بخود ہو جاتا ہے۔قرآن مجید کی مذکورہ آیۂ مبارکہ سے انسان کی اس دنیا میں پیدائش و آمد کا مقصد تو واضح طور پر سامنے آ گیا لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی عبادت کا مفہوم کیا ہے کہ جو مقصدِ تخلیق آدم قرار پاتی ہے۔صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے انسان کے پیدا کئے جانے کا جو سیدھا سادھا مفہوم نکلتا ہے وہ تو یہی ہے کہ آدمی شادی بیاہ' معاشرت' معیشت' سیاست وغیرہ کے بکھیڑوں میں نہ الجھے حتیٰ کہ روزی کمانے کے چکر میں بھی پڑے' بس وہ ہو' تسبیح و مناجات ہوں' اللہ اللہ خیر سَلا۔اس مفہوم کو ذہن رکھ کر جب قرآن و سنّت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔تو اس مفہوم کو یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے۔کہ "لا رہبانیۃ فی الاسلام" کہ اسلام میں رہبانیت نہیں (مسند احمد)۔ اس کے برعکس تعلیمات قرآن و سنّت خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات کی بجائے سعی و جہد اور تکبیرِ مسلسل کا درس دیتی ہیں۔ نظامِ خلافت میں پروہتوں' پادریوں' ملنگوں' جوگیوں' گیانیوں' پنڈتوں' خرقہ پوشوں' منگتوں' پرائی روٹیوں پر گذر بسر کرنے والے پیروں' خانقاہی راہبوں' گدی نشینوں وغیرہ کا کوئی مقام نہیں۔ بدقسمتی سے معاصر دنیا میں بہت سے خود ساختہ مذاہب تھے' ہیں اور شاید رہیں گے کہ جن کے نزدیک جسمانی فربہی و خوشحالی' روحانی ترقی کے لئے سمِ قاتل ہے۔ان کے نزدیک جب تک جسم کو آدھ مرا اور آدھ مؤانہ کیا جائے' بالیدگیٔ روح ممکن نہیں۔ بنا بریں ان مذاہب کے پیروکاروں نے جسم کو بھوکا رکھنے' چیھتڑے پہننے' پراگندہ رہنے' جسمانی لذّات سے کنارہ کش ہونے کو روحانی ترقی کے لئے ناگزیر قرار دیا۔اس غلط تصور کے حاملین نے

نبیوں کا انکار کیا تو اس کی وجہ یہی گردانی کہ جو شخص کھاتا پیتا، بیوی بچے رکھتا اور صاف شفاف رہتا ہو اور دوسرے تمام دنیوی کام سرانجام دیتا ہو وہ نبی کیسے ہوسکتا ہے؟ قرآن میں آیا:

کہتے ہیں "یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا؟ یا اور کچھ نہیں تو اس کے لئے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ روزی حاصل کرتا۔ اور ظالم کہتے ہیں تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو" (فرقان: 7-8)

ان غلط تصورات کے برعکس اسلام ایک آفاقی و برہانی دین ہے جو اپنے ماننے والوں کو مظاہرِ عالم پر غور و خوض اور تسخیرِ کائنات کا درس دیتا ہے۔ دائرہ اسلام میں آنے والوں کو علم و معرفت کی تحصیل کے لئے سرتوڑ کوشش کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ انہیں معاشرے کا حصہ بلکہ خود معاشرہ بننے اور معاشرتی زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا ہے۔ انہیں بیوی بچوں، لواحقین، معاشرے اور ملک وملت بلکہ پوری انسانیت کی خدمت کے لئے ابھارتا ہے۔ امتِ مسلمہ کو "خیرِ امت" قرار دیتا ہے تو اس شرط کے ساتھ کہ وہ انسانیت کی اصلاح اور فلاح و بہبود کے لئے میدان میں اترے۔ اسلام واحد دین ہے جس کا ہر رکن محض اپنے لئے کماتا ہے نہ اپنے لئے رہتا ہے۔ وہ لازم قرار دیتا ہے کہ ایک مسلمان اپنی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ دوسروں کی فلاح و بہبود میں جتا رہے۔ اسلامی تعلیمات " جاھد و فی اللہ حق جہادہ " اور " لیس للانسان الا ما سعی " کا درس دیتی ہیں۔ ایک مسلمان کا وجود دوسرے انسانوں کے لئے خیر و ہمدردی اور تقویت کا سرچشمہ ہوتا ہے نہ کہ نحوست و بوجھ کا۔ نبیٔ کائنات ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے " خیر الناس من ینفع الناس " کہ تم انسانوں میں سے بہتر انسان وہ ہے کہ جو دوسرے کے لئے خیر و برکت اور باعثِ تقویت ہو۔

تارک الدنیا ہونا، رہبانیت اختیار کرنا اور دنیا داری کے جھمیلوں میں نہ پڑنا تو اسلام کے نزدیک بزدلی اور ذمہ داریوں سے فراری ہے اور بنابریں حرام ہے۔ ایک انسان کے پاس

ہاتھ پاؤں، ناک کان، روح جسم وغیرہ سب بطور امانت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ خاص سے آزمانے کی خاطر انسان کو ایک مقررہ مدت تک کچھ صوابدیدی اختیارات عطا کردیئے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان امانتوں کو ان کے مالک و خالق اللہ کی مرضی کے خلاف من مرضی یا کسی اور کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا خیانت ہے جس کا خمیازہ بہرحال اسے ایک دن بھگتنا ہے۔ نبی رحمت ﷺ نے مسلمان کی زندگی اس شخص کے مشابہ قرار دی جو کانٹے دار جھاڑیوں سے تو بہر صورت گذرے لیکن اس طور کہ دامن بچا بچا کر۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ "عبادت" جو مقصدِ تخلیقِ آدم ہے اگر دنیا سے کنارہ کشی اور راہبانیت وغیرہ نہیں تو پھر کیا ہے؟ شومیٔ قسمت وقت کے ساتھ ساتھ دینِ حق بھی اپنی اصل پر نہ رہنے دیا گیا۔ بنابریں مسلمانوں میں بھی مفہوم وطرزِ عبادت میں فرق آچکا۔ مختلف فرقے بلکہ مذاہب وجود میں آگئے۔ مسجدیں علیحدہ ہوگئیں۔ تصورات و رسومات میں اس قدر فرق آگیا کہ سینکڑوں فرقے معرضِ وجود میں آگئے۔ نظامِ خلافت ختم ہوا تو جو جدھر چاہا، چل نکلا۔ آج ہمارے ہاں اَن گنت طریقہ ہائے عبادت یا طریقہ ہائے زندگی مروّج ہیں۔ مشکل ہوگیا یہ پہچاننا کہ ان میں سے وہ کونسا طرزِ عبادت ہے کہ جو مقصدِ تخلیقِ آدم قرار پانے کا اہل ہو۔

ولے تاویلِ آں در حیرت انداخت

خدا و جبرائیل و مصطفےٰ را

آئیں پہلے ان مختلف مروّجہ طریقہ ہائے عبادت کا اختصار سے جائزہ لیں۔

مسلمان عوام الناس کا ایک طبقہ تو وہی ہے کہ جو عبادت کو تقریباً اسی معنی میں لیتا ہے کہ جس کا ہم اوپر رہبانیت کے تحت ذکر کرآئے۔ رہبانیت نہیں تو ہمارے ہاں کا خانقاہی نظام اسی کا پر تو، اسی کا عکس بلکہ رہبانیت کے بطن سے ہی جنم لئے ہوئے ہے۔ خانقاہوں، مزاروں پر چلے جائیں آپ کو ہر رنگ کے دین کے دعوے دار مل جائیں گے۔ چیتھڑوں والے، رنگ برنگی ٹوپیوں، چادروں اور کپڑوں والے، پراگندہ خیالوں والے، کشکول والے، عصا والے، زنجیروں والے، منکوں اور

مالا والے' ٹل اور ٹلیون والے' نعروں والے' خود کو ولی جتانے والے' اپنی الوہیت کا ڈراوا دینے والے غرضیکہ آپ کو ایک ہی جگہ پر بزعمِ خویش دین کے علمبرداروں کی ہر ورائٹی مل جائے گی۔ پھر آپ کو انہیں کے سرپرست' اونچی مسندوں والے' کج کلاہوں والے' بڑے پیاروں اور اونچے میناروں والے' بزعمِ خویش ہدایت و رشد کے سرچشموں سے بھی پالا پڑے گا۔ سوختہ بختی ہمیں ایک مدت ہندوؤں' جوگیوں' سادھوؤں وغیرہ کے ساتھ رہنا پڑا۔ یہ سب انہی کی باقیات ہیں۔ ان کا طرزِ کلام کرامت' طرزِ دین طریقت اور طرزِ واردات ظاہر کی بجائے باطن۔ کتنا فرق پڑ گیا چودہ سو سالوں میں۔ درہ عمر برقرار رہتا تو کسی کی کیا مجال کہ دین کے ساتھ یوں مذاق کرتا۔

مسلمانوں کا ایک اور طبقہ بلکہ اکثریت اس لئے مسلمان ہے کہ وہ چار و ناچار مسلمان گھرانوں میں پیدا ہو گئی' ان کے نام مسلمانوں کے سے ہیں اور مردم شماری کے فارم میں انہیں مسلم لکھا جاتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے کہ جو دین کے کم سے کم مطالبہ یعنی نماز روزے سے ماوراء ہے۔ دورِ نبوت میں تو منافقین تک پانچوں نمازوں کی پابندی کرتے تھے' کوئی ایک نماز چھوڑنے کا تصور نہیں تھا۔ انحراف ہوا تو بتدریج۔ کبھی کسی کی ایک نماز قضا ہو گئی' پھر وقت آیا کہ چھوٹنے ہی لگی' پھر دو تین نمازوں سے گزارا ہونے لگا' آج نوبت بایں رسید کہ تمام عمر نماز نہ پڑھو' مسلمانی بہرحال قائم۔ کیا مجال کوئی کمی محسوس کرتا ہو۔

مسلمانوں کا ایک وہ بھی طبقہ ہے کہ جو معترض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہ سوچا کہ پانچ وقت نماز ادا کرنا آیا انسان کے بس میں ہے بھی کہ نہیں؟ اتنی نمازیں اور پھر ہر روز! زیادہ سے زیادہ ہفتہ بھر میں ایک دو بار کی حاضری چاہیئے تھی۔ یہ طبقہ لبرل ازم اور روشن خیالی کے زعمِ باطل میں ویسے ہی مسلمان کیمپ سے فراری اختیار کئے ہوئے ہے۔ نماز روزے' حج' زکوٰۃ وغیرہ کو غیر ضروری قرار دیتا ہے' کئی ان میں سے وہ بھی کہ جو کیلکولیٹر لے کر جمع تفریق کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ایک دن میں ایک مسلمان نمازوں میں کتنا وقت ضائع کر دیتا ہے اور مجموعی طور پر پوری امّت کا اس ایک مد میں کتنے وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ یہی طبقہ جانوروں کی قربانی کو ایک سانحہ اور قومی ضیاع قرار دیتا ہے۔ یہی وہ

طبقہ ہے کہ جو پرچار کرتا ہے کہ پردہ تو محض آنکھ کا ہے' عورتوں میں برقع اور مردوں میں داڑھی تو اپنے عیب چھپانے کی سازش ہے۔اس میں کیا شک نزولِ قرآن کے وقت اس ذہنیت کے لوگ ہوتے تو منافقین کی صف میں کھڑے کر دیئے جاتے لیکن آج وہ مسلمان ہیں اور دھڑلے سے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

مسلمانوں کا ایک اور طبقہ محض "سراب" ہے۔نماز روزے کا بڑا پابند لیکن مسجد کی حدود سے نکلتے ہی بھول جاتا ہے کہ ہر کام کرتے وقت قرآن سنّت کی تعلیمات کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہے۔ دورانِ کار بھی ہوسکتا ہے کہ تسبیح کے دانے گن رہا ہو۔حاجی' صوفی' حضرت وغیرہ کہلانے کا بڑا حریص۔دولت کا پجاری۔نماز پڑھ کر سمجھتا ہے کہ جنت تو پکی ہوگئی' اب دنیا بناؤ۔اس کی مثال اس ریل ڈرائیور کی سی ہے کہ جو والٹن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ سے بہت اچھے نمبروں پر پاس ہوا ہو۔کئی مضامین میں فسٹ پوزیشن تک حاصل کی ہو لیکن جب گاڑی چلانا شروع کرے تو پشاور کی بجائے کراچی کو چل نکلے۔گاڑی جس اسٹیشن پر کھڑی کرنا ہو' نہ کرے اور جس پر کھڑی نہ کرنی ہو' کھڑی کر دے۔غرضیکہ مجسمہ فساد ہو' ریلوے کے پورے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دے۔

مسلمانوں کو ایک اور طبقہ ہے جو عام آدمی سے لیکر یونیورسٹی کے پروفیسروں' دارلعلوم کے مہتموں اور ایوانِ سیاست کے دانشوروں پر مشتمل ہے۔اکثر و بیشتر مشروع چہروں والا' فرائض کے علاوہ نوافل کا بھی دلدادہ' دیگیں چڑھانے والا' وقفے وقفے سے قرآن خوانی' نعت خوانی اور میلاد کی محفلیں منعقد کرنے والا' کسی نہ کسی مسلک کا شکار' بظاہر بڑا متقی و پرہیز گار لیکن بایں ہمہ "نہ خود بیں نہ خدا بیں نہ جہاں بیں"۔دنیا میں کفر کا غلبہ ہو' سیاست وسیادت کرپٹ ہاتھوں میں ہو' معیشت سودی ہو' نظامِ خلافت معدوم ہو' امتِ مسلمہ تحلیل ہو کر اقوام کا روپ دھار گئی ہو' اولی الامر کا وجود تک نہ ہو غرضیکہ دینِ حق کی بساط الٹ چکی' اس طبقہ کی بلا کو۔اس کو جو سجدہ کی اجازت ہے سمجھتا ہے سب "اے ون" ہے۔اس کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ رسول ﷺ نے محض

نماز روزے پر ہی اکتفا نہ کیا۔ نبیٔ کائنات ﷺ اور صحابہ ؓ نے صعوبتیں جھیلیں' مشکلات سے دوچار ہوئے' تن من دھن کی بازی لگادی لیکن نظامِ باطل......سودی معیشت' رسومات وبدعات' بغاوت پر مبنی سیاست وسیادت کے ساتھ یک قدم چلنے سے انکار کر دیا۔ چین سے نہ بیٹھے جب تک کہ دینِ حق کو ادیانِ باطلہ پر غالب نہ کر دیا۔ مذکورہ طبقہ اصل میں اسلام کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ مسلمانوں کی پسماندگی ودرماندگی کا زیادہ تر ذمہ دار یہی طبقہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا جرم یہی کہ دینِ حق سے کوسوں دور ہوتے ہوئے خود کو عین دین دار بلکہ دین کا علمبردار سمجھتا ہے۔ یہودیوں کی طرح یوں جیسے جنت اپنے نام خاص کرا چکا۔ دین کو مذہب کا روپ دیا تو اسی طبقے نے۔ مغلوبیت پر قانع اور باطل کا رسیا ہو چکا تو یہی طبقہ۔ احساسِ زیاں سے عاری' جشن' جوبلیاں اور میلادیں منانا اس کا مرغوب مشغلہ' مسلمان دنیا میں لٹ گیا' اس کی بلا کو۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے چند ایسے طریقہ ہائے عبادت بیان کئے کہ جو وقت کے اس موڑ پر مسلمانوں میں رائج ہیں۔ ان کا مختلف النوع ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں سے کوئی طریقہ بھی ایسا نہیں کہ جو مقصدِ تخلیقِ آدم قرار پانے اور انسان کی نجات وفلاح کا باعث بننے کا اہل ہو۔ حقیقتاً یہ تمام طریقہ ہائے عبادت معرضِ وجود میں آئے تو ہمارے ہاں کی مرکزیت یعنی نظامِ خلافت کے درہم برہم ہونے سے۔ پوچھنے والا جب کوئی نہ رہا تو جس کا جدھر چاہا منہ اٹھا کر چل نکلا۔ یہ تمام طریقے اسی ضمن میں آتے ہیں جنکا قرآنِ مجید میں ذکر آیا تو یوں:

"انہوں نے روشن ہدایت پالینے کے بعد محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے" (بقرہ:213)۔

اصل مفہومَ عبادت:

سورۂ ذاریات کی مذکورہ آیت سے ایک بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان سے چند گھنٹوں' دنوں یا سالوں کی نہیں پوری زندگی کے ہر لحظہ اور ہر لحظے کے ہر حصے کی عبادت مطلوب ہے۔ بالفاظِ دیگر ایسی عبادت جو محض مسجد ومصلیٰ تک محدود ہو قابلِ قبول نہیں۔

کھیت میں، دوکان میں، دفتر میں، کچہری میں، غرضیکہ ہمہ وقت، ہر جگہ اور ہر حالت میں مطلوب ہے تو بس عبادت۔ یہی مطلب ہے "ادخلوا فی السلم کافہ" کا۔ ایسی عبادت کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ایک انسان اس طریقۂ زندگی میں داخل ہو کہ جس کے متعلق رب کائنات نے فرمایا "میں نے اسلام کو تمہارے لئے بطور دین پسند کیا ہے" (مائدہ:3)۔ یہ بھی فرمایا کہ "تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو" (آلِ عمران:102)۔ نہ صرف یہ کہ تم ذہناً، عقیدۃً اور عملاً مسلمان ہو بلکہ نام کے بھی "مسلم" ہو۔ "مسلم" کی بجائے خود کو تمہارا یہودی، نصاریٰ، دیوبندی، بریلوی، شیعہ، سنی وغیرہ کہلوانا انحراف شمار ہوگا۔

دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا مرحلہ طے ہونے کے بعد دوسرا مرحلہ زندگی گزارنے کا ہے۔ مسلمان کی زندگی انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ اللہ تعالیٰ کو مسلمان سے انفرادی و اجتماعی دونوں دوائر کی زندگی میں مطلوب ہے تو بس عبادت۔ پہلے ہم مسلمان کی انفرادی زندگی زیرِ بحث لاتے ہیں۔ انفرادی سطح پر ہر مسلمان ...... عورت ہو یا مرد، کے قبضہ میں تھوڑے ہوں یا بہت، کچھ اثاثے ضرور ہوتے ہیں۔ ان اثاثوں کو جب ایک مسلمان استعمال کرتا ہے تو ہر ہر استعمال سے نیکی سرزد ہو رہی ہوتی ہے یا بدی، تیسری کوئی چیز نہیں۔ سب سے پہلا اثاثہ مسلمان کا اپنا جسم ہے جو ہر امیر و غریب کو میسر ہے۔ جسم چند اعضاء کے مجموعے کا نام ہے۔ دل، کان، آنکھ، زبان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ سب اعضاء ہیں۔ ہر انسان کے ہر عضو کی کارکردگی دو طرح کی ہے۔ ایک کارکردگی تو وہ کہ جو متعلقہ انسان کے بس میں ہوتی ہے اور دوسری وہ کہ جو اس کے بس میں نہیں ہوتی۔ کارکردگی کا بس میں ہونا بھی انسان کا اعزاز ہے یا جن کا۔ دل کا طبعی طور پر کام کرنا متعلقہ انسان کے بس میں نہیں ہوتا البتہ چلتے ہوئے دل کو استعمال میں لانا اس کے بس میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اگر دل کا چلنا بھی متعلقہ انسان کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی مرنا پسند نہ کرتا۔ اس طرح ایک دھریئے کے دل کا چلنا بھی چونکہ دھریئے کے نہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند ہوتا ہے لہذا ایک دھریہ بھی اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی تعریف میں رطب اللساں ہوتا ہے اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ

" کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو" صادق آتا ہے۔

جب بھی جسم کا کوئی عضو بمثل ہاتھ' پاؤں' کان' زبان وغیرہ حرکت کرتا ہے یا استعمال میں لایا جاتا ہے تو نیکی کا ارتکاب ہو رہا ہوتا ہے یا برائی کا' تیسری کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح ایک مسلمان جب اپنے دوسرے اثاثے بمثل زر' زمین وغیرہ استعمال میں لاتا ہے تو ہر استعمال ثواب کا موجب ہوتا ہے یا گناہ کا تیسرا کوئی متبادل نہیں۔ ایسا کوئی استعمال کہ جو نہ ثواب پر منتج ہو نہ گناہ پر ظاہر ہے غیر مؤثر تصور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میں نے انسان کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے یہ مفہوم رکھتا ہے کہ پہلے تو انسان مسلمان ہو اور مسلمان ہوتے ہوئے اپنے جسم کے ہر عضو اور دیگر اثاثوں کے ہر استعمال کو نیکی کے لئے بروئے کار لائے بدی کے لئے کبھی نہیں۔ یہ نیکی کیلئے استعمال کرنا اور پوری زندگی ایسی روش اختیار کئے رہنا ہی وہ عبادت ہے کہ جو مقصدِ تخلیق آدم ہے۔

یہاں پر ایک فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے کہ نیکی کونسی ہے اور بدی کونسی؟ ایک انسان مثال کے طور پر اسقاطِ حمل کو نیکی سمجھتا ہے جب کہ دوسرا بدی' بالفاظ دیگر کوئی ایسا ازلی وابدی معیار ہونا چاہیے کہ جو تمیزِ نیکی و بدی کو ہمیشہ کے لئے طے کر دے۔ پوری انسانی تاریخ پر یہ کام مسلسل بعثتِ انبیاء اور تنزیلِ صحائف سے لیا گیا ہے۔ کسی انسان کی صوابدید پر یہ اہم کام چھوڑا ہی نہیں گیا' اللہ تعالیٰ کے پلان کے مطابق قبل از قیامت موجودہ دور میں قرآن و سنّت ہی معیارِ نیکی و بدی ہے۔ بالفاظِ دیگر جب بھی ایک مسلمان کی آنکھ نیکی کر رہی ہوتی ہے تو متوازاً وہ قرآن و سنّت کے کسی حکم کی پیروی بھی کر رہی ہوتی ہے اور اسی طرح جب وہ بدی کی مرتکب ہو رہی ہوتی ہے تو متوازاً قرآن و سنّت کے کسی حکم کی مخالفت بھی کر رہی ہوتی ہے۔ بنا بریں عبادت کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ ایک مسلمان اپنے اثاثوں کو ہمیشہ قرآن و سنّت کی پیروی میں استعمال کرے' مخالفت میں کبھی نہیں۔ پھر جب ایک مسلمان کا اٹھنا بیٹھنا' اوڑھنا بچھونا' کھانا پینا' دوستی کرنا' دشمنی کرنا' جنگ کرنا' صلح کرنا غرضیکہ ہر ہر کام قرآن و سنّت کے مطابق ہو جاتا ہے تو حقیقت کے اعتبار سے وہ چلتا پھرتا قرآن بن جاتا ہے۔ بقولِ اقبالؒ:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

یہ تو ہم نے ایک مسلمان کے اثاثوں کے استعمال کا ذکر کیا لیکن اس کا ہر ہر کام خواہ وہ کاشتکاری کے متعلق ہو یا تجارت کے' طب کے متعلق ہو یا عدالت وغیرہ کے اسی طرح ثواب کا موجب ہوتا ہے یا گناہ کا' تیسرا کچھ نہیں۔ مثال کے طور ہر ایک جج تین سال سماعت کے بعد ایک مقدمے کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ خود تو موقع پر موجود نہیں ہوتا لہذا اسے گواہوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جج خلوصِ نیت سے بھی فیصلہ کرے تو امکان ہوتا ہے کہ فیصلہ صحیح ہو جائے یا غلط۔ بنا بریں شریعت کی رو سے اگر فیصلہ صحیح ہو جائے تو تین سال کا عرصہ عبادت گردانا جاتا ہے اور دہرے ثواب کا مستحق۔ فیصلہ اگر غلط ہو جائے تب بھی چونکہ فیصلہ خلوصِ نیت پر مبنی ہوتا ہے لہذا اکہرے ثواب کا موجب بنتا ہے۔ تاہم وہی جج اگر فیصلہ میرٹ کی بجائے کسی دباؤ یا لالچ میں آ کر کرتا ہے تو تین سال کے وقت کا وہ حصہ جو وہ اس مقدمے پر صرف کرتا ہے اس کے نامۂ اعمال میں بطورِ گناہ لکھ لیا جاتا ہے۔ ہر ہر کام کی حیثیت یہی ہے خواہ وہ کھیت میں کیا جائے' دکان میں کیا جائے یا کسی دفتر وغیرہ میں۔ عبادت کے مقصدِ تخلیق آدم ہونے کا مطلب یہی ہے کہ وہ ثواب کا باعث ہو' گناہ کا کبھی نہیں۔

جہاں تک اجتماعی دائرہ کار کا تعلق ہے تو یہ دائرہ مزید دو طرح کے کاموں پر مشتمل ہے۔ ایک تو وہ اجتماعی کام ہیں جو محلے یا معاشرے کی سطح کے ہیں جیسے امورِ رفاہِ عامہ یا نماز کا باجماعت پڑھنا وغیرہ۔ دوسرے وہ اجتماعی کام ہیں جو امت کی سطح پر کیے جانے مطلوب ہیں بلکہ امّت مسلمہ کے فرائضِ منصبی ہیں۔ دونوں طرح کے مذکورہ کام خواہ وہ معاشرتی سطح کے ہوں یا امتی سطح کے اسی طرح نیکی یا بدی قرار پاتے ہیں جیسے کہ انفرادی سطح کے کام اس بنیاد پر کہ آیا وہ قرآن وسنّت کی پیروی میں ہیں یا نہیں۔ البتہ خلافت کے حوالے سے ہم یہاں وہ کام زیرِ بحث لاتے ہیں جو امّت کی سطح کے ہیں۔ قرآن وسنّت کی رو سے بشمول اور کئی کاموں کے تین بڑے بڑے فرائض منصبی ہیں کہ جو امت کی سطح پر کیے جانے درکار ہیں۔ یہ تین فرائض منصبی ہیں فریضۂ شہادت علی الناس یعنی قرآن وسنّت کی تعلیمات کو بالخصوص

ان انسانوں تک پہنچانا کہ جو غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہو گئے (بقرہ:143)' فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی اس دنیا کو بگاڑ سے بچانا اور سنوار کے رکھنا (آلِ عمران:110)' اور دنیا بھر کی قیادت پر متمکن ہونا یا دینِ حق کو ادیانِ باطلہ پر غالب رکھنا (آلِ عمران:110' انفال:39)۔ یہ تین فرائضِ منصبی ظاہر ہے گنتی میں تو چند ہیں لیکن عواقب ونتائج کے اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ ادا نہ ہو پائیں تو انفرادی ومعاشرتی سطح کے دین پر کماحقہٗ عمل ہو ہی نہیں سکتا۔

شومئی قسمت ان فرائض منصبی کا مسلمانوں نے صدیوں سے ورق پھاڑ رکھا ہے۔ نظامِ خلافت کے اٹھ جانے سے زیرِ آسماں دو مہیب منفی تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو اولی الامر کا وجود نہ رہا' دوسرے امت' اقوام ...... مصری قوم' ایرانی قوم' شامی قوم وغیرہ کا روپ دھار گئی' اولی الامر میں شامل تو گورنر' وزراء' جج صاحبان' افواج اور دوسرے اداروں کے سربراہان' اہلِ فکرو دانش سب ہیں لیکن ان میں مرکزی حیثیت خلیفۂ وقت کی ہوتی ہے اور یاد رہے خلیفہ کوئی عام حکمران نہیں پوری اسلامی دنیا کا سربراہ ہوتا ہے۔ اولی الامر کی اطاعت کے بغیر اسلام میں اقامتِ دین اور وجودِ دین کا کوئی تصور نہیں۔ اس لئے کہ قرآن میں محض "اطیعو اللہ " ہی نہیں آیا "اطیعوالرسول و اولی الامر منکم " بھی آیا ہے۔ ہمارے ساتھ حادثہ یہ ہوا ہے کہ آج من بعدِ رسالت قرآن وسنّت کی شکل میں' اسبابِ اقامتِ دین تو من وعن موجود ہیں لیکن یہ اسباب اولی الامر کی شکل میں قوتِ نافذہ نہ ہونے کی وجہ سے دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں۔ اولی الامر کے بغیر دین فی الحقیقت بے دینی کا روپ اختیار کر گیا ہے۔ دینِ اسلام کو قائم رکھتے تو ہمیں اس کی برکات بشمل غلبۂ دین' امن' عدل اور خوشحالی حاصل ہوتیں۔ ان برکات کے برعکس آج ہم مغلوبیت' دہشت گردی' ظلم اور بدحالی سے دوچار ہیں تو اسی لئے کہ دنیا میں آج امت موجود ہے نہ اولی الامر۔ امت کے نہ ہونے سے ہم جماعت سے نکل گئے تو اولی الامر کے نہ ہونے سے اطاعت سے نکل گئے۔ بالفاظ دیگر ہم پھر دورِ جہالت کی طرف لوٹ گئے نبیٔ رحمت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"جو اطاعت سے نکل گیا اور جماعت میں نہ رہا' پھر ایسے میں مرا تو جہالت کی موت

مرا"۔(مسلم)

ہم آج ذلت ورسوائی سے دوچار ہیں تو کوئی بے وجہ نہیں۔

عبادت کا مفہوم جو اوپر بیان ہوا اس قدر مشکل، کٹھن اور صبر آزما ہے کہ اس پر وہی پورا اتر سکتا ہے کہ جس کی مسلسل تربیت اور وقفے وقفے سے یاددہانی ہوتی رہے۔نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ان کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر انہیں نہ صرف فرض بلکہ اسلام کے ارکان قرار دیا گیا ہے۔ان ارکانِ اسلام کو ادا کئے بغیر دوسرے دوائر کی نیکیاں اسی طرح بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں کہ جس طرح وہ نماز روزہ قبول نہیں کہ جو مسلمان کو ہر دوسرے دائرہ میں عابد نہ بنائے۔

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں

حرفِ آخر

انسان سے سرزد ہونے والا ہر کام عبادت ہوتا ہے یا بغاوت، تیسری کوئی چیز نہیں۔اللہ ربُ العزت کا فرمان ہے کہ یہ ہمیشہ عبادت ہو بغاوت کبھی نہیں۔محض نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہی عبادت نہیں، ہر چھوٹا بڑا کام کرتے وقت ہمیشہ اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع رکھنا، اپنے اثاثوں حتیٰ کہ جسم کے اعضاء تک کی ہر حرکت کو قرآن وسنّت کا پابند کرنا بھی عبادت ہے۔جوتی کا تسمہ باندھنے سے لیکر شہادت علی الناس جیسے بین الاقوامی امور عبادت قرار پاتے ہیں بشرطیکہ وہ ایک تو قرآن وسنّت کی تعلیمات واحکامات کے مطابق ہوں اور دوسرے اللہ ورسول ﷺ کے دیئے ہوئے طریقہ کے مطابق ہوں۔پھر سو بات کی یہ ایک بات کہ مذکورہ مفہوم کی عبادت کہ جو مقصدِ تخلیق آدم قرار پائے ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ وہ نظام دنیا میں رواں دواں نہ ہو کہ جس کا نام ہے......نظامِ خلافت۔بنابریں قیام ودوامِ خلافت کی جدوجہد اصل اور حتمی عبادت ہے۔وہ مسنون زندگی نہیں جو ایسی جدوجہد کے بغیر ہو۔

خلافت کا نظامِ معاشرت

کسی بھی معاشرتی نظام کی تشکیل ونوعیت اس دستور وآئین کی مرہونِ منت ہوتی ہے کہ جس سے متعلقہ معاشرہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ روسی معاشرہ مختلف ہے امریکی معاشرے سے اس لئے کہ ہر دو کا دستور علیحدہ علیحدہ ہے۔ دستور کی علیحدگی کا اثر اس حد تک کہ دونوں ممالک میں اکثر و بیشتر بنیادی انسانی حقوق مختلف بلکہ بعض صورتوں میں متضاد ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ میں انفرادی حقِ ملکیت مسلمہ ہے جبکہ روس میں نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرد کا حقِ ملکیت ''انسانی حق'' ہے کہ نہیں؟ اگر کہا جائے کہ ہے تو اس کا مطلب ہے روس غلط کر رہا ہے اور اگر کہا جائے کہ نہیں تو ظاہر ہے امریکہ غلط قرار پاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ثابت ہوا کہ قومی دستور انسانی حقوق کا تحفظ نہیں کرسکتا۔ بنابریں ضرورت محسوس کی گئی کہ کوئی منشور انسانی سطح پر بنایا جائے جو انسانی بنیادی حقوق کی حفاظت کر سکے۔

اس ضرورت کی تکمیل میں عالمی سطح پر اقوامِ متحدہ کا ادارہ بنایا گیا۔ اقوامِ متحدہ نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو انسانی بنیادی حقوق کے متعلق ایک منشور تیار کیا جو اس وقت ۳۰ دفعات پر مشتمل تھا اور بعد میں اس میں کئی تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں جیسا کیا جانا کسی بھی انسان ساختہ دستاویز کے لئے لازمی ہے۔ انسانی سطح پر تیار کردہ یہ منشور بھی انسان کو اپنی اپنی حکومتوں کی قہرمانیوں سے نہ بچا سکا ورنہ ایک ملک میں انفرادی ملکیت کا حق مسلمہ اور دوسرے میں ممنوع کا سلسلہ ختم ہو کر عالمی معاشرے میں یکسانیت آجاتی۔ عالمی سطح پر انسان ساختہ یہ منشور بھی کئی وجوہات کی بنا پر ناکام ٹھہرا۔ ایک تو شروع میں اس کی ہیئت میں چور دروازہ رکھا گیا۔ بوجوہ اس کا ایک ذیلی ادارہ جسے سلامّتی کونسل کا نام دیا گیا میں کچھ ممالک کو مستقل رکنیت اور ویٹو پاور کا حامل بنایا گیا جب کہ چند دوسرے ارکان غیر مستقل قرار پائے جو باری باری چند سالوں کے لئے رکن بنائے جاتے ہیں۔ ویٹو پاور ممالک کو یہ حق دیا گیا کہ دوسرے تمام ممالک خواہ متفقہ کوئی قرارداد پاس کریں' ان میں

سے ہر ایک تن تنہا اس کی دھجیاں اڑا سکتا ہے۔ یوں انسانی بنیادی حقوق کی اول روز سے نفی کی گئی۔ اقوامِ متحدہ کے حقوق کا ہی جب گلا دبا دیا گیا تو انفرادی انسانی حقوق کا کیا سوال؟

پھر یہ عالمی انسانی منشور بلکہ خود اقوامِ متحدہ کا ادارہ اس لئے غیر مؤثر ہو گیا کہ اس کی حیثیت ایسی جیسی کہ محض واعظ و ناصح کی۔ کوئی ملک اس کے فیصلوں کو نہ مانے تو یہ اتنا بھی نہیں کرتا کہ متعلقہ ملک کی اور نہیں تو کم از کم رکنیت ہی معطل کر دے۔ پھر واقعات کی دنیا میں چند عیار ممالک نے اپنے غیر معمولی اثر کی وجہ سے اس عالمی ادارے کو ویسے ہی گھر کی لونڈی بنا رکھا ہے۔ مفاد پرستوں نے جس ملک کو دبانا ہو یا نوازنا ہو' اقوامِ متحدہ کے اس ادارے کو بطور لیور استعمال کرتے ہیں۔ بنایا تو تھا انسانی حقوق کا عالمی منشور لیکن بن گیا آخر وہ جنگل کا قانون ''جس کے پاس دانے اس کے کملے بھی سیانے''۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ قومی دساتیر ہوں یا عالمی انسانی منشور' آخر ناکام کیوں ہوئے ہیں؟ بات دو اور دو چار کی طرح واضح کہ اصل میں ان کے بنانے والوں کو قانون سازی کا حق ہی نہیں۔ یاد رہے انسان کیلئے قانون سازی وہ ہستی یا ادارہ کر سکتا ہے جو کم از کم تین صفات کا حامل ہو۔ پہلی صفت یہ کہ وہ غیر جانبدار ہو' اپنے لئے کسی ویٹو پاور وغیرہ کی گنجائش پیدا نہ کرے بلکہ اس کا اپنا کوئی مفاد ہو ہی نہ۔ دوسرے یہ کہ وہ پوری انسانی تاریخ پر ہر لمحہ' ہر جگہ موجود ہو۔ کیونکہ قانون جنسِ انسان کے لئے مطلوب ہے' لہٰذا اس کا ہونا اس وقت بھی لازمی ہے کہ جب پہلا انسان اس کرّۂ ارض پر وارد ہوا اور اس وقت بھی جب کہ آخری پیدا ہونے والا انسان آخری سانس لے رہا ہوگا۔ اس کی تیسری صفت یہ کہ وہ قدیر ہو۔ اس کے فیصلے کو کوئی ٹال نہ سکے اور اس کے کام میں کوئی مزاحم نہ ہو۔ وہ قانون شکنی کرنے والے کو سزا اور بھلائی کرنے والے کو صرف اپنی مرضی کے مطابق نواز سکے۔ سب اس کے محتاج ہوں' وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ کوئی مجرم ہر دوسری آنکھ سے چھپ جائے تو چھپ جائے' قانون ساز سے نہ چھپ سکے۔ غور فرمائیں' بار بار غور فرمائیں' زمین و آسمان میں صرف اللہ تعالیٰ کی واحد ہستی ہے جو ان تینوں اوصاف پر بدرجۂ اتم پوری اترتی ہے۔ پھر ربِ کائنات محض حاکم و قانون ساز ہی نہیں' ہر شے کا مالک بھی وہی ہے تو خالق و رزاق بھی۔

کوئی بھی مشین بنانے والا محض مشین ہی نہیں بناتا بلکہ مشین کے ساتھ ایک گائیڈ بک بھی بناتا ہے جس میں پوری ہدایات ہوتی ہیں کہ اس مشین کو کیسے استعمال کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی محض انسان کو پیدا ہی نہیں کیا' قدرت کی فیکٹری میں تیار ہونے والی اس مشین کے ساتھ گائیڈ بک یا ضابطۂ حیات بھی دیا ہے۔ ہر دور میں جب بھی وہ کسی قوم میں پیغمبرؑ بھیجتا رہا ہے تو ساتھ آسمانی کتابوں کی شکل میں انسانی منشور بھی بھیجتا رہا ہے۔ منشور کے ساتھ وہ انسانوں ہی میں سے پیغمبرؑ بھیجتا رہا ہے تو اس لئے کہ وہ منشور کے مطابق ایک زندگی گزار کر نمونہ پیش کر دے تا کہ منشور کو سمجھنے میں غلطی نہ لگے۔ تورات' زبور' انجیل' قرآن وغیرہ اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ چونکہ تمام ان صحائف کا ماخذ اور سرچشمہ ایک تھا' بالآخر مطلوب ومقصود بھی ایک تھا لہٰذا ہر دور میں نازل ہونے والی کتاب سابقہ کتب کی تصدیق وتجدید میں تھی۔ انسانی تاریخ کے ایک مرحلے پر پہنچ کر جب انسانیت ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اپنے عروج پر پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی شکل میں اپنا آخری' مکمل اور حتمی قانون دے کر نہ صرف آسمانی کتابوں کی تنزیل کا سلسلہ منقطع فرمایا بلکہ اسے تا قیامت ازلی وابدی قانون کی حیثیت دے کر سلسلۂ نبوت کو بھی ختم کر دیا۔ محمد رسول اللہ ﷺ نہ صرف قومی سطح کی بجائے انسانی سطح کے رسول ﷺ ٹھہرے بلکہ انہیں آخری نبی ﷺ ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اعلان کر دیا گیا:

''اے محمد! کہو کہ اے انسانو میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جو زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں' وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی' امید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے'' (اعراف: 158)

اللہ تعالیٰ کے اس آفاقی وسرکاری فرمان میں نہ صرف رسول ﷺ کے مرتبے ومقام کو بیان کیا گیا بلکہ بادشاہِ کون ومکان' ربِ کائنات کی حیثیت وقدرت کا بھی احاطہ کیا گیا تا کہ پتہ چل جائے کہ آنے والا کون ہے اور بھیجنے والا کون؟ اب تا قیامت چونکہ اللہ ورسول ﷺ کے احکامات یا قرآن وسنّت ہی انسانی منشور ہے' آئندہ صفحات میں اسی دستور پر مبنی معاشرتی نظام کو

زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

اسلام کا معاشرتی نظام

قرآن بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آدمؑ اور حوّا کو پیدا کیا۔ اسی ایک جوڑے سے پیدا ہونے والے تمام انسان نہ صرف ایک نسل ہیں بلکہ ایک مدّت تک تو وہ ایک ہی امّت تھے۔ ان کا دین ایک تھا اور وہ ایک ہی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ البتہ وقت کے ساتھ جوں جوں دنیا میں ان کا پھیلاؤ ہوتا گیا' ان کا رہن سہن' زبان' لباس وغیرہ میں فرق آتا گیا۔ یوں ان گنت کنبے' قبیلے اور قومیں وجود میں آتی گئیں۔ قرآن میں آیا:

''ابتدا میں پوری انسانیت ایک ہی طریقہ پر تھی (پھر یہ حالت نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے جو (راست روی پر) بشارت دینے والے اور (کجروی کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تا کہ حق کے بارے میں جو اختلافات رونما ہوگئے' ان کا فیصلہ کریں'' (بقرہ:213)

تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقتاً فوقتاً نازل ہونے والی ان ہدایات و احکامات اور مبعوث ہونے والے انبیاءؑ کو انسانوں کی پوری آبادی نے کبھی نہ مانا' کچھ نے مانا اور مسلم یعنی ماننے والے قرار پائے اور کچھ نے نہ مانا اور کافر یا انکار کرنے والے گردانے گئے۔ یہی دو قومی نظریہ ہے۔ قرآن یہ بھی خبر دیتا ہے کہ نہ ماننے والے' ماننے والوں سے ہمیشہ زیادہ یعنی اکثریت میں رہے۔ یہ دونوں گروہ فکری اور نظریاتی اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پھر ایسا نہیں کہ تمام کے تمام مسلمان کسی ایک ملک میں رہتے ہوں اور تمام کے تمام غیر مسلم کسی دوسرے ملک میں۔ ایسے ممالک تو ہیں کہ جہاں مسلمان یا غیر مسلمان اکثریت میں ہیں البتہ ہیں مسلم بھی دنیا کے کم و بیش ہر ملک میں اور غیر مسلم بھی۔ چونکہ مسلمانوں کی تقسیم ایک نظریئے اور ایک فکر پر ہے لہٰذا مسلمان خواہ کہیں بھی ہوں' وہ ایک امت یعنی امتِ مسلمہ کا حصہ ہیں۔ ایک ماں کے دو بچے مختلف گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں اگر ان کا عقیدہ مختلف ہے۔ اسلام کی رو سے نظریاتی بھائی' خونی بھائی

سے یکسر مختلف ہیں۔ خونی بھائی مخالفین قرار پاتے ہیں اگر ان کا نظریہ مختلف ہے اور انسانی بھائی دلی دوست قرار پاتے ہیں اگر ان کا عقیدہ ایک ہے۔ یہی اسلامی اخوّت ہے۔ قرآن میں آیا ''انما المؤمنون اخوۃ'' کہ مومن (ایک عقیدہ رکھنے والے) آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کا اللہ ایک' رسول ﷺ ایک' کتاب ایک' کعبہ ایک' رخِ قبلہ ایک' رہن سہن ایک' طرزِ عبادت ایک۔ تاہم اپنے وجود و مقصدِ وجود کے اعتبار سے یہ تین معاشرتی یونٹوں یعنی خاندان' معاشرہ اور بالآخر امتِ مسلمہ میں منقسم ہیں۔ ان تین عنوانات کے تحت ہی ہم خلافت کے نظامِ معاشرت کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

خاندان کی سطح پر

ہر طرزِ زندگی کے تین بڑے بڑے شعبہ جات ہوتے ہیں' سیاسی' معاشی اور معاشرتی۔ اسلام میں ہر شعبۂ زندگی کے بنیادی اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے قرآن وسنّت میں طے کر دیئے گئے ہیں البتہ تفصیلات میں اتنی گنجائش رکھی گئی ہے کہ تمدّن کے ارتقاء وترقی کے ساتھ ساتھ بدلی جاسکتی ہیں۔ ایسی تفصیلات قرآن وسنّت کی ہدایات کے اندر رہ کر اسلامی شوریٰ نے طے کرنا ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تو قرآنِ مجید میں طے کر دیا گیا کہ اولی الامر مسلمانوں میں سے ہوں (نساء:۵۹)۔ اس میں تو تبدیلی کا تا قیامّت کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ البتہ یہ امر کہ اسلامی مملکت میں کسی بھی مرحلے پر مثلاً کتنے گورنر ہوں' شوریٰ کے اختیار میں دے دیا گیا کہ وہ ان کی تعداد حسبِ ضرورت کم وبیش کر لے۔ خاندانی نظام چونکہ ہمیشہ کیلئے خاوند' بیوی' اولاد اور چند دیگر لواحقین پر مشتمل ہوتا ہے لہٰذا اس بارے میں اکثر و بیشتر تفصیلات بھی خود قرآن وسنّت میں بیان کر دی گئیں۔ البتہ سیاسی واقتصادی امور کی ضرورتوں میں چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیوں کا زیادہ امکان ہے لہٰذا ان کے متعلق تفصیلات کا زیادہ تر فیصلہ شوریٰ کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔

خاندان کی سطح پر معاشرت کو نظامِ خلافت مستحکم وخوشگوار بناتا ہے تو تین بنیادی امور کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے طے کر کے۔ یہ بنیادی امور ہیں حفظِ مراتب کا مستقلاً طے کرنا' وراثت میں مرد وزن دونوں کو حصے دار بنانا اور پردے کو لازم قرار دینا۔ ہم ان تینوں پر نہایت اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں۔

حفظِ مراتب کا مستقلاً طے کرنا

حفظِ مراتب اگر طے نہ ہوں تو یہ اکیلی وجہ خاندان کی بربادی اور عدمِ استحکام کے لئے کافی ہے، دوسری کوئی کوشش نہیں کرنا پڑتی۔ اسلام میں میاں، بیوی، اولاد، والدین وغیرہ کے حقوق و فرائض کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے طے کر دیا گیا ہے۔ کسی کی صوابدید پر نہیں چھوڑا کہ وہ اپنی حیثیت خود منواتا پھرے۔ یہ حیثیت کا منوانا ہی دراصل فساد کی جڑ ہے۔ اس بارے میں جو سب سے پہلے عظیم فیصلہ کیا گیا ہے تو وہ یہ کہ خاوند کو خاندانی نظام کا نگران و سربراہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں آیا:

''مرد عورتوں پر قوّام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں'' (نساء:34)

ایک اور جگہ پر مزید توضیح فرمائی:

''عورتوں کیلئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے'' (بقرہ:228)

اصل میں عورت کے تین نمایاں روپ ہیں۔ بطورِ انسان مرد و زن میں قطعاً کوئی فرق نہیں یعنی ایسا نہیں کہ کوئی نیکی اگر مرد کرے تو اسے زیادہ ثواب ملے گا اور اگر عورت کرے تو اسے کم یا قاتل اگر مرد کو قتل کرے تو اس کی سزا اور ہو اور عورت کو قتل کرے تو سزا اور۔ دوسرا درجہ بطورِ عورت یا مرد ہونے کا ہے۔ اس میں دونوں برابر نہیں اس لئے کہ مرد کا جسم عورت والے کام نہیں کر سکتا اور عورت کا جسم مرد والے کام نہیں کر سکتا۔ البتہ اہمیتِ ساخت کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ کوئی ایک نہ ہو تو انسانی کاروبار نہیں چل سکتا۔ تیسرا درجہ بطور میاں بیوی ہونے کا ہے۔ اس لحاظ سے مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔ یاد رہے کسی بھی انتظامی یونٹ کے استحکام و بہتر کارکردگی کیلئے ضروری ہے کہ اس کا سربراہ ایک ہو۔ یکساں حقوق و اختیارات والے اگر دو یا زیادہ سربراہان ہونگے تو ادارہ چند دن تو کیا چند گھنٹے بھی چل نہیں پائے گا۔ بالفاظِ دیگر مرد اور عورت میں سے کسی ایک کا خاندانی نظام میں نگران و سربراہ ہونا لازمی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ذمّہ داری مرد پر ڈالی اور

مذکورہ آیت (نساء:34) میں اس کی ایک وجہ تو وہی بتلائی کہ ایک کو دوسرے پر بہر حال فضیلت دینا ناگزیر تھا دوسری وجہ یہ بتائی کہ مرد عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔ یعنی عورت کو خاندانی نظام میں اگر مرد کے تحت کر دیا تو اس کی تلافی اس طور کی کہ اسے عورت کے نان ونفقہ کا ذمّہ دار قرار دیا۔ عورت خواہ خود کروڑوں کی مالکہ ہو اور مرد خواہ بھوکا کنگال ہو' بیوی بچوں کے اخراجات بہر حال پورے کرنا خاوند کی ذمّہ داری ہے۔

پھر میاں بیوی کے باہمی برتاؤ پر چونکہ ان کے درمیان خوشگوار تعلقات کا دارومدار ہے لہٰذا ان میں سے ہر ایک کے حقوق وفرائض کی نہ صرف تخصیص کر دی بلکہ تاکید بھی کی اور ان کی ادائیگی کیلئے یہ کہنا ضروری سمجھا گیا کہ ''عورتوں کیلئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔''

کس حسن اور خوبی سے یہ حقوق وفرائض ادا کرنے چاہئیں' مردوں کو عورتوں کے حقوق میں مسابقت کرنے کا اشارہ دے کر اس کا بھی اہتمام کر دیا۔ پھر ایک دوسرے سے بہتر سلوک کرنے کی تاکید کی تو اس طرح بھی کہ اچھے خاوند کے اوصاف بیان کرتے ہوئے نبی کائنات ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال سے بہتر سلوک کرے''

بیوی کی اچھائیاں بیان کیں تو اس طرح کہ:

''بہتر بیوی وہ ہے جو اپنے شوہر کو خوش کرے جبکہ وہ اس کی طرف دیکھے' اطاعت کرے جب وہ اسے حکم دے اور اپنے اور اپنے مال کے بارے میں کوئی ایسا رویہ نہ اختیار کرے جو شوہر کو ناپسند ہو''۔ (نسائی)

بیوی کو اطاعت کی تاکید کی تو اس حد تک کہ وہ ایسی نفل عبادت نہ کرے جس میں کہ شوہر کی رضا شامل نہ ہو۔

اصل میں کسی بھی معاشرے کی فلاح و بہبود اور پر سکون کارکردگی میاں بیوی کے باہمی تعلقات کی خوشگواری یا ناخوشگواری سے منسلک ہے۔ ان خوشگوار یا ناخوشگوار تعلقات کے اثرات گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں رہتے بلکہ معاشروں اور قوموں کے عروج و زوال کا

دارومدار انہی تعلقات کی بنیاد پر ہے۔ بنابریں نظامِ خلافت ہر وہ جتن کرتا ہے کہ جس سے میاں بیوی کے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں۔ شادی سے عین پہلے لڑکے اور لڑکی دونوں کو کھلی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے ہونے والی بیوی اور ہونے والے شوہر کا انتخاب خود کرے۔ انتخاب کرنے میں رشتہ داروں بالخصوص والدین سے مدد لینے کو تو پسند فرمایا لیکن انتخاب کا کلی اختیار لڑکی اور لڑکے کے ہاتھ میں دیا۔ پھر شادی کے بعد میاں بیوی کے باہمی رشتے کو مضبوط بنانے کیلئے اولاد کا وجود چونکہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اجازت نہیں دی کہ اولاد پیدا نہ ہونے دی جائے۔ قرآن میں آیا:

''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ کی ناراضی سے بچو۔ خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے۔'' (بقرہ:223)

اس آیۂ مبارکہ میں کھیتی کی مثال دی تو اس لئے کہ کوئی بھی کسان کھیتی میں اس لئے محنت کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو۔ پھر ''اپنے مستقبل کا واسطہ دے کر'' اور اللہ پاک سے ملاقات کا ڈراوا دیکر ہر طرح کی ہیرا پھیری سے روک دیا۔ اہل وعیال کے بے جا مطالبات کو پورا کرنے کی ہوس میں چونکہ آدمی کے بے جا ذرائع میں الجھنے اور اس طرح معاشرے کو پراگندہ کرنے کا خطرہ تھا لہٰذا یہ کہہ کر کہ تمہاری اولاد اور تمہارے مال فتنہ کی شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں، اس فتنہ سے بچنے کی تاکید کی۔ اصل میں آدمی کے لئے عورت اور دولت دونوں وجہِ افتخار و وقار بھی ہیں تو دونوں کا غیر متوازن وغیر صالح کردار لازمی طور پر فتنہ وفساد پر منتج ہوتا ہے۔ تاہم جب اولاد کو فتنہ قرار دیا تو اس فتنے سے بچتے ہوئے ایسا بھی پسند نہ کیا کہ صاحبِ خانہ اور دیگر اہلِ خانہ میں کسی طور نفرت پیدا ہو۔ فرمایا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو۔ اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور رحیم ہے''۔ (تغابن:14)

انسانی طبائع میں چونکہ بہت بڑا فرق واقع ہوا ہے' لہٰذا خواہش رکھنے والوں کو دو' تین بلکہ چار تک بیک وقت شادیاں کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ جو اپنی قوم سے باہر شادی کرنے کی آرزو رکھیں' اہلِ کتاب کی عورتوں سے انہیں بھی شادی کی اجازت دی۔ مقصد بہرحال یہی کہ معاشرتی نظام میں فتنہ وفساد کے ہر سوراخ کو بند کر دیا جائے۔

ان تمام ترکیبوں اور تدبیروں کے علی الرغم امکان تھا کہ میاں بیوی کے درمیان ناچاکی ہو جائے اور وہ ساتھ نہ نباہ سکیں لہٰذا نہایت ناپسندیدگی سے ہی سہی' طلاق کی بہرحال گنجائش رکھ دی۔ طلاق کی نوبت آنے تک بہرحال اتنی ترغیبات اور انتظامات کو بروئے کار لایا گیا کہ جس سے کسی نہ کسی طور طلاق کا واقع ہونا ٹل جائے۔ طلاق کے بعد عدت گزار کر دنیا کے عام رواج کے برعکس عورت کو دوبارہ' سہ بارہ وغیرہ شادی کی اجازت دی۔ طلاق کی مصلحت بھی یہی کہ دو نفوس سلگتی ہوئی زندگی نہ گذاریں اور عورت کو دوبارہ شادی کی اجازت دی تو اس لئے کہ کوئی ایک نفس بھی غیر فطری وغیر حقیقی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہو۔

میاں بیوی کے تعلقات کو یوں مستحکم وخوشگوار بنا کر اسلام درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے حقوق وفرائض طے کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ والدین کو سرفہرست رکھتا ہے اور اس کے بعد اولاد اور دوسرے قریب و دور کے تمام رشتہ دار۔ پھر اسے پڑوسیوں کی فکر بھی دامن گیر ہوتی ہے۔ کمزور طبقات مثلاً یتیموں' خادموں' فقراء و مساکین' بیماروں' قیدیوں' مسافروں' غیر مسلم شہریوں حتیٰ کہ حیوانات تک کے حقوق کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے طے کر دیا گیا ہے۔ قرآن وسنّت کے صفحات بھرے پڑے ہیں ان تمام کے حقوق وفرائض سے لہٰذا انہیں یہاں دہرانے کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے۔ تاہم اندازہ کریں اسلام کے دیئے ہوئے اس نظامِ زندگی کا کہ جسے اس بچے کے حقوقِ وراثت کی بھی فکر ہوتی ہے جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔

وراثت میں مرد وزن دونوں کا شامل کرنا: قرآن میں آیا:

''مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کیلئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔ تھوڑا ہو یا بہت'

حصہ ہے مقرر کیا ہوا‘‘ (نساء:۷)

چند حروف پر مبنی اس آیۂ مبارکہ نے انسانی تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا۔ انسانیت کی نصف آبادی پر مشتمل صنفِ نازک جو کبھی خود اثاثوں کا حصہ تھی، وارث قرار پائی۔ اس اکیلے انقلابی قدم نے یک قلم عورت کی کایا پلٹ دی۔ اس لئے نہیں کہ وہ باحیثیت ہوگئی، اس لئے بھی نہیں کہ وہ مشکل وقت میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہوگئی، بلکہ اس لئے بھی کہ اس کی کائنات اور متاعِ حیات یعنی عفت و عصمت محفوظ ہوگئی۔ جس طرح وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی، کارِ وراثت چل نہیں سکتا جب تک کہ دو اور دو چار کی طرح طے نہ ہو کہ فلاں بچہ فلاں مرد سے ہے۔ وراثت کے متعلق پھر کوئی چیز مبہم نہیں رہنے دی، خود قرآن میں حقوق و فرائض کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہر ہر رشتہ دار کے حصے مقرر کر دیئے۔ اس بارے میں نظامِ خلافت کی باریک بینی کا اس سے اندازہ لگائیں کہ فرمایا جب وراثت تقسیم ہو رہی ہو اور ایسے میں کوئی فقیر و مسکین آ دھمکے تو اسے بھی کچھ نہ کچھ دے دیا کرو۔

پردے کا لازم قرار دینا

اس بارے میں بھی مفصل ہدایات واحکامات خود قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ ایک عظیم، برحق اور بروقت انقلابی قدم جو اٹھایا گیا تو یہ کہ بیوی کے دائرۂ کار کو گھر کے اندر مخصوص کر دیا اور خاوند کے میدانِ عمل کو گھر سے باہر۔ اس طور نہ صرف عورت کو اپنی کھوئی ہوئی مملکت یعنی گھر کا حصول ممکن ہوگیا، اس کی چھینی ہوئی پاور یعنی اولاد بھی دستیاب ہوگئی۔ اسی بارے میں نظامِ خلافت نے خاندان کو مزید مستحکم و خوشگوار کیا تو محرم اور غیر محرم رشتہ داروں کی تقسیم اور ستر کی تخصیص کر کے۔ پردے کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیں کہ جن معاشروں نے اسے درخورِ اعتناء نہ سمجھا نہ صرف انہوں نے عفت و عصمت کو تار تار کیا، گھر ویران کر بیٹھے۔

معاشرے کی سطح پر

اسلام جب خاندان کو آخری حدود تک مستحکم و خوشگوار بنا لیتا ہے تو ظاہر ہے متوازاً ایک

مستحکم وخوشگوار معاشرہ بھی وجود میں آتا ہے۔ کمی اگر رہ جاتی ہے تو صرف اتنی کہ وجود پذیر ہونے والے معاشرے کو کیسے چلایا جائے کہ نہ صرف اس کا استحکام وخوشگواری قائم رہے بلکہ اس میں مزید حسن آئے۔ اس مقصد کیلئے دینِ حق خلافت کے ادارے کو معرضِ وجود میں لاتا ہے۔ خلافت ہے تو ایک طرزِ زندگی یا طرزِ حکومت (کیونکہ طرزِ زندگی' طرزِ حکومت ہی کا مرہونِ منت ہوتا ہے) ہی کا نام لیکن اس کے چار اوصاف ایسے ہیں جو اسے دوسرے نظام ہائے حکومت سے ممیّز کرتے ہیں۔ خلافت کا پہلا وصف یہ کہ یہ نظام اللہ تعالیٰ کی نمائندگی کا مظہر ہوتا ہے۔ یعنی قوانین و احکامات اللہ تعالیٰ کے اور پیروی واطاعت بندوں کی۔ بالفاظ دیگر قرآن وسنّت آئینِ مملکت ہوتا ہے' کوئی خود ساختہ آئین نہیں۔ دوسرا وصف یہ کہ پوری اسلامی دنیا ایک حکمران (خلیفہ) کی سرکردگی میں ہوتی ہے۔ یاد رہے توحید صرف الوہیت ہی میں نہیں بلکہ رسالت اور خلافت میں بھی ہے۔ ایک وقت میں مسلمانوں کے دو یا زیادہ حکمران نہیں ہوسکتے۔ چھوٹے سے چھوٹے یونٹ یعنی گھر پر اسلام اگر قوّام کا ہونا ضروری سمجھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت کی سطح پر اس کی ہزار گنا زیادہ ضرورت ہے۔ خلافت کا تیسرا وصف یہ کہ اس مخصوص طرزِ حکومت کو چلانے والا ہر رکن اولی الامر میں شامل اور قرآنی معیارِ اہلیت کا حامل ہوتا ہے۔ اولی الامر میں گو ہوتے تو گورنر' وزراء' ارکانِ شوریٰ' جج صاحبان' افواج کے سربراہان وغیرہ سبھی ہیں لیکن ان میں مرکزی کردار خلیفۂ وقت کا ہوتا ہے۔ خلیفۂ وقت کے بغیر اولی الامر کا اسلام میں کوئی تصور نہیں اور خلیفہ کیلئے منجملہ اور صفات کے پوری اسلامی دنیا کا سربراہ ہونا لازمی ہے۔ پھر یہ اولی الامر کی فرمانبرداری کوئی عام سی تابعداری نہیں' اصل میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ بنابریں سمع وطاعت اس کا لازمی عنصر ہے۔ نظامِ خلافت کی چوتھی شرط یہ ہے کہ حکومت کا انعقاد بیعت سے ہوتا ہے نہ کہ حکومت کے ذریعے بیعت سے۔ دورِ خلافتِ راشدہ منقطع ہوا تو اسی چوتھی شرط کو منہدم کرنے سے۔

خلیفۂ وقت کو قرآنی معیارِ اہلیت اور قرآن وسنّت کے دیئے ہوئے طرزِ انتخاب کے بعد مزید دو شرائط کو پورا کرنا یا دو ذمّہ داریوں کو نبھانا ہوتا ہے۔ یہ دو ذمّہ داریاں اس قدر اہم ہیں کہ اگر ان سے صرفِ نظر کی جائے تو اسلامی معاشرہ قطعاً وجود میں نہیں آسکتا۔ خلیفۂ وقت کی پہلی ذمّہ

داری یہ کہ اسے دارالخلافہ کی مرکزی مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں۔ بنابریں یہ بھی لازمی ہے کہ کسی بھی مسجد کا امام خلیفۂ وقت کا نمائندہ ہوتے ہوئے اپنے زیرِ اثر علاقہ میں سب سے بڑا افسر ہو' دوسرے اہلکار سب اس کے تحت ہوں۔ یہ انتظام کر کے دینِ حق اسلامی معاشرے کو اس قدر پرامن وپرسکون بنا دیتا ہے کہ حکمران ہمہ وقت قابلِ رسائی ہوتا ہے۔ سونے سے پہلے ہر شکایت کرنے والے کی شکایت کو رفع کر دیا جاتا ہے۔

اسلام خلیفۂ وقت پر دوسری پابندی یہ عائد کرتا ہے کہ اس کا معیارِ زندگی عام شہری کی سطح کا ہو۔ نہ صرف یہ کہ اس کا رہن سہن' کھانا پینا' پہننا وغیرہ عام شہری کی سطح کا ہو بلکہ اسے کوئی امتیازی مراعات حاصل نہ ہوں۔ عام شہری کو باڈی گارڈ وغیرہ میسّر نہیں ہوتا تو اسے بھی میسّر نہ ہو' عام شہری نے بوقتِ ضرورت عدالت میں حاضر ہونا ہوتا ہے تو خلیفۂ وقت بھی حاضر ہو' وغیرہ وغیرہ۔ یہ پابندی صرف خلیفۂ وقت کیلئے ہے' دوسرے کسی شہری بشمول اربابِ حل وعقد پر نہیں۔ وہ اپنی جائز آمدنی سے قرآن وسنّت کی شرائط کو پورا کرتے ہوئے کروڑ پتی وغیرہ بن سکتے ہیں۔ خلیفۂ وقت کو پابند کیا تو اس لئے کہ جب وہ اپنی جائز آمدنی کو بھی من مرضی کے مطابق استعمال میں نہیں لاسکتا تو مملکت میں دوسرا کون ہوگا جو ناجائز آمدنی کا تصوّر بھی کرے۔ محض ایک فرد یعنی خلیفۂ وقت پر نظامِ خلافت نے یہ دوگراں بلکہ کڑی پابندیاں یعنی مسجد میں حاضری اور عام شہری کی طرزِ زندگی کی پیروی عائد تو کیں لیکن ایسے جنت نشاں معاشرے کے وجود کو ممکن بنا دیا کہ جو ہوتا تو زیرِ آسماں زمین پر ہی ہے لیکن اس شعر کا اصلی مصداق کہ:

اگر فردوس بر روئے زمیں است ہمیں است وہمیں است وہمیں است

یوں عمومی انتظامی چھتر ہی کو اسلام راست رو نہیں بناتا' عوام کو بھی راست روی کا پابند بناتا ہے۔ مقام ومرتبہ اور زمین وزر کو نہیں' تقویٰ کو معیارِ فضیلت قرار دیتا ہے۔ پھر ہر اس رجحان کو کہ جو رہنے والوں کے باہمی تعلقات ومعاملات پر منفی اثرات مرتّب کرے' حرام قرار دیتا ہے۔ سود' جوا' شراب نوشی وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ بہتان تراشی' غیبت' بغض وحسد' برے القاب سے یاد کرنا' ایک دوسرے کا مذاق اڑانا' کسی کو اپنے سے کم تر سمجھنا' لعن طعن کرنا' بدگمانی' بدزبانی' بدکلامی

بے جا تجسس، عیب جوئی، دشنام طرازی، راز افشائی، پیشہ ورانہ تفوق وغیرہ سب کو نہ صرف حکماً ممنوع قرار دیا بلکہ صلوٰۃ وزکوٰۃ اور حج کو مستقل تربیت گاہیں بنا کر ایک بے مثل معاشرے کے حصول کو ممکن بنادیا ہے۔قرآن وسنّت کی پیروی کے علاوہ کہاں سے کوئی لائے گا زیرِ آسماں ایسا معاشرہ؟

انسانیت کی سطح پر

نظامِ خلافت کا یہ منفرد پہلو کہ اس کا ہر مسلمان شہری نہ محض اپنے لئے رہتا ہے نہ محض اپنے لئے کماتا ہے۔ارشادِ رسالت مآب ﷺ ہے کہ جو اپنے لئے پسند کرو وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرو۔آپ ﷺ کا یہ بھی ارشادِ گرامی ہے کہ وہ شخص مومن نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔ان دونوں احادیثِ مبارکہ میں مسلم یا غیر مسلم کی تشخیص نہیں۔''دوسرا بھائی'' یا ''پڑوسی'' مسلم ہو یا غیر مسلم بہرحال مدد کا مستحق ہے۔قرآن مجید نے اس پہلو کو مزید نکھارا تو اس طرح کہ امّتِ مسلمہ کو ''خیرِ امّت'' قرار دیتے ہوئے اس کی اس فضیلت کو انسانیت کی خدمت اور فلاح و بہبود سے منسلک کر دیا۔قرآن میں آیا:

''اب دنیا میں ''خیرِ امّت'' تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو،بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو'' (آلِ عمران:110)

پھر جب امّتِ مسلمہ کو انسانیت کی ہدایت واصلاح او فلاح و بہبود کے لئے مختص کیا تو کئی وہ فرائض جو پہلے انبیاءؑ کیا کرتے تھے، سلسلۂ نبوت ختم کرتے وقت بطورِ فرائضِ منصبی امّتِ مسلمہ کے سپرد کر دیئے۔ہم کم از کم تین ایسے فرائضِ منصبی کا ذکر ذیل میں کرتے ہیں جو عالمی معاشرے پر گہرے اثرات مرتّب کرتے ہیں۔

کوئی چھوٹے سے چھوٹا باغیچہ بھی اپنے حسن کو برقرار نہیں رکھ سکتا جب تک کہ کوئی مالی اس کی دیکھ بھال اور قطع و برید نہ کرے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وسیع وعریض کرۂ ارض جسے زمین کہا جاتا ہے کو کیا سنوار کر رکھنے اور بگاڑ سے بچانے کی ضرورت نہیں؟ جب ضرورت سے انکار ممکن نہیں تو مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالمی سطح پر یہ سنوار کر رکھنے اور بگاڑ سے بچانے یا بالفاظِ دیگر قوموں کے درمیان صلح وآشتی، صلح جوئی ودلجوئی، تعمیر وترقی اور فلاح و بہبود کا کام کرے تو کون؟

اللہ تعالیٰ پہلے تو اس اہم کام کے لئے امر بالمعروف ونہی عنِ المنکر (معروف کے حکم اور منکرات سے پرہیز) کی خاص اصطلاح سے متعارف کراتا ہے اور پھر جیسے کہ اوپر آلِ عمران کی آیت نمبر 110 میں بیان ہوا اس کام کو بطورِ فرضِ منصبی امتِ مسلمہ کے سپرد کرتا ہے۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ نبیٔ رحمت ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ اگر مسلمان کسی موقع پر یہ کام کما حقہٗ نہ کر پائیں تو پھر وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعا کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول نہیں کرے گا۔ فرمایا:

''اس ذات کی قسم کہ جس کے قبضے میں میری زندگی ہے (اے امتِ مسلمہ) تم فریضۂ ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' ادا کرتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسے عذاب سے دوچار کردے گا کہ اس سے نجات پانے کیلئے تم اللہ تعالیٰ سے دعا کروگے لیکن وہ تمہاری دعاؤں کو قبول نہیں کرے گا'' (ترمذی)

انسانوں کی ایک اور اہم ضرورت یہ ہے کہ احکاماتِ الٰہی یا قرآن وسنّت کی تعلیمات بالخصوص ان لوگوں تک کہ جو غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے' پہنچیں تا کہ وہ ان پر عمل کر کے دنیا و آخرت دونوں کو سنوار سکیں۔ پہلے یہ رسالت یعنی پہنچانے کا کام انبیاءؑ ورسلؑ کیا کرتے تھے اب سلسلۂ نبوت ختم ہونے پر یہ اہم کام بھی امتِ مسلمہ کے سپرد بطورِ فرضِ منصبی کر دیا گیا۔ قرآن میں آیا:

''اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ''امتِ وَسط'' بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو'' (بقرہ: 143)

چونکہ ''شہادت علی الناس'' کے اس فریضہ کی ادائیگی پر لوگوں کی نجات کا دارومدار ہے لہٰذا پیغمبروںؑ کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ کام بطور چیلنج دیا۔ خود رسول ﷺ کو یہ کام سونپا گیا تو اس انداز میں:

''اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا'' (مائدہ: 67)

اب جب تا قیامّت ہر دور کے مسلمانوں پر اپنے ہم عصروں تک پہنچانے کا یہ فرضِ منصبی قرار پایا تو اصل میں ان پر دوہری ذمہ داری ڈالی گئی۔ وہ خود بھی قرآن وسنّت کے مطابق زندگیاں گزاریں اور دوسروں تک بھی پہنچائیں۔ خوفناک سزا کے مستحق پائیں گے وہ مسلمان جو

اس فرضِ منصبی کو بطریقِ احسن ادا نہ کرسکیں۔قرآن میں آیا:

''جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں' درآں حالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کیلئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں' یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں'' (بقرہ:159)

مذکورہ بالا دونوں فرائضِ منصبی یعنی فریضۂ ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' اور فریضۂ ''شہادت علی الناس'' تبھی بطریقِ احسن ادا ہو سکتے ہیں جب کہ دنیا بھر کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔امر بالمعروف میں تو باقاعدہ امر یعنی ''حکم کرنے'' کا لفظ موجود ہے۔پھر حقیقت ہے کہ یہ دونوں کام مغلوب ہوتے ہوئے ہو ہی نہیں سکتے۔لہٰذا امّتِ مسلمہ کو تیسرا بڑا فرضِ منصبی ادا کرنا ہے تو یہی کہ وہ دینِ حق کو ادیانِ باطلہ پر غالب رکھیں۔فرمایا گیا:

''اے ایمان والو! ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دینِ حق غالب ہو جائے'' (انفال:39)

اگر مسلمان یہ فرضِ منصبی نہ کر پائیں تو ایک تو وہ مومن نہیں رہتے اس لئے کہ قرآن میں آیا: ''کہ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہوئے'' (آلِ عمران: 139) اور دوسرے وہ نصرتِ ایزدی سے محروم ہو جاتے ہیں اس لئے کہ قرآن میں یوں بھی آیا کہ:

''اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی قوّت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو'' (آلِ عمران:160)

دینِ حق کو غالب کرنے اور غالب رکھنے کے لئے جہاد و قتال کا بوجھ تو مسلمانوں پر ڈالا گیا گو اس کا اصل فائدہ غیر مسلموں کو پہنچتا ہے۔اسے ایک مثال سے سمجھیئے۔فرض کیجئے کہ کسی جگہ پانی کا تالاب ہے اور چند فرلانگ کے فاصلے پر کچھ پیاسے جاں بلب ہیں۔تالاب والا چاہتا ہے کہ خود پانی پیاسوں تک پہنچائے لیکن راستے میں جس آدمی کی زمین پڑتی ہے وہ فتنہ کھڑا کر دیتا ہے اور اپنی زمین میں سے تالاب والے کو گزرنے نہیں دیتا۔اس کا حل کیا یہی نہیں کہ مزاحم ہونے والے کا بھرکس نکال دیا جائے اور اس سے مزاحم ہونے والی طاقت ہی چھین لی جائے؟ اب

پیاسے جو جاں بلب ہیں وہ یہ کام نہیں کرسکتے' تالاب والے کو ہی یہ جان جوکھوں کا کام کرنا ہوگا گو فائدہ اس کا اصل میں پیاسوں کو پہنچے گا۔ کس قدر بھول ہے ان لوگوں کی کہ جو اس جہاد و قتال کو دہشت گردی قرار دیتے ہیں جو نہ مالِ غنیمت اور کشور کشائی کے لئے کیا جاتا ہے اور نہ کسی کو بزور مسلمان کرنے کیلئے۔ کیا جاتا ہے تو محض اس لئے کہ کوئی فریضۂ ہائے ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' اور ''شہادت علی الناس'' کی ادائیگی میں مزاحم نہ ہو۔ گو ان فرائض کی ادائیگی کا اصل فائدہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ غیر مسلموں کو پہنچتا ہے۔ ان کی ادائیگی پر ہی ان کی اس دنیا کی فلاح اور آخرت کی نجات کا دارومدار ہے۔ مختصراً یہ کہ خلافت کے نظامِ معاشرت کا یہ حصہ ہے کہ وہ اغیار کی فلاح و بہبود اور ہدایت و اصلاح کا فرض ادا کرے۔ بالفاظِ دیگر مسلمان وہی دوسروں کے لئے پسند کریں جو اپنے لئے کرتے ہیں۔

حرفِ آخر

ایک وسیع موضوع کو ہم نے چند صفحات میں سمونے کی سرتوڑ کوشش کی ہے۔ ہوسکتا ہے ہم اس کا حق ادا نہ کرسکے ہوں۔ مجمل خاکہ یہی کہ خلافت کا معاشرتی نظام تین سطحی، خاندان کی سطح پر' معاشرے کی سطح پر اور انسانیت کی سطح پر۔ خاندانی سطح پر دینِ حق معاشرت کو مستحکم و خوشگوار بناتا ہے تو حفظِ مراتب کو مستقلاً طے کرکے' مردوزن کو وراثت میں حصہ دار بنا کر اور پردے کو لازم قرار دے کر۔ معاشرے کی سطح پر معاشرت کو مستحکم و متوازن بناتا ہے تو قرآن و سنّت کو آئینِ مملکت قرر دے کر' پوری اسلامی دنیا کو ایک خلیفہ کی سربراہی میں لاکر' نظامِ حکومت اولی الامر کے ہاتھ میں دے کر اور ''انعقادِ حکومت کو بذریعہ بیعت نہ کہ بیعت بذریعہ حکومت'' کے اصول کو اپنا کر۔ عالمی سطح پر معاشرت کو مستحکم و پاکیزہ بناتا ہے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر' شہادت علی الناس اور حصولِ غلبۂ دینِ حق کے فرائضِ منصبی ادا کرکے۔ زیرِ آسماں خلافتِ راشدہ کا دور اپنی پوری آب و تاب سے تو تیس سال رہا لیکن تقریباً گیارہ سو سال اس دھرتی کے مکینوں کو اس کے فوائد و فیوض حاصل ہوتے رہے۔ عرصہ ہوا اس معاشرے کو معدوم ہوئے ہوئے۔ ترس گئے کون و مکاں اس مبارک نظام کے انتظار میں جس کا نام ہے........نظامِ خلافت۔

خلافت کا نظامِ معیشت

جس طرح آج مسلم دنیا تمدنی، سیاسی، معاشی غرضیکہ ہر لحاظ سے پارہ پارہ ہے اسی طرح پانچویں صدی عیسوی میں جب رومن امپائر کا نظامِ زندگی درہم برہم ہوا تو اس وقت کے یورپ کا ہر شعبۂ حیات تتّر بتّر تھا۔ انتشار و خلفشار کے اس دور کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس زمانے کے روساء پورے خطے کو تقسیم در تقسیم کر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر قابض ہو گئے اور یوں وہ نظام معرضِ وجود میں آ گیا جسے ''جاگیردارانہ نظام'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس ہمہ گیر تبدیلی نے نہ صرف شعبۂ معیشت کو متاثر کیا بلکہ پورے نظامِ حیات کو نیا رُخ دیا۔ بالادستی، اثر و رسوخ، عزت و احترام تو قدرتی طور پر جاگیرداروں کا مقدر ٹھہرا دیگر سب لوگ خواہ وہ مزارعین تھے، تاجر تھے یا اہلِ حرفہ وغیرہ یوں جیسے رعیت بن گئے۔ چڑھتے سورج کی پرستش کے مصداق اہلِ کلیسا نے بھی اسی نظامِ جاگیرداری سے موافقت پیدا کرنے میں غنیمت سمجھی۔ باہمی ملی بھگت سے جاگیرداری اور کلیسا خود تو بظاہر مستحکم ہوتے چلے گئے لیکن عمومی زندگی جمود کا شکار ہو گئی۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مترادف قیصریت و پاپائیت کے بندھن ڈھیلے ہوئے تو جاگیرداری نظام نے کلیسا کے تعاون سے ترقی و توسیع اور فنی پیش رفت کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ اسی دوران یعنی متوازاً اسلام کی کرنیں دنیا کے وسیع و عریض خطوں کو منور کر رہی تھیں۔ دونوں، تہذیبوں کا ٹکراؤ ایک فطری عمل تھا۔ صلیبی جنگیں اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ اسلامی دنیا کی ترقی و کمال نے اہلِ یورپ کو بھرپور متاثر کیا حتیٰ کہ یورپی اقوام جاگیرداری و کلیسا کے گٹھ جوڑ کو پامال کرتی ہوئی قومی حکومتوں کی طرف بڑھیں۔ یورپ سے ظلمت کے سائے سمٹنا شروع ہوئے۔ چودھویں تا سولھویں صدی کا درمیانی وقفہ بجا طور پر یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس تبدیلی کا روحِ رواں یورپ میں وہ طبقہ تھا جو تاجروں، صنعتکاروں، ساہوکاروں وغیرہ پر مشتمل تھا۔ جاگیرداری و کلیسا کے طلسم کو توڑنا

کوئی آسان نہ تھا خصوصاً جب اسے ہولی رومن امپائر کے طور پر متعارف کرایا گیا تھا۔ جاگیرداروں اور اہلِ کلیسا پر مشتمل قدامت پسندوں' جنہیں بنیاد پرستوں (Fundamentalists) کا نام دیا گیا' نے بھرپور مزاحمت کی لیکن یہ جنگ بالآخر پرانے نظام کی شکست وریخت اور نوخیز طاقتوں کی کامیابی پر منتج ہوئی۔

شومئی قسمت' اہلِ یورپ کو جاگیرداروں اور اہلِ کلیسا کے شکنجوں سے نجات تو ملی لیکن صنعتکاروں' ساہوکاروں وغیرہ پر مشتمل بورژوا طبقہ نے خودان کی جگہ لے لی۔ انقلابیوں کو یاد نہ رہا کہ ان کے نیچے ایک اور اصل طبقہ عوام کا بھی ہے جو اس ''لبرلزم'' کی تحریک سے فوائد حاصل کرنے کا بدرجۂ اتم حق رکھتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں مشین کی ایجاد نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بورژوا طبقہ خودغرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اہلِ یورپ کو دوسری انتہاء پر لے گیا جسے جدید سرمایہ دارانہ نظام یا مغربی جمہوریت کہا جاتا ہے۔ سیاست پر بھی یہی بورژوا طبقہ حاوی آ گیا۔

مغربی سرمایہ دارانہ نظام

یورپی ممالک اور پھر امریکہ میں معرض وجود میں آنے والا سرمایہ دارانہ نظام کئی لحاظ سے پسندیدہ قرار پایا اس لئے کہ اس میں انسان کے کئی ایک جبلی تقاضوں کا خیال رکھا گیا تھا۔ نجی ملکیت کا حق (private ownership) ذاتی ارتقاء کے مواقع (personal Incentive) آزاد معیشت (free enterpise) جیسے اصول اپنائے گئے۔ آزادی سعی کا حق' آزادی رائے' مقابلہ ومسابقت' آجر واجیر کے حقوق کی پاسداری' ریاست کی کم مداخلت جیسے اسباب اس نظام کی ترقی کا موجب بنے۔ اس کا البتہ کیا کیا جائے کہ انسانوں کا خودساختہ یہ نظام باوجود اپنی اَن گنت بھلائیوں کے بے نقص نہ نکلا اور وہی خودغرضی جو پہلے نظاموں کا شعار تھی اس نظام کو بھی ایک اور انتہا پر لے گئی۔ چند قلابازیاں ملاحظہ ہوں۔

سرمایہ داروں کی بے قید دوڑ اور مشین کی ایجاد کے نتیجہ کے طور پر بے روزگاری کا مسئلہ تاریخ میں پہلی بار وجود میں آیا۔ گھریلو دستکاری اور چھوٹے چھوٹے کاروبار مفلوج ہو کر رہ

گئے۔ چھوٹے چھوٹے کاروباروں سے فارغ ہونے والے کارکن اور دیہاتی جب بڑے بڑے صنعتی مرکزوں میں کارخانہ داروں کے پاس برائے حصولِ معاش حاضر ہوئے تو وہ اس پوزیشن میں نہ تھے کہ سودابازی کرتے۔ انتہائی کم اجرت پر محنت لگانے پر تو مجبور تھے ہی' کارخانہ دار جب چاہتا ایک کارکن کو چلتا کر کے دوسرے کو رکھ لیتا۔ کام تو مزدور سے جانوروں کی طرح لیا جاتا لیکن رہنے اور کھانے پینے کا معیار جانوروں سے بھی نیچے گر گیا۔ پہلے پہل تو یہ مسائل محض افراد کے لئے تھے لیکن دنیا پر مغربی غلبہ سے چند اقوام نے کارخانہ دار کی جگہ لے لی تو باقی اقوام نے مزدور کی' عدم توازن دنیا بھر کا مقدّر بن گیا۔ پہلے افراد کے مابین غربت و امارت کی خلیج حائل تھی اب اقوام میں یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہے۔

ایک طرف مشین کی ایجاد نے صنعتی پیداوار میں کئی گنا اضافہ کر دیا اور دوسری طرف صنعتی ممالک کے اندر مزدور کی آمدن کم ہونے سے عوام النّاس کی اکثریت قوت خرید سے محروم ہو گئی۔ نتیجہ کے طور پر صنعتی ممالک دنیا بھر میں منڈیوں کی تلاش میں سرگرداں چل نکلے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان پر یلغار اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ تجارتی بالادستی نہ صرف غریب ممالک کے وسائل ہڑپ کر گئی بلکہ بدیر یا سویر سیاسی بالادستی میں بدل گئی۔ چند صنعتی ممالک نے دنیا کے بیشتر ممالک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ ایک تیر سے کئی شکار' منڈیاں بھی ہاتھ لگ گئیں تو خام اور معدنیات بھی فراواں لوٹی گئیں۔ یہ جو رونقیں اور معیارِ زندگی کی بلندی آج مغربی ممالک میں نظر آ رہی ہے سب مسروقہ ہے یا استحصال سے حاصل کردہ۔ دنیا کئی دنیاؤں میں بٹ گئی۔ صنعتی ممالک تو پہلی اور دوسری دنیا کے ممالک جب کہ استحصال زدہ اور کمزور کردہ ممالک تیسری دنیا کے ممالک قرار پائے۔

سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا کہ جس چیز کی چاہیں منڈی میں بہتات کر دیں اور جس کی چاہیں قلت پیدا کر دیں۔ سرمایہ دار اس پوزیشن میں ہو گیا کہ رسد و مانگ کو کنٹرول کر کے مصنوعی بلکہ من مانی قیمتیں وصول کریں۔ مڈل مین اپنے بینک بیلنس کے سہارے محض ٹیلیفون پر کروڑوں اربوں کمانے لگے بغیر اس کے کہ زیرِ سودا مال کا منہ تک

دیکھتے یا اسے مزید کارآمد بنانے میں حصہ بناتے۔کمزور ممالک کی کرنسیاں صنعتی ممالک کی کرنسیوں سے منسلک ہونے پر مجبور گئیں۔اب کرنسی کی مار دے کر صنعتی ممالک غریب ملکوں کی کمر توڑتے رہتے ہیں۔صنعتیں تو بہر حال رواں دواں رکھنی ہیں اور وہ تبھی چل سکتی ہیں کہ تیسری دنیا کے ممالک منڈیاں بنے رہیں۔لہذا تیسری دنیا کے ممالک کی قوتِ خرید کو سہارا دینے کے لئے قرضوں کا جال بچھا دیا گیا۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ قرضوں کی ادائیگی ہے۔کئی ممالک قرضوں اور سود کی ادائیگی کے لئے مزید قرضے لینے پر مجبور ہیں۔سودی نظام پوری دنیا کے لئے سوہانِ روح بن گیا ہے حتیٰ کہ امیر ترین ممالک تلملا اُٹھے ہیں کہ یہ نظام خود اِن کو ریشم کے کیڑے کی طرح ایک دن اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

منڈیوں کی تلاش اور مسابقت کی دوڑ میں سرگرداں صنعتی ممالک ایسا ویسا مال تیار کرنے لگے ہیں کہ جس سے فی آئٹم زیادہ سے زیادہ نفع ہو خواہ یہ مال صحت واخلاق کے لئے کتنا ہی مضر کیوں نہ ہو۔مارکیٹ میں الیکٹرانکس، سامان تعیش اور ایسی ایسی چیزوں کی بھرمار ہوگئی ہے کہ جن کی سرے سے یا تو ضرورت ہی نہیں ہے یا ہے تو بہت کم۔مسابقت ومقابلہ تصادم کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔بنابریں اسلحہ سازی دنیا کی مقبول ترین صنعت بن گئی ہے۔پورا کرۂ ارض شعلہ بگولا کی صورت اختیار کر چکا ہے جو کسی وقت بھی انسانیت کو بھسم کر سکتا ہے۔بھسم ہونے کا سب سے زیادہ ڈر بھی صنعتی ممالک کو ہی ہے، غیر صنعتی ممالک کا پہلے ہی انہوں نے خود تیا پانچہ کر رکھا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام، عیاشانہ کلچر معرضِ وجود میں لانے کا بڑا سبب ہے۔فحاشی، بے حیائی، عریانی، برہنگی، آوارگی دنیا کا مقدر ٹھہرا۔عورت بیچاری چراغ خانہ کی بجائے شمعِ محفل بن گئی ہے۔تجارت، کاروبار، ذرائع ابلاغ غرضیکہ ہر شعبہ میں اسے اشتہاری روپ دے کر کمائی کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔چلے جائیں صنعتی ممالک میں، نسلیں تباہ، گھر ویران اور سکون نایاب ہوگیا ہے۔ہر گھر میں آپ کو ملیں گے تو ادھیڑ عمر میاں بیوی، بچے فرار ہوگئے۔ہاں، کتوں اور بلیوں کی عید ہوگئی، ہر گھر میں موجود کچن میں بھی، ڈرائنگ روم میں بھی اور شومئی قسمت بیڈ روم بلکہ عین بیڈ میں بھی۔

اخلاقی اقدار بے معنی ہو کر رہ گئیں' عدل وانصاف دوہرے معیار کی بھینٹ چڑھ گیا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والے ضابطے نے پوری دنیا کو جنگل بنا دیا۔ایک سو پچاس سے زائد ممالک کوئی قرارداد پاس کریں' ایک ویٹو پر نچے اڑا دیتا ہے۔اسرائیل کو پرائے دیس میں آبسایا تو کس نے؟ جاپانی شہروں پر ایٹم بم برسائے تو کس نے؟ عراق پر حملہ آور ہے تو کون؟ چیچنیا کا تیا پانچہ کیا ہے تو کس نے؟ ایران' لیبیا' سوڈان وغیرہ پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں تو کس نے؟ پھر عجیب دیدہ دلیری اور خودسری ہے کہ مہا دہشت گرد خود امن وسلامتی کے علمبردار بنتے ہیں' دہشت گرد قرار دے رہے ہیں تو انہیں جنہیں خود دہشت گردی کا شکار کر رکھا ہے۔

خود ذبح بھی کرے ہے خود لے ثواب الٹا

کبھی بیچارہ مزدور ہی سرمایہ دارانہ نظام سے نالاں تھا آج بات اقوام پر آٹھہری۔وہ دوری' وہ رنجش اور وہ چپقلش جو کبھی محض مزدور اور سرمایہ دار کے مابین تھی آج کئی گنا بڑھ کر سرمایہ دار یا قرض دینے والے ممالک اور کمزور یا قرض لینے والے ممالک کے مابین ہے۔درمیان میں ردِعمل کے طور پر انسانوں کا ریلہ ایک دوسری انتہا یعنی کمیونزم' سوشلزم وغیرہ کی طرف لپکا لیکن یہ علاج بھی مرض کا مداوا نہ کرسکا۔آیئے چند سطور کمیونزم کی نذر کریں۔

کمیونزم

سرمایہ دارانہ نظام کا نعرہ ''آزادی'' رہا ہے تو کمیونزم کا نعرہ ''مساوات''۔شومئی قسمت آزادی اور مساوات کے الفاظ جتنے پرکشش ہیں تاریخ شاہد ہے مفاد پرستوں نے اس سے کہیں بڑھ کر ان کے ذریعہ انسانیت کا استحصال کیا ہے۔دنیا کے چند خطوں میں بے قید معیشت نے سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان وسیع تر خلیج حائل کر دی۔ایک کے کتے جب ناز ونعمت میں پلنے لگے اور دوسرے کے اپنے بچے بھوکے مرنے لگے تو دنیا کے کچھ دوسرے ممالک میں عیار لوگوں کو عجیب سوجھی۔انہوں نے سوچا کہ ملکیت کا حق انفرادی طور پر ہو ہی کیوں؟ کیوں نہ تمام ذرائع پیداوار قومیا لئے جائیں اور قوم خود ہر ہر فرد کی بنیادی ضروریات بمثل روٹی' کپڑا' مکان وغیرہ کو

بافراط پورا کرے۔ پیٹ بھر روٹی ہی ہر بشر کو نہ ملے بلکہ ’’ایک جیسی‘‘ ملے۔ بندوں میں یہ غربت اور امارت کا تصور ہو ہی کیوں، مکمل مساوات کا دور دورہ ہو۔ نعرہ بڑا پُر فریب اور پر کشش تھا بالخصوص جب وہ اکثریت کے حق میں جاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمیونزم نے دنیا کے وسیع تر خطوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ظاہر ہے مجرد نقصانات کا حامل نظام تو ویسے ہی معرضِ وجود میں نہیں آسکتا، کچھ نہ کچھ فوائد ہوں تو ہی نیا نظام جڑ پکڑ پاتا ہے۔ قومی وعوامی سطح پر اس نظام کے بھی کئی فوائد سامنے آئے۔ تمام ذرائع پیداوار ایک ہی نظام کے ہاتھ میں مجتمع ہونے سے ان ذرائع کا استعمال بہتر اور منظم انداز میں ہونے لگا۔ پہلے جو منافع تاجر، کارخانہ دار اور جاگیردار حاصل کرتے تھے حکومتی خزانے میں آکر وہ کسی حد تک لوگوں کی فلاح و بہبود پر استعمال ہونے لگا۔ قومی سطح پر تقسیمِ کار کی بنا پر مطلوبہ تربیت یافتہ افرادی قوت بہتر طور پر میسر اور مستعمل ہونے لگی۔ معذوروں، یتیموں، بیواؤں وغیرہ کی دیکھ بھال بہتر طور پر ہونے لگی۔ مالکانہ جھگڑوں، عدالتی مقدموں اور طبقاتی کشمکشوں میں بھی کمی آئی۔ اِن اَن گنت فوائد کے علی الرّغم کمیونزم بھی بے نقص نہ نکلا اور چند ہی دہا کے زیرِ تجربہ رہنے بعد بالآخر ناکام ہو گیا۔ انسانوں کے خود ساختہ نظام کا ایسے انجام سے دوچار ہونا لازمی تھا اس لئے کہ سلوگن اور جذبات، حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پہلے تو یہ نظام معرضِ وجود میں آیا ہی تو بڑا بھیانک خونی ڈرامہ رچا کر۔ صدیوں پر محیط چھوٹے چھوٹے مالکان کو کب گوارا تھا کہ کوئی آئے اور انہیں یک قلم بے دخل کر دے۔ نظام کو معرضِ وجود میں لانا ہی مشکل ثابت نہ ہوا، چلانا اس سے بھی مشکل نکلا۔ اخلاقی اقدار کو کچلے بغیر جابرانہ نظام کو رواں دواں رکھنا ممکن نہ تھا۔ مذہب و اخلاق کے ہر بندھن کو توڑا ہی نہ گیا، خود خدا و مذہب کو دیس سے نکالا دے دیا گیا۔ پھر اشیائے صرف کا سرکاری کنٹرول میں ہو کر پرمٹ، لائسنس، راشن کارڈ وغیرہ سے حاصل ہونے کی صورت نے رشوت، بدعنوانی، خیانت اور غبن کے چلن کو عام کیا۔ مڈل مین کو فارغ کرنے کے جو دعوے کئے گئے تھے، مساوات کے جو نعرے لگائے گئے تھے اور مزدور کو جو سبز باغ دکھائے گئے سب ہوائی فائر نکلے۔ بقولِ شاعر:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ تھا

حتیٰ کہ وہ وقت آیا کہ اجتماعی ملکیت سے حاصل ہونے والا منافع عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہونے کی بجائے عوام کو دبانے اور اشترا کی نظام کو دوسرے نظاموں سے بچانے کی مد میں خرچ ہونے لگا۔ ایسا نظام کیسے تا دیر چل سکتا تھا' نا کام ہوا تو بری طرح۔ اس میں کیا شک کہ راشن بندی کا رزق خواہ فراواں بھی ہو خوشگوار نہیں اس لئے کہ اس طرح سے جو پرواز پر بندش لگتی ہے' محض جسم کی فربہی اس کا مداوا نہیں کر سکتی۔ سرمایہ دارانہ نظام بھی آخری ہچکیوں پر ہے اس لئے کہ وہ بڑی خامی جو کمیونزم میں تھی کہ ایک چھوٹی سی اقلیت نے ایک بڑی اکثریت کو ڈھور ڈنگر بنا رکھا تھا اب سرمایہ دارانہ نظام کی سرشت میں داخل ہو چکی ہے۔ وہاں حکمران جماعت نے عوام الناس پر جابرانہ نظام مسلط کر رکھا تھا تو یہاں سرمایہ دارانہ نظام میں چند گنتی کی اقوام نے دنیا بھر کی بیشتر اقوام کو نیو ورلڈ آرڈر اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن جیسے پھندوں میں جکڑ رکھا ہے۔ ظلم و جبر کسی بھی صورت میں ہوتا دیر قائم نہیں رہ سکتا۔

انسانوں نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو تجربات کے چکر میں ڈال رکھا ہے۔ ورنہ جیسے کہ ایک فیکٹری کے مالک کو ہی حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی فیکٹری کے پروڈکٹ کے متعلق ہدایت نامہ دے اس طرح فطرت کی فیکٹری میں تیار ہونے والے انسان کے لئے قانون ' دستور اور نظامِ حیات کسی کو دینے کا حق ہے تو صرف خالقِ ارض وسما۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ کو۔ پھر خالقِ کائنات نے انسان محض تجربات میں الجھنے کے لئے یونہی زمین پر نہیں پھینک دیا۔ اللہ کو پتا تھا کہ انسان کو بھوک لگے گی لہذا پہلے سے ہی گندم کا بندوبست کیا' پتہ تھا اس مخلوق کو پیاس لگے گی لہذا پانی کا فکر کیا۔ پتہ تھا اسے کپڑے اور چھت کی ضرورت پڑے گی لہذا مختلف لوازمات کا خاطر خواہ انتظام فرمایا۔ اس طرح ربِّ کائنات کو پتہ تھا کہ انسان کو

زندگی گزارنے کے لئے قانون‘ دستور اور نظامِ حیات کی ضرورت پڑے گی لٰہذا انبیاء ورسلؑ کی بعثت اور آسمانی کتب کی ترسیل کا پوری انسانی تاریخ پر سلسلہ رواں دواں کر کے مطلوبہ نظامِ حیات کو فراہم کیے رکھا ہے۔ انسان کی یہ بدقسمتی ہے کہ ید بیضا تو بغل میں ہے لیکن وہ ہے کہ موم بتیوں کے چکر میں سرگرداں۔ آیئے‘ ذرا اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظامِ معیشت پر بھی روشنی ڈالیں۔

خلافت کا نظامِ معیشت

’’خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی‘‘ کے مصداق معیشت کے معاملے میں بھی اسلام کی اپروچ اسی طرح منفرد‘ یکتا اور بے مثال ہے‘ جس طرح کہ اس کا پورا نظامِ حیات۔ ایک نظامِ معیشت ہی کا کیا‘ اسلام پوری انسانی زندگی کو منظّم ویکسو کرنے کی خاطر سب سے پہلے انسان کی تہذیب وتربیت کرتا ہے اور اسے حیوانی سطح سے اُٹھا کر انسانی سطح پر لاتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ دنیا بھر کے انسانو! تمہاری یہ زمین کل نہیں، کائنات کا ایک حصہ ہے۔ پوری دنیا کا ایک ہی خالق ہے۔ خالق ہونے کے ناطے سے اسی ایک کو انسانوں کے لئے قانون سازی اور حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ ’’ان الحکم الا اللہ‘‘۔ خالقِ کائنات نے جو پہلا قانون بنایا ہے تو یہ کے اپنی تمام مخلوقات میں سے صرف انسانوں کو (اور کسی حد تک جنوں کو) کچھ صوابدیدی اختیارات وامتیازات اور چند مطلوبہ اہلیتیں دے کر زمین میں اپنا نمائندہ (خلیفہ) مقرر فرمایا ہے۔ خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس دھرتی پر کاروبارِ حیات چلانے کا ذمہ دار تو انسان ہی ہے لیکن یہ نظام اس نے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اسی کے عطا کردہ قوانین وضوابط کے مطابق چلانا ہے۔ البتہ ایک مقررہ مدت تک اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کردہ صوابدیدی اختیارات انسان کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اللہ تعالیٰ کے قوانین کو بروئے کار لاتے ہوئے اسی کی مرضی کو پورا کرے اور چاہے تو خودساختہ قوانین بنا کر اپنی مرضی کو بروئے کار لائے۔ پہلی صورت میں چونکہ انسان انہی فطری قوانین کو اپنائے گا جو زمین کے علاوہ باقی

کائنات میں بھی رواں دواں ہیں۔لہٰذا زمین اور باقی کائنات میں ہم آہنگی ہونے کے باعث کامیاب وکامران ہوگا۔بصورت دیگر دنیا کا نظام باقی کائنات کے نظام سے چونکہ متصادم ہوگا لہٰذا بدیر یا سویر ناکامی ونامرادی پر منتج ہوگا۔انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ متصادم روش اختیار کرنے کے بجائے موافق راستہ اپنائے۔

تقویٰ

خالقِ انسان یعنی اللہ تعالیٰ کا دوسرا قانون یہ ہے کہ انسانی زندگی دوادوار میں منقسم ہے۔پہلا دور اس دنیا کی مختصر زندگی پر مشتمل ہے جسے یہ قانون دارالعمل اور دارالامتحان قرار دیتا ہے جب کہ دوسرا دور موت کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں' لامحدود ہے۔اس دوسرے دور کو دارالجزا کی حیثیت حاصل ہے' عمل کا وہاں پر کوئی سوال نہیں۔پہلا دور گو مختصر ہے لیکن انتہائی اہم ہے اس لئے کہ اس دنیا میں کئے گئے اچھے یا برے اعمال کی بنا پر آخرت میں جزا یا سزا کا مستحق قرار پانا ہے۔بالفاظِ دیگر انسان اس دنیا میں شتر بے مہار نہیں کہ جو چاہے کرتا پھرے پوچھنے والا کوئی نہیں۔بس وہ مر کر یونہی خاک بن کر معدوم ہو جائے گا۔ایک انتہائی منظّم' محکم اور متوازن انتظام کے تحت اس دھرتی پر پیدا ہونے والے ہر فرد کے ہر چھوٹے بڑے عمل کو ایک بڑے رجسٹر میں محفوظ کیا جا رہا ہے جسے اس کی موت پر داخل دفتر کر دیا جاتا ہے۔ایک مقررہ دن جسے قرآن یومِ حشر' یومِ قیامہ وغیرہ سے یاد کرتا ہے اول تا آخر پیدا ہونے والے تمام انسانوں کو اٹھایا جانا ہے۔اس یومِ حساب کو ہر فرد کا رجسٹر اس کے سامنے رکھا جائے گا تا کہ وہ خود ہی اپنا کچا چٹھا پڑھ لے۔اس دن ہر فرد نہ صرف یہ کہ پڑھ لے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ کو قوت گویائی عطا کرے گا کہ وہ خود شہادت دیں کہ ان سے کیا کیا کام لئے گئے۔اس حساب کتاب کی بنا پر اللہ تعالیٰ کا ہر فرد کے بارے میں فیصلہ صادر ہوگا کہ آیا وہ جزا کا مستحق ہے یا سزا کا' اسے جنت میں داخلہ ملے گا یا دوزخ میں۔

آخرت کی یہ جواب دہی اور اللہ کے خوف کے ہمہ وقت انسانی حواس پر چھائے رہنے

کی یہ صفت شرعی اصطلاح میں تقویٰ کہلاتی ہے۔تقویٰ کی اہمیت اتنی کہ شرعی نقطۂ نظر سے اعمال آخرت کی کرنسی ہیں تو تقویٰ اس دنیا کی۔نظامِ خلافت میں امارت وافضلیت کی بنیاد روپیہ پیسہ کھیتی باڑی، مویشی، عہدہ وغیرہ نہیں، تقویٰ ہے۔جس قدر کوئی زیادہ متقی اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ زیادہ مکرّم ومحترم اور مقرّب ومتمول۔احساسِ جواب دہی ایسی پولیس چوکی ہے جو اسلام ہر مسلمان کے دل میں مستقل قائم کئے رکھتا ہے۔انسان کے عین دل میں براجمان یہ وہ چوکیدار ہے جو اس وقت بھی جاگ رہا ہوتا ہے، جب بیرونی چوکیدار سو جاتے ہیں۔رات کی تاریکی میں جب دوسرے انضباطی ذرائع فیل ہو جاتے ہیں آخرت میں حساب وکتاب کا خوف بہر حال طاری وساری رہتا ہے۔یہ وہ محور ہے کہ جس کے گرد ایک مسلمان کی پوری زندگی گھومتی ہے۔

کہاں سے لائیں گے ایسا نسخۂ کیمیاء، کمیونزم اور کیپٹلزم کے علمبردار؟

حقِ ملکیت

اللہ رب العزت کائنات کا خالق ہی نہیں مالک بھی ہے۔یہ زمین جس پر ہم رہ بس رہے ہیں نہ کسی فرد کی ملکیت ہے نہ جماعت کی۔نظام سرمایہ داری اور کمیونزم کا دعویٰ حقِ ملکیت کی بنا پر ہے۔ایک یہ حق فرد کو دیتا ہے تو دوسرا جماعت یعنی حکومت وقت کو۔اسلام اکثر وبیشتر قابض تو فرد کو ہی قرار دیتا ہے لیکن یہ قبضہ بطور امانت ہے نہ کہ بطور ملکیت۔ملکیت اسی طرح صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے جیسے قانون سازی وحکمرانی کا حق۔قرآن مجید میں ''الا لہ الحکم'' آیا ہے تو ''لہ ملک السموات والارض'' بھی آیا ہے۔خلافت کا نظامِ معیشت فرد کے حقِ قبضہ کو بھی تسلیم کرتا ہے تو اَن گنت پابندیوں کے ساتھ۔حد بندیوں سے مقید انفرادی حقِ قبضہ یا امانتدارانہ انفرادی حقِ ملکیت وہ سنگِ میل ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح انفرادی حقِ ملکیت کو بے قید نہیں ہونے دیتا۔یہ وہ مرکزی گُر ہے جو خلافت کے نظام کو کمیونزم اور مغربی سرمایہ داری نظام کے بین بین یعنی معتدل سطح پر رکھتا ہے۔خوبیاں تو دونوں کی سمیٹتا ہے، خرابیاں کسی کی بھی نہیں۔ہم ان حد بندیوں کو مختصراً زیرِ بحث لاتے ہیں۔

ا۔ باطنی اور روحانی حد بندیاں

انسانی نفس بڑا سرکش ہے۔ حرص و ہوس چھپ چھپ کر سینوں میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ حیوانی ترغیبات اور شیطانی در اندازیاں پر فریب انداز میں انسان کو انتہا پسندی اور خود غرضی میں سرگرداں رکھتی ہیں۔ محض قانونی اور ظاہری پابندیوں سے انسان کے ان سفلی رجحانات پر قابو پانا ناممکن ہے۔ آدمی اندر سے ٹیڑھا ہو تو کوئی بیرونی دباؤ اسے سیدھا نہیں رکھ سکتا۔ اسلام کا یہ اعجاز ہے کہ وہ نہ صرف انسانی ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے بلکہ جیسے کہ اوپر ذکر ہوا آخرت میں جوابدہی کا احساس دے کر خود غرضی تو کیا الٹا انسان کو ایثار و قربانی کا خوگر بناتا ہے۔ جزا و سزا اور جنت و دوزخ کا نظام ایسی ہمہ وقت لٹکتی تلوار ہے جو لحظہ بھر انسان کو بے لگام نہیں ہونے دیتی۔ قرآن و سنت بھرے پڑے ہیں ایسی تعلیمات و ترغیبات سے جو ایک مسلمان کو محض مال ہی کی کیا جان تک قربان کرنے کو انسانی پرواز کی سب سے بڑی یافت قرار دیتی ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ اور قرضِ حسنہ ایسی مدات ہیں جن کی ادنیٰ سی رمق کسی دوسرے نظامِ معیشت میں نہیں ملتی۔ انفاق کا مطلب ہے خرچ اور فی سبیل اللہ کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں۔ ہر وہ قربانی اور ہر وہ کام جو خدمتِ خلق کی مد میں کیا جائے انفاق فی سبیل اللہ قرار پاتا ہے۔ قرآن کی زبان میں اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلہ میں کامیاب قرار پانا فوز العظیم اور فوز الکبیر یعنی ''بڑی کامیابی'' سے موسوم کیا گیا ہے۔ پھر جہاں کہیں قرآنِ حکیم میں فوز العظیم اور فوز الکبیر کے الفاظ آئے ہیں ان سے پہلے اکثر و بیشتر انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر آیا ہے۔ حد یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ اور بندے کے مابین ایسے سودے کا ذکر آتا ہے کہ جس میں بندہ اپنی جان اور اپنا مال اللہ کے سپرد کرتا ہے تو اللہ اس ایثار و قربانی کے معاوضے کے طور پر اسے جنت عطا کرتا ہے۔ (توبہ: 11)

یوں اللہ تعالیٰ جو جانیں اور مال وصول کرتا ہے کسی اور کام میں نہیں لگاتا۔ لگاتا ہے تو انسانیت کی فلاح و بہبود اور خدمتِ خلق میں۔ بظاہر تو مال دیا جاتا ہے کسی ضرورتمند کو لیکن قرار پاتا ہے یہ دیا جانا فی سبیل اللہ۔ جان دی جا رہی ہوتی ہے کسی بڑی انسانی فلاح کی خاطر لیکن قرار

پاتی ہے دی جانی اللہ کی راہ میں۔قرضِ حسنہ دیا جارہا ہوتا ہے زیرِ آسماں کسی حاجت مند کو لیکن اللہ تعالیٰ کا فرمانا یہ کہ یہ قرضِ حسنہ (یعنی ایسا قرض جو بغیر کسی سود' غرض یا ایذا رسانی کے ہو) مجھے دیا جارہا ہوتا ہے۔فی سبیل اللہ دیئے جانے کا کمال یہ کہ گو دینے والے کے مال سے کچھ نکل رہا ہوتا ہے لیکن وہ کم ہونے کی بجائے الٹا زیادہ ہوتا ہے۔یہی فرمایا رب کائنات نے:

''جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا کرتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی''۔(بقرہ:261)

بڑھوتری و افزونی کا یہ پیمانہ تو اس دنیا کی حد تک ہے' جہاں تک آخرت کے معاوضہ کا تعلق ہے تو قلم اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔قرآن و سنت کے ورق الٹتے جائیں' معاوضہ بے حد و بے کنار۔ باطنی و روحانی یہ حد بندیاں اور ترغیبات وہ بنیاد ہے جس پر خلافت کے نظامِ معیشت کا قصرِ بلند پایہ استوار ہوتا ہے۔سوختہ بختی کمیونزم اور مغربی نظامِ سرمایہ داری جنہوں نے انسانیت کے ایک بڑے حصے کو ایک مدت متاثر کیا ہے دونوں اس بنیاد سے عاری ہیں۔

۲۔قانونی واخلاقی حد بندیاں

روحانی بنیاد فراہم کرنے کے بعد خلافت کا نظامِ معیشت قانونی و اخلاقی حد بندیوں کا ایک ایسا جامع' مربوط اور مؤثر پیکج لاگو کرتا ہے کہ جو اسے دوسرے نظاموں سے مزید منفرد بناتا ہے۔ایک طرف کسی فرد کے امانت دارانہ حقِ ملکیت تسلیم کرنے کے علی الرّغم اسے سرمایہ کار تو بننے دیتا ہے سرمایہ دار قطعاً نہیں تو دوسری طرف اس انفرادی حقِ قبضہ کو اس طور بے قید و آوارہ نہیں ہونے دیتا کہ جو جماعت اور اجتماعی نظامِ معیشت کو ادنیٰ زِک پہنچا سکے۔ ان صفحات میں تفصیلات کی تو گنجائش نہیں پیکج کے بنیادی اصولوں کا ذکر کرتے ہیں۔

☆انفاق فی سبیل اللہ

قرآن وسنت کی رو سے انفاق فی سبیل اللہ کی دو اقسام ہیں۔ایک فرض اور لازمی جس کا تارک گناہگار اور روزِ محشر ماخوذ ہوگا' دوسری صوابدیدی اور نفلی یعنی ایسا انفاق سبیل اللہ کہ جسے کرنے والا تو ثواب کا مستحق ہوگا لیکن نہ کرنے والا بہر حال گناہگار نہیں ہوگا۔اس بارے میں بنیادی اصول جو سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے یہ ہے کہ اسلام میں ہر آسودہ آدمی صرف اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے ہی نہیں کماتا بلکہ ان معذوروں' ناداروں اور بے کسوں کے لئے بھی کماتا ہے جو معاشرے میں کسی نہ کسی طور کلی یا جزوی طور پر اس قابل نہ رہے ہوں کہ اپنی معیشت کا خود بندوبست کریں۔قرآن میں آیا ''اور جن کے مالوں میں ایک معین حق ہوتا ہے سائلوں اور محروموں کا''۔یعنی سرمائے کی اغنیاء سے فقراء کی طرف یہ منتقلی بطور خیرات نہیں بطور حق ہے۔اسلام پھر سرمائے کی اس فرضی ونفلی منتقلی پر ہی اکتفاء نہیں کرتا بلکہ اس انداز کی بھی فکر کرتا ہے کہ جس طور پر منتقلی ہو اور اس مقدار کا بھی تعین کرتا ہے کہ جو منتقل کرنی مطلوب ہو۔ انداز پر پہلی پابندی تو یہ کہ لینے والے کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔دوسری پابندی یہ کہ دینے والا نہ تو دکھاوے کی خاطر مال دے اور نہ لینے والے پر کوئی احسان جتلائے (بارہ:264)۔تیسری پابندی یہ کہ دینے والا یہ انفاق خلوصِ نیت اور محض اللہ کی خوشنودی کے لئے کرے (بقرہ:265)۔چوتھی پابندی یہ کہ ان چیزوں کو اللہ کی راہ میں دیا جائے جو کسی کو عزیز تر ہوں (آل عمران:29) اور پانچویں پابندی یہ کہ انفاق کرنے والا اللہ کی راہ میں بھی اس قدر نہ لگادے کہ خود قلاش ہو جائے۔اسلام ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کرنے کو کہتا ہے تو خود اپنی ضرورت سے صرفِ نظر کرنے کی اجازت نہیں دیتا' ہاں کوئی ہنگامی صورتِ حال ہو تو علیحدہ بات ہے۔انداز کے ان جملہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے نظامِ خلافت ''بیت المال'' اور ''کفالتِ عامہ'' کی دو خاص اصطلاحات اور ادارے قائم کرتا ہے۔بیت المال ایک قسم کا ملکی خزانہ ہے جو آج کی دنیا کے خزانوں سے قطعی مختلف ہے کیونکہ اس میں سرمائے کی آمد وشد کے انداز یکسر

مختلف ہیں۔ اغنیاء نے جو صدقاتِ واجبہ بشکل زکوٰۃ‘ عشر‘ خراج‘ جزیہ‘ فے‘ خمس‘ ضرائب‘ کراء الارض‘ عشور‘ وقف‘ اموالِ فاضلہ وغیرہ مستحقین کو منتقل کرنا ہوتے ہیں وہ براہِ راست نہیں‘ بیت المال ہی کے ذریعہ تقسیم کرنا ہوتے ہیں۔ بیت المال میں جمع شدہ سرمایہ خلافت وقت نے وظائف کی شکل تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ صدقاتِ نافلہ کو براہِ راست بھی مستحقین میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور بیت المال کے ذریعہ سے بھی۔ اصل میں معیشت ہر فرد کا حق ہے اور یہ حقِ معیشت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ یہ حقِ معیشت ازخود قلم دوات لے کر اور بہی کھاتہ کھول کر پورا نہیں کرتا۔ لازم قرار دیتا ہے کہ خلافتِ وقت اغنیاء سے فقراء کی طرف سرمائے کی منتقلی کا کام بذریعہ بیت المال کرے۔ بالفاظِ دیگر ہر شخص کی کفالت بذمہ خلافتِ وقت ہوتی ہے اور یہی کفالت عامہ کا نظام ہے۔ اسلامی ریاست میں اگر کتا بھی بھوکا پیاسا رہے تو اس کی باز پرس خلافتِ وقت سے ہوگی۔

جہاں تک مدات و مقدار کا تعلق ہے تو اس میں سرفہرست زکوٰۃ ہے جسے اسلام نے اسی طرح ایک عبادت قرار دیا ہے جس طرح کہ نماز۔ زکوٰۃ ایسے سرمائے پر ادا کرنا فرض ہے جو باون تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونے کے برابر یا زائد ہو اور اسے پاس پڑے ایک سال گزر جائے۔ اسی طرح مال تجارت‘ مکانوں کے تجارتی کاروبار وغیرہ پر بھی زکوٰۃ واجب الادا ہوتی ہے۔ فصلوں کی پیداوار کا دسواں حصہ بارانی و نہری ہونے کی صورت میں بطور عشر ادا کرنا فرض ہے تو چاہی ہونے کی صورت میں بیسواں حصہ۔ چونکہ زکوٰۃ و عشر کی یہ ادائیگی بطور عبادت ہے لہٰذا کسی غیر مسلم پر لاگو نہیں ہوسکتی۔ غیر مسلموں کو جو اسلامی ریاست میں بطور اقلیت رہ بس رہے ہوں مال کی صورت میں جزیہ اور پیداوار کی صورت میں خراج ادا کرنا ہوتا ہے۔ ان ہر دو مقدار کو خلافتِ وقت نے موقع و محل کے مطابق طے کرنا ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض صورتوں میں معاف بھی ہوسکتی ہیں۔ مدات جن پر صدقاتِ واجبہ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے وہ بھی مقرر ہیں۔ قرآن میں آیا:

''یہ صدقات فقیروں' مسکینوں اوران لوگوں کے لئے ہیں جوصدقات کے کام پر مامور ہیں اوران کے لئے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اورقرضداروں کی مدد کرنے میں' اللہ کی راہ میں اور مسافرنوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔ یہ فریضہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اوردانا وبینا ہے'' (توبہ:60)۔

ان فرض و معین صدقات کے علاوہ نظامِ خلافت اغنیاء کوصدقاتِ نافلہ کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ ایسے صدقات کی کوئی حدنہیں سوائے اس کے کہ اپنی ضروریات کا بہرحال لحاظ رکھا جائے۔ قرآن میں آیا ''پوچھتے ہیں ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں۔ کہہ دیجئے جو کچھ تمہاری ضرورت سے زائد ہو'' (بقرہ:219)۔

اسلام کا یہ عجیب انداز ہے کہ فرائض کے علاوہ وہ ایک وسیع دائرہ ایسا چھوڑتا ہے کہ جو فرد کی صوابدید پر ہو۔ بالفاظ دیگر حسنات کی ترغیب تو دیتا ہے لیکن چھوڑتا فرد پر ہے کہ وہ چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ بالآخر معاملہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان ہے۔ یہی معاملہ ''ضرورت سے زائد'' کا ہے۔ چونکہ ہر آدمی اپنی ضروریات سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے پھر یہ بھی کہ ضرورت تو محض ذاتی یعنی گھربار چلانے کے لئے بھی ہوسکتی ہے اور کسی کاروبار کے چلانے کے لئے بھی لہذا ''ضرورت سے زائد'' کا فیصلہ فرد کے ہاتھ میں دے دیا ہے البتہ اس تنبیہہ کے ساتھ کہ ''دیکھنا دنیا کا فکر بھی کرنا تو آخرت کا بھی''۔

بعض حالات میں جیسے جنگ' قحط وغیرہ کے موقع پر خلافتِ وقت کو اختیار ہے کہ وہ بخوشی صدقاتِ نافلہ نہ کرنے والوں سے ایسے صدقات جبری وصول کرے۔ نیز اسلامی نظام میں گوایسی نوبت تو کم ہی آتی ہے لیکن اگر صدقاتِ واجبہ خلافتِ وقت کو جبری بھی وصول کرنا پڑیں تو یہ اس کا حق ہے۔

☆ وراثت: فیکٹری وکارخانہ لگانے کی صورت میں یا زمین خریدنے اور مکانوں کے کاروبار وغیرہ کی صورت میں بعض اوقات ذاتی ضرورت چونکہ اجتماعی ضرورت کا روپ دھار لیتی ہے لہذا ایسی جمع شدہ جائیداد کو بھی نظامِ خلافت ایک یا چند ہاتھوں میں مجتمع ہونے نہیں دیتا بلکہ

وارثوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اسلام کا قانون وراثت بھی منفرد اور جامع ہے۔ وراثت میں محض مردوں ہی کے نہیں عورتوں کے بھی حصے مقرر ہیں۔ پھر یہ حصے اس بنیاد پر کم وبیش ہیں کہ کس نے کس درجہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا ہے۔ اسلام نان ونفقہ کا بوجھ چونکہ مرد پر ڈالتا ہے اور عورت نے چونکہ والدین اور سسرال دونوں طرف سے وراثت حاصل کرنا ہوتی ہے یعنی مرد نے نان ونفقہ کے اخراجات ادا کرنے ہوتے ہیں تو عورت نے وصول کرنے' مرد نے حقِ مہر ادا کرنا ہوتا ہے تو عورت نے وصول کرنا' لہٰذا اصولی طور پر تقسیم وراثت کے وقت بیٹیوں کا حصہ بیٹوں سے آدھا ہوتا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی مختلف صورتیں ہوں یا قوانینِ وراثت مقصدان تمام کا ایک منظّم و موثر انداز میں مستقلاً خلافت کی اس پالیسی کی تکمیل ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے تو اس طرح کہ ''تا کہ مال تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے'' (حشر:7)

شدید ترین عذاب کی وعید دی ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو مذکورہ اقدامات سے سرمائے کو سرکولیشن میں رکھنے سے قاصر رہیں۔

☆ حلال وحرام: نظامِ خلافت صرف ارتکازِ دولت کو ہی حرام قرار نہیں دیتا' ناجائز ذرائع سے دولت کمانے اور ناجائز راستوں پر خرچ کرنے کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔ کمائی کے حرام ذرائع میں سے سود اور جوا سرِ فہرست ہیں۔ عجیب فلسفہ ہے اسلام کا اس بارے میں بھی۔ جب دوسرے نظام ہائے معیشت داعی ہیں کہ سود سے سرمایہ بڑھتا اور مفت تقسیم کرنے سے کم ہو جاتا ہے' اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ سود سے معیشت تباہ اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے نشو ونما پاتی ہے۔ کیپٹلزم اور کمیونزم انفرادی اور اجتماعی سطح پر سرمائے کے ایسے ایسے حوض بناتے ہیں کہ جن میں چھوٹے چھوٹے سرماؤں کا مسلسل اور مستقل بہاؤ رہتا ہے۔ اس کے برعکس سود کو حرام کر کے اور صدقات کو لازم قرار دے کر اسلام بڑے سرماؤں کا اس طور رخ چھوٹے سرماؤں کی طرف موڑ دیتا ہے کہ بڑے سرماؤں کا وجود تک برقرار نہیں رہتا۔ پھر اسلام انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر دولت کمانے کے تمام دیگر طریقوں کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔ ذخیرہ اندوزی' ملاوٹ' رشوت' بدعنوانی' شراب نوشی

حتیٰ کہ جنسی جذبے کا استحصال قطعاً ممنوع ہے۔ فضول خرچی، تبذیر، جھوٹی نمود و نمائش، ناچ گانے وغیرہ کی کسی طور اجازت نہیں دیتا۔

☆ **تجاوزات ممنوع:** خلافت کا نظام معیشت اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح وہ فرد کو ایسی بے لگام آزادی نہیں دیتا کہ جو جماعت اور جماعتی نظام کو درہم برہم کر دے اور نہ کمیونزم کی طرح جماعت کو حق دیتا ہے کہ وہ فرد کو محض ایک مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دے۔ افراد معاشرہ میں جبری مساوات کو وہ انسانی پرواز کے لئے سم قاتل قرار دیتا ہے۔ اسلام مساواتِ معیشت کی بجائے درجاتِ معیشت کو تسلیم کرتا ہے۔ فرد کی ترقی و بہبود کی اجازت تو دیتا ہے لیکن جماعتی ترقی و بہبود کی قیمت پر نہیں۔ وہ ایسے کاروبار تک کی اجازت نہیں دیتا جو جماعت کے حق میں نہ ہو۔ شراب سازی، فال گیری، کہانت، نجوم، آستانہ پرستی، رہبانیت، سٹہ، آڑھت، جسم فروشی، جو مال موجود نہ ہو اس کی خرید و فروخت، مزارعت، مضاربت وغیرہ کو گندے شیطانی افعال قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اسلام جماعتی فلاح و بہبود کی اجازت تو دیتا ہے لیکن فرد کی ترقی و بہبود کی قیمت پر ہرگز نہیں۔ ایسی قدغنوں کی اجازت نہیں دیتا کہ جو فرد کے فطری ارتقاء، ذہنی پرواز اور ذاتی دلچسپی کی راہ میں حائل ہوں۔ اسلام جب مذہب کے معاملہ میں جبر کا قائل نہیں تو ایسی انفرادی سعی، جدوجہد اور حقِ انتخاب جو جماعت کے لئے بے ضرر ہو پر قدغنیں کیسے گوارا کر سکتا ہے۔

☆ سرمایہ و محنت میں توازن

اسلام پوری امت کو ''امتِ وَسط'' قرار دیتا ہے یعنی ایسی جماعت جو درمیانی راستہ اختیار کرنے والی اور انتہا پسند نہ ہو۔ دینِ حق کسی بھی معاملہ میں عدم توازن کا سخت مخالف ہے۔ اس کے نزدیک جس طرح میاں بیوی کے مابین عدم توازن سے معاشرتی و سماجی نظام تباہ ہو جاتا ہے اور جس طرح راعی و رعایا کے مابین عدم توازن سے سیاسی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اسی طرح سرمایہ و محنت کے مابین عدم توازن سے معاشی و اقتصادی نظام الجھاؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اعتدال و توازن نظام خلافت کی سرشت میں شامل ہے۔ اس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ خلیفۂ وقت ایک

تو اوسط شہری کے معیار زندگی کو اپنائے اور دوسرے وہ دار الخلافہ کی مرکزی مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض ادا کرے۔ کہنے کو یہ دونوں کام عام سے معلوم ہوتے ہیں لیکن اتنے دور رس نتائج کے حامل ہیں کہ نظامِ خلافت کو دوسرے نظام ہائے زندگی سے ممیّز کرنے میں کلیدی حیثیت کے مالک۔ جب خلیفۂ وقت نے نان جویں پر گزر اوقات کرنا ہو تو دوسرا کون ہے جو مزدور کا حق مار کر اپنا محل بنائے۔ پھر اگر بنانے پر مائل ہو ہی جائے تو مزدور کے لئے خلیفۂ وقت سے ملاقات اتنی آسان کہ دن میں پانچ وقت۔ ایسے میں محض سرمایہ و محنت کے شعبہ میں عدم توازن پیدا ہونے کی نوبت آئے گی بھی تو کیسے؟ اسی سلسلہ کی دوسری کڑی یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا نظامِ عدل دیتا ہے جو دشمن سے بھی کسی زیادتی کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر قانون سے کوئی بالا نہیں۔ جب خلیفۂ وقت کو بوقتِ ضرورت عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہوتا ہے تو اور کون مائی کا لال کہ جو عدم توازن کا ارتکاب کرے۔ تیسری کڑی یہ کہ جب سرمایہ دار کی جائز کمائی میں بھی محتاج کا حصہ ہے تو سرمایہ دار مزدور کے اس حصے میں ڈنڈی کیوں مارے گا جو بطور محنت اس کا معاوضہ ہو۔ نظام کو متوازن رکھنے کے سلسلہ میں آخری کیل یہ کہ آخرت میں جوابدہی کا خوف۔ مزدور کام چور ہو تو خیانت کا مرتکب قرار پائے گا اور سرمایہ دار مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا نہ کرے تو وہ بھی ماخوذ ہوگا۔ کس قدر متوازن و معتدل نظام۔۔۔۔ نظامِ خلافت

حرفِ آخر

اسلام کا نظامِ حیات اس لئے متوازن و معتدل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ ہونے کے ناطہ سے حرفِ آخر ہے۔ انسان کا ایسے نظام کو پس پشت ڈال کر انتہاؤں پر اور تجربات میں سرگرداں رہنا ماسوائے بدبختی اور کج رفتی کے اور کیا ہے؟ کہتے ہیں کہ سچ کی لانب ہوتی ہے تو جھوٹ کا ابھار۔ بہت جھوٹ آزما لیا انسانیت نے خود ساختہ نظام ہائے زندگی اپنا کر کیا وقت ابھی نہیں آیا سچ اپنانے کا؟ نیو ورلڈ آرڈر، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن وغیرہ سب پھندے ہیں انسانیت کو زیر و زبر کرنے کے۔

پلٹ اے انسان! اپنے رب کی طرف اور اسی کے عطا کردہ نظام...... نظامِ خلافت کی طرف۔

خلافت کا نظامِ اطاعت

عصرِ حاضر کے مسلمانوں کی مثال اس ہٹ دھرم اور احمق شخص کی سی ہے کہ جو مٹی کا ڈھیلہ کھا رہا ہو لیکن مصر ہو کہ وہ گڑ کھا رہا ہے۔ اسے لاکھ کہا جائے کہ گڑ کھانے کی صورت میں اس کا منہ میٹھا ہونا چاہئے تھا جو نہیں ہو رہا تو گڑ کیسے ہوا؟ وہ کوئی دلیل سننے پر آمادہ ہی نہ ہو بس رٹ لگاتا جائے کہ گڑ بہت اعلیٰ قسم کا ہے۔ گنے کی فلاں' مشہور ورائٹی سے بنایا گیا ہے۔ مصالحہ وغیرہ کے بھی بغیر ہے اور بہت لذیذ ہے۔ مسلمانانِ عالم آج جس دین کو اپنائے ہوئے ہیں فرض کر بیٹھے ہیں کہ وہ قرآن وسنّت پر مبنی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ قرآن وسنّت پر مبنی ہے تو پھر ہمیں وہ برکات وفوائد حاصل کیوں نہیں ہو رہے جو خلافتِ راشدہ کے دور میں ہوئے تھے۔ بلکہ صورتِ حال ۱۸۰ درجے برعکس ہوگئی ہے۔ اس وقت اسلام والے دنیا میں غالب تھے جب کہ آج مغلوب ہیں۔ اس وقت امن وسکون کا دور دورہ تھا جب کہ آج دہشت گردی کا ہے۔ اس وقت عدل تھا تو آج ظلم' اس وقت مسلمانوں کا مقدر خوشحالی تھا تو آج بدحالی۔ صورتِ حال کا یوں الٹ ہو جانا کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ جس دین کو اسلام سمجھ کر ہم چمٹے ہوئے ہیں وہ اسلام کی ایک انتہائی تبدیل شدہ بلکہ مسخ شدہ شکل ہے۔ صورتِ حال دو اور دو چار کی طرح ہمارے سامنے ہے لیکن ہم ہیں کہ مفروضوں پر جی رہے ہیں۔ بزعمِ خویش بڑے دیندار اور اللہ کے محبوب بنے ہوئے ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت کچھ ایسی ہی حالت یہود کی تھی۔ وہ خود کو اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے تصور کرتے تھے۔ قرآن مجید نے ان کا پردہ چاک کیا تو اس طرح کہ لاؤ دلیل اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو؟ ہمارا دعویٰ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ ہم مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے نام مسلمانوں کے سے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی ہمارے کانوں میں اذان دی جاتی ہے۔ عقیقہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں مسجدیں ہیں۔ نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ روزے رکھے جاتے ہیں' عمرہ وحج کی ادائیگی ہوتی ہے۔

کیا یہ سب کچھ قرآن وسنّت پر مبنی دین نہیں؟

جی نہیں، ہرگز یہ وہ دین نہیں جو قرآن وسنّت میں من وعن اب بھی موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ محض نماز، روزے، عمرہ وحج اور کفن دفن جیسے افعال کرنے پر ہی اکتفاء کرتے تو کہا جا سکتا تھا کہ دین اسلام بس یہی کچھ ہے۔ لیکن نبی کائنات ﷺ اور صحابہؓ نے کیا بس یہی کچھ کیا؟ غور کریں تو انہوں نے اور بھی بہت کچھ کیا جو ہم آج نہیں کر رہے۔ انہوں نے اولیں فرصت میں وقت کے نظامِ باطل کو نظامِ حق سے بدل دیا جب کہ ہم ایسا نہیں کر رہے۔ انہوں نے قرآن وسنّت کی پیروی میں اللہ کے دن کو دنیا میں غالب کر دیا۔ اس کے برعکس ہم آج مغلوبیت پر قانع ہیں۔ اس وقت کے مسلمان دنیا بھر کی قیادت پر متمکن تھے جب کہ آج ہم نہ صرف کفار ومشرکین سے ڈکٹیشن لیتے ہیں بلکہ ان ہی کے سہارے جی رہے ہیں۔ کھاتے بھی ان کا ہیں، ڈالر بھی ان سے لیتے ہیں، اسلحہ بھی ان سے حاصل کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آس لگائے ہوئے ہیں کہ کشمیر وفلسطین جیسے ہمارے مسائل وہی حل کریں گے۔ اس وقت کے مسلمانوں نے دنیا بھر سے ظلم کو مٹا دیا تھا جب کہ ہم خود ظلم وجور اور دوہرے معیار کے شکار ہیں۔

یہی نہیں، اس وقت کے مسلمان قرآن وسنّت کی تعلیمات کے مطابق ایک خلیفہ کی سرکردگی میں تھے تو آج ہم 57 سربراہان کو خود پر مسلط کئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے قرآن وسنّت کو آئینِ مملکت قرار دیا ہوا تھا، ہم نے خود ساختہ کتابچے کو آئینِ مملکت بنایا ہوا ہے۔ انہوں نے جہاد کیا تو صرف خلیفہ کے حکم وایماء پر جب کہ آج ہمارا جہاد ٹولیوں، گروہوں بلکہ آپس میں لڑنے کا جہاد ہے۔ صدیاں بیت گئیں ہم نے خلیفہ ہی کو چلتا کیا ہوا ہے۔ وہ قرآن وسنّت کی پیروی میں ایک امّت کی شکل میں تھے، ہم سیاسی طور پر درجنوں اقوام میں منقسم ہیں تو مذہبی طور پر بے شمار فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ بتائیے جب ہم نے اس دین کو اپنایا ہی نہیں ہوا جو اس وقت کے مسلمانوں نے اپنا رکھا تھا تو ہمیں اس دور کی برکات حاصل ہوں تو کیسے؟

سب سے بڑی بھول ہماری یہ ہے کہ خود کو پکے سچے مسلمان فرض کئے ہوئے ہیں۔ احساسِ زیاں ہے ہی نہیں۔ راہ گم کئے ہوئے ہیں۔ پٹڑی سے اترے ہوئے ہیں۔ دنیا بھر میں

جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں لیکن اپنے کردار پر نظر ثانی کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ اصلاح کی طرف اس لئے نہیں آرہے کہ خود کو گمراہ سمجھتے ہی نہیں۔ الٹے جشن اور جوبلیاں مناتے ہیں جیسے کہ بڑے کامیاب جارہے ہیں۔

خلافتِ راشدہ کو قرآن وسنّت پر مبنی نظام کیوں کہا جاتا ہے؟ اس لئے کہ اسلام محض ایک نظریہ اور ایک تھیوری ہے اگر قرآن وسنّت کے صفحات تک محدود رہے لیکن جب یہ نظریہ کسی خطۂ زمین میں نافذ ہو جائے' یہی خلافت ہے۔ بالفاظِ دیگر خلافت ہے تو دینِ اسلام ہے ورنہ نہیں۔ کہاں ہے آج خلافت؟ خلافت نہیں تو پھر دین کیسا ہوا؟ نظامِ خلافت ایک مخصوص نظام ہے جس کا ہر شعبہ دنیا کے ہر دوسرے نظام سے مختلف ہے۔ دنیا کے نظام اور شعبے تو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں جب کہ نظامِ خلافت اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ اور ہادیٔ برحق ﷺ کا آزمایا ہوا ہے۔ آج کی مسلمان حکومتوں کو نظامِ خلافت کا بدل تصور کر بیٹھنا ہی تو ہماری بڑی غلطی ہے۔ نظامِ خلافت کے مختلف شعبہ جات کی مخصوص ترکیب کے پیشِ نظر ''خلافت کے نظامِ اطاعت'' پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

اسلام کا نظامِ اطاعت

اطاعت کا بنیادی مفہوم ہے کسی کام کو بطیبِ خاطر' دل کی کشادگی اور پسندیدگی سے کرنا۔ طوعاً اور اطاعت کا مادہ ایک ہی ہے۔ طوعاً کے مقابلہ میں کرھاً استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کسی کام کو ناگواری سے یا نہ چاہتے ہوئے کرنا۔ اسلام کی ان گنت دیگر اصطلاحات کی طرح ''طاعۃ'' بھی خاص مفہوم رکھتی ہے بلکہ اصل میں یہ محض طاعۃ نہیں سمع وطاعۃ کے طور پر مستعمل ہے یعنی ادھر سنا' ادھر فوراً تعمیل کردی۔ تعمیل بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یعنی برضا و رغبت۔ سمع و طاعت اسلام کے ان پانچ بنیادی اصولوں میں سے دو اصول ہیں جن کو رسول ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا تو اس طرح:

''میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔ (امیر کی بات) غور سے سننا' اس کے حکم کی اطاعت کرنا' اللہ کی راہ میں ہجرت کرنا' جہاد کرنا اور جماعت (امّت) میں شامل رہنا۔ بس جو شخص جماعت سے بالشت بھر الگ ہوا اس نے اسلام (کی رسی) کا

پھندا اپنی گردن سے اتار پھینکا الّا یہ کہ وہ جماعت میں دوبارہ لوٹ آئے‘‘۔(ترمذی)

گوشہ نشینی کی زندگی اسلام میں ممنوع اور محض انفرادی زندگی غیر مسنون ہے۔ جماعتی (جماعت کا لفظ قرآنِ کریم میں استعمال نہیں ہوا، احادیث میں ہوا ہے لیکن اکثر و بیشتر امّت کے معنی میں) نظام امارت کے بغیر نہیں چل سکتا اس لئے لازم قرار دیا گیا کہ جماعت چھوٹی ہو یا بڑی ایک امیر کی سرکردگی میں ہو حتیٰ کہ اگر تین مسلمان سفر کریں تو وہ بھی اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔ یاد رہے اسلام میں نماز کی امامت، امامتِ صغریٰ ہے تو امت کی امامت امامتِ کبریٰ۔ امامتِ صغریٰ میں ہزاروں لاکھوں مقتدی پیش امام کی ایک صدا پر فی الفور گردنیں جھکا دیتے ہیں تو دوسری صدا پر فی الفور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کسی کی کیا مجال کہ ذرا پس و پیش کرے۔ اسی پر قیاس کریں امیرِ امت کی اطاعت کا اور اس نظم و ضبط کا کہ جو امّت کی سطح پر مطلوب ہے۔ امیرِ امّت کی اطاعت جو اس قدر مؤکد و لازم ہے مشروط ہے ایک بڑی شرط کے ساتھ کہ امیرِ امّت خود اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت میں ہو۔ بالفاظِ دیگر خلافت کا نظامِ اطاعت تین اطاعتوں پر مشتمل ہے۔ اللہ کی اطاعت، رسول ﷺ کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت۔ قرآن میں آیا:

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر تمہارے مابین کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول (ﷺ) کی طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو‘‘ (نساء:۵۹)

یہ نظام ہے تو تین سطحی لیکن یہ راستہ اختیار کیا گیا ہے محض اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے جو مستقل بالذات ہے۔ ذیل میں ہر اطاعت کو علیحدہ علیحدہ زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

اللہ کی اطاعت

اللہ تعالیٰ کی اطاعت اصل اور مستقل بالذات ہے۔ ’’ان الحکم الا للہ‘‘ قانون سازی و حکمرانی صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ انفرادی و اجتماعی اطاعت کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ اولیں اطاعت ان احکامات و قوانین کی ہے جو قرآن میں مل جائیں۔ دوسرے قوانین اور فرمانبرداریاں صرف اسی صورت قبول کی جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قانون و فرمانبرداری کے مدِ

مقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت اور تابع ہوں۔ ہر وہ حلقۂ اطاعت وارادت نا قابلِ قبول ہے جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت سے ماوراء ہو۔ بڑی تاکید ہے اسلام میں والدین کی خدمت وارادت کی لیکن ان کے بھی ہر اس حکم کو بے چون وچرا ٹھکرا دیا جائے گا جو قرآن وسنّت کے خلاف ہو۔ فرمایا گیا:

''ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک ٹھہرائے جس کی دلیل نہیں تو ان کی اطاعت نہ کر'' (عنکبوت:۸)

نبیٔ کائنات ﷺ نے اس امر کی مزید وضاحت فرمائی تو اس طرح کہ ''خالق کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں اطاعت جو کچھ بھی ہے معروف میں ہے'' (بخاری ومسلم)۔ مختصراً یہ کہ آیتِ اولی الامر میں ذکر تو تین اطاعتوں کا ہے لیکن ان تین اطاعتوں کی ترتیب وترکیب اس طرح سے ہے کہ اصل میں اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کے قوانین واحکام کی پیروی ہوتی ہے اور بس۔

رسول ﷺ کی اطاعت

دوسری اطاعت رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ یہ اطاعت مستقل بالذات تو نہیں لیکن مستقل اور دائمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی ایسی اطاعت قابلِ قبول نہیں جو رسول ﷺ کی اطاعت کے راستہ سے نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی واحد عملی صورت رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ انسانیت کے پاس احکام وقوانینِ الٰہی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی وصفات کا علم جو بھی ہے رسول ﷺ کا بتایا ہوا ہے۔ رسول ﷺ کی اطاعت اس لئے مستقل اور لازمی ہے کہ اس نے نہ صرف احکام الٰہی کی تشریح و توضیح کرنا ہوتی ہے بلکہ خود ان پر عمل کر کے اور ان کے مطابق پوری زندگی گزار کر نمونہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ تشریح وتوضیح اور عمل پیرائی آفاقی قانون کا ہی حصہ ہوتی ہے۔ بشر کو پیغمبرؑ بنانے میں مصلحت ہی یہی ہے۔ بنابریں رسول ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت بن جاتی ہے۔ قرآن میں آیا:

''کہہ دو، اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا، اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو

اور رسول کی، اگر یہ اعراض کریں تو جان لیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا'' (آل عمران: ۳۱۔۳۲)

ایک اور جگہ پر فرمایا:

''جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی، دراصل اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جو منہ موڑ گیا، تو بہرحال ہم نے تمہیں ان پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا'' (نساء: ۸۰)

مزید فرمایا:

''اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو جب کہ تم سن رہے ہو''۔ (انفال: 20)

ایسا اس لئے ہے کہ رسول ﷺ کے فرائض میں ہے کہ وہ لوگوں کو دوسروں کی غلامی و بندگی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی بندگی و غلامی میں لائے۔ یہ امکان ہی خارج از بحث ہے کہ کوئی نبیؑ کسی کو اپنی یا کسی دوسرے کی بندگی میں لائے۔ وہ ''اول المسلمین'' پہلے ہوتا ہے اور دوسروں کو اللہ کی بندگی و غلامی میں بعد میں لاتا ہے۔ قرآن میں آیا:

''کسی انسان کا یہ بس نہیں کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبیؑ تمہیں کفر کا حکم دے جب کہ تم مسلم ہو'' (آل عمران: ۷۹۔۸۰)

رسول ﷺ اس لئے نہیں آتا کہ ایمان تو اس کی رسالت پر لایا جائے اور اطاعت اپنی یا کسی دوسرے کی مرضی کی کی جائے۔ رسولؐ کی اطاعت کا محور و مقصد تمام دوسرے قوانین وضوابط کو چھوڑ کر اس قانون کی پیروی کرنا ہوتا ہے جو وہ لے کر آتا ہے۔ قرآن میں آیا:

''نہیں، اے محمد ﷺ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں

میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کرلیں'' (نساء:٦٥)

اسی حقیقت کو ایک حدیث میں بیان کیا گیا تو اس طرح:

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس طریقہ کی تابع نہ ہوجائے جو میں لایا ہوں''۔

رسول ﷺ کی اطاعت اس لئے بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے کہ یہ اطاعت باذن اللہ ہے۔ قانون تو وہی ہوتا ہے جو اللہ کا دیا ہوا البتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ طریقہ فیصلہ کن سند ہے جس سے کہ رسول ﷺ اس قانون پر عمل کر کے نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس سند کو قبول کرنے یا نہ کرنے پر کسی کے مومن ہونے یا نہ ہونے کا دارومدار ہے۔ قرآن میں آیا:

''ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے'' (نساء:٦٤)

ایک اور بات جو اطاعتِ رسول ﷺ کے معاملہ میں جاننا انتہائی ضروری ہے یہ ہے کہ رسول ﷺ بیک وقت رسول بھی ہوتا ہے تو خلیفۂ وقت بھی۔ البتہ یہ منصبِ خلافت مخفی رہتا ہے اگر رسول ﷺ کی جدوجہد کے باوجود کوئی اسلامی ریاست معرضِ وجود میں نہ آسکے۔ ریاست اگر قائم ہوجائے جیسے کہ نبیٔ کائنات ﷺ کے معاملہ میں ہوئی تو پھر منصبِ خلافت کا ظہور بھی ہوتا اور بھرپور ہوتا ہے۔ دائرۂ رسالت کا کام ایک تو اللہ تعالیٰ کا پیغام دنیا والوں کو پہنچانا ہوتا ہے اور دوسرا احکامات وقوانینِ الٰہیہ کے مطابق اسلامی ریاست کو معرضِ وجود میں لانا اور وحی کے نظام کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست قائم ہوجانے کے بعد اس کا چلانا' اسے وسعت واستحکام دینا وغیرہ فرائضِ خلافت کا حصہ ہیں۔ نبیٔ رحمت ﷺ کے دور کو لیں تو مکی دورِ نبوت میں جو کچھ ہوا اور جس کے نتیجہ میں ہجرت پر ایک ننھی منی اسلامی ریاست معرضِ وجود میں آگئی زیادہ تر کارِ رسالت تھا۔ اس کے برعکس مدنی دورِ نبوت میں زیادہ تر کارِ خلافت کا اظہار رہا۔ رسول ﷺ تو رسول تھے خواہ مکی دورِ نبوت ہو یا مدنی البتہ یہ غزوات' لشکروں کی ترکیب وترتیب' معاہدات' نظامِ قضا کا قیام غرضیکہ قوانین الٰہی کا عملی نفاذ اور اسلامی ریاست کی توسیع واستحکام کارِ خلافت تھا۔ قرآن مجید میں یہ جو

رسول ﷺ کو مسلمانوں سے مشورہ کرنے کی تاکید کی گئی ظاہر ہے یہ مشورے کی ضرورت انہیں بطورِ خلیفہ درکار تھی' کارِ رسالت میں کسی سے مشورے کرنے کا کیا سوال؟

اولی الامر کی اطاعت

نظامِ خلافت کے تین سطحی نظامِ اطاعت میں تیسری اطاعت اولی الامر کی اطاعت ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ جس طرح رسول ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اسی طرح اولی الامر کی اطاعت اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ من بعدِ رسول ﷺ قرآن وسنّت کی شکل میں اصلاً تو اطاعت ہوتی ہے اللہ ورسول ﷺ کی لیکن ظاہر ہے قرآن وسنّت کا نفاذ کسی اتھارٹی کے بغیر ممکن نہیں۔ ایسی اتھارٹی ہی اسلام میں اولی الامر کہلاتی ہے اور اسلام کے نظم وضبط کا یہ معراج ہے کہ اس نے اولی الامر کی اطاعت کو اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ اولی الامر کی اطاعت کے بغیر اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت نہ ممکن ہے نہ قبول بالخصوص اجتماعی دائرۂ کار میں۔ یہ بات البتہ زور دینے کے قابل ہے کہ اولی الامر کی اطاعت اللہ ورسول ﷺ کے بعد اور اس کے تحت ہے۔

اولی الامر کا مطلب ہے ایسے اصحاب کا گروہ کہ جن میں سے ہر ایک صاحبِ امر ہو یعنی وہ ایسے مقام اور عہدے پر ہو جہاں پالیسی امور طے ہوتے ہیں۔ قرآن کی دوسری اصطلاحات کی طرح اولی الامر بھی ایک خاص اصطلاح ہے۔ ایک تو ہر صاحبِ امر کے لئے قرآنی معیارِ اہلیت کے مطابق ہونا ہوتا ہے اور دوسرے اولی الامر میں ہوتے تو گورنر' وزراء' جج صاحبان' افواج کے سربراہان' ارکانِ شوریٰ' ذہنی وفکری رہنمائی کرنے والے علماء وغیرہ تمام ہیں لیکن ان میں مرکزی اور کلیدی حیثیت خلیفۃ المسلمین کی ہوتی ہے۔ پھر خلیفہ المسلمین بھی ایک خاص شرعی اصطلاح ہے ہر حکمران کو خلیفۃ المسلمین نہیں کہا جا سکتا۔ خلیفہ وقت ہونے کے لئے دوسری شرعی شرائط کے ساتھ پوری اسلامی دنیا کا اس کی سرکردگی وسربراہی میں ہونا ہے۔ ایسا گروہ جس کا ہر فرد قرآنی معیارِ اہلیت پر پورا نہ اترے یا اس میں مرکزی حیثیت خلیفۂ وقت کو نہ ہو اولی الامر نہیں۔ اگر دنیا میں خلیفہ المسلمین ہو ہی نہ (جیسے کہ آج نہیں) تو فوراً دو غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔۔ ایک تو اولی

الامر کا وجود دنیا سے معدوم ہو جاتا ہے اور دوسرے امّتِ مسلمہ کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ متعدد اقوام معرضِ وجود میں آ جاتی ہیں۔ پھر جب اولی الامر کا وجود نہ رہے تو اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت درہم برہم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے انڈے سے اگر زردی نکال دی جائے تو وہ بچہ بنانے کی اہلیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ صورت عود کر آتی ہے کہ جیسے دورِ جاہلیت کہ جس میں نہ خلیفہ تھا نہ خلافت نہ اولی الامر اور نہ ہی امّتِ مسلمہ۔ ایسی صورت کی خود نبی رحمت ﷺ نے وضاحت فرمائی تو اس طرح:

''جو اطاعت سے نکل گیا اور جو جماعت میں نہ رہا' پھر مرا تو وہ جہالت کی موت مرا'' (مسلم)

یعنی ایسی صورت میں امامِ کعبہ بھی مرے تو جہالت کی موت مرتا ہے۔ ہاں' کسی کے جہالت کی موت مرنے سے بچنے کے لئے ایک ہی صورت ممکن ہے کہ وہ نظامِ خلافت کو پھر ایک حقیقت بنانے کی جدوجہد کر رہا ہو۔

اولوالامر کی اطاعت' اطاعت کی تیسری کڑی تو ہے لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا اس بڑی شرط کے ساتھ کہ وہ خود اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت میں ہوں۔ جونہی وہ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت سے نکل جائیں وہ اپنے حقِ اطاعت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کی اطاعت فرض ہے لیکن محض معروف میں۔ حدیث میں آیا:

''مسلمان پر لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سننا چاہئے اور نہ ماننا چاہئے'' (بخاری و مسلم)

معروف میں البتہ اطاعت ہوگی تو اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت ممکن' ورنہ نہیں۔ نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی'' (بخاری و مسلم)

اولی الامر کے نہ ہونے سے چونکہ نظامِ اطاعت درہم برہم ہو جاتا ہے اور نظامِ خلافت معدوم ہو جاتا ہے لہٰذا نظامِ صلوٰۃ' نظامِ زکوٰۃ' نظامِ قضاء غرضیکہ زندگی کا ہر شعبہ بے سروپا ہو جاتا ہے۔ دین کی جو برائے نام شکل رہ جاتی ہے اس سے اسلام کی فیوض و برکات تو کیا' اُلٹے نقصانات وفروعات سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ غالب ہونے کی بجائے مسلمان مغلوب ہو جاتے ہیں۔ امن کی جگہ دہشت گردی آ دھمکتی ہے۔ عدل' ظلم سے بدل جاتا ہے اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مسلمان درماندگی و پسماندگی اور ذلت ورسوائی سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

آیتِ اولی الامر (نساء: ۵۹) میں جو آخری قانون بیان کیا گیا ہے تو یہ کہ کتاب اللہ اور سنّت رسول ﷺ کو تو اسلامی قانون کے مرجع کی حیثیت حاصل ہے' اولی الامر کو نہیں۔ جب بھی اولی الامر کے آپس میں یا اولی الامر اور عوام کے مابین کوئی تنازع ہو جائے تو لازم ہے کہ فوراً اللہ و رسول ﷺ (قرآن وسنّت) کی طرف رجوع کیا جائے۔

خروج

جس طرح اسلام طلاق کی اجازت تو دیتا ہے لیکن نہ صرف ناپسندیدگی کے ساتھ بلکہ متعدد مصالحتی کوششیں اور فارمولے آزمانے کے بعد' اسی طرح خروج کی اجازت تو دیتا ہے لیکن آخری سے بھی آخری حربہ کے طور پر۔ احادیث میں آیا:

''تم پر لازم ہے سننا اور اطاعت کرنا (حکمِ حاکم کا) تکلیف اور راحت میں' خوشی اور رنج میں اور جس وقت تیرا حق کسی اور کو دیں'' (مسلم)

بایں ہمہ خروج کے امکان کو خارج از بحث قرار نہیں دیا گیا۔ نبی کائنات ﷺ نے فرمایا:

''تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہارِ ناراضگی کیا وہ بری الذمہ ہوا۔ جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ایسے میں راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہؓ نے پوچھا ''یارسول اللہ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں۔ فرمایا: نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں''۔ (مسلم)

ایک اور حدیث میں فرمایا ''جب تک کہ وہ نماز قائم کرتے رہیں''۔ اسلام میں قیامِ نماز کا نظام یہ ہے کہ خلیفۂ وقت خود دارالخلافہ کی مرکزی مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض ادا کرے اور باقی پوری اسلامی دنیا کی مساجد میں اسی کے ایماء وامر (On Behalf of) آئمہ حضرات امامت وخطابت کے فرائض ادا کریں۔ نیز مساجد محض نماز کے لئے ہی مختص نہ ہوں بلکہ ان میں تمام مقامی واجتماعی معاملات مشورے سے طے ہوں۔ (عرصہ ہوا ہمارے ہاں قیامِ نماز کا نظام درہم برہم ہو چکا)

خروج کے بارے میں آپ نے ایک اور موقع پر یوں بھی فرمایا:

''ہم جھگڑا نہ کریں گے اس شخص کی خلافت میں جو اس کے لائق ہو مگر جب کھلم کھلا کفر دیکھیں جو اللہ تعالیٰ کے پاس حجت ہو'' (مسلم)

خروج کی نوبت تبھی آسکتی ہے جب مذکورہ بالا ایک یا دونوں شرائط پوری ہوں۔ یعنی ایک تو اس صورت میں کہ حکمرانِ وقت مسلمانوں کے درمیان نظامِ صلوٰۃ قائم نہ کرسکیں اور دوسرے جب وہ کھلم کھلا کفر کے مرتکب ہوں۔ ان دونوں صورتوں میں بھی خروج کی اجازت' جیسے کہ ہم نے اوپر کہا' آخری سے آخری حربہ کے طور پر ہے۔ ورنہ خروج سے پہلے دونوں صورتوں میں شوریٰ کو اختیار ہے کہ جب بھی خلیفۂ وقت یا اولی الامر کا کوئی دوسرا فرد کسی طور قرآنی معیارِ اہلیت سے گر جائے تو اسے برخاست کردے۔ ظاہر ہے یہ نظامِ صلوٰۃ کا قائم نہ کرنا یا کفر کا کھلم کھلا مرتکب ہونا قرآنی معیارِ اہلیت کی گراوٹ میں ہی واقع ہوسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخری سے آخری حربہ یعنی خروج سے ماقبل آخری حربہ یعنی خلیفۂ وقت کی برخاستگی کا راستہ اختیار کیا جائے گا۔

بیعت

بیعت خرید وفروخت کا ایک ایسا معاہدہ ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ اس معاہدہ میں بندہ اپنی جان اور اپنا مال (جو دراصل اللہ ہی کے عطا کردہ ہیں) اللہ کی سپردگی میں دے دیتا ہے اور اللہ اس ایثار وقربانی کے معاوضہ کے طور پر بندے کو جنت عطا کرتا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا طریقِ کار ہے کہ وہ قرآن وسنّت پر مبنی نظام خود براہِ راست نہیں بلکہ

خلافت کے ذریعہ چلاتا ہے۔اسی طرح بظاہر یہ بیعت یا معاہدہ بندے اوراس نظام کے مرکز یعنی خلیفۃ المسلمین کے مابین ہوتا ہے۔لیکن اصلاً اللہ اور بندے کے درمیان ہوتا ہے۔ یقیناً بہت سے لوگوں کے لئے یہ بات حیرت انگیز اور ایک خبر کے مانند ہو کہ بیعت رسول ﷺ اور امّتی کے درمیان بھی نہیں ہوتی۔ ہوتی ہے تو خلیفۂ وقت اور کسی امّتی کے درمیان۔مکی دورِ نبوت میں جب تک محض رسالت کارفرما تھی تو کسی سے بیعت نہیں ہوئی۔ کچھ احباب مسلمان ہوئے اور بس۔پہلی دفعہ بیعت ہوئی تو مکہ ہی میں یعنی منیٰ میں عقبہ کے مقام پرلیکن ہوئی اس وقت جب مدینہ سے ایک وفد رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوااوراس وفد کے ارکان نے نہ صرف آپ ﷺ کو مدینہ آکر ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی دعوت دی بلکہ اصل واقع سے پہلے ہی آپ ﷺ کواس ریاست کا سربراہ تسلیم کیا۔ بالفاظِ دیگر رسالت کے ساتھ خلافت کا عنصر جو تا ہنوز مخفی تھا' اجاگر ہوا۔اس بیعت کواسلامی تاریخ میں بیعتِ عقبۂ اولیٰ کہتے ہیں اوراس کے بعد بیعت کا یہ سلسلہ پہلے رسول ﷺ اور امّتیوں کے درمیان اور پھر خلفائے راشدینؓ اور امّتیوں کے مابین چلتا رہا۔ بیعت بہر حال بندے اور اللہ کے درمیان ہوتی ہے کیونکہ اللہ ہی کا حق اور اتھارٹی ہے کہ وہ معاوضے میں کسی کو جنت عطا کرے۔بیعتِ رضوان کے موقع پر صراحت سے فرمایا گیا:

''اے نبیؐ! جولوگ تم سے بیعت کررہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کررہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا'' (فتح:۱۰)

یہ معاہدہ اصل میں اسی وقت ہی کرلیا جاتا ہے جب کوئی بندہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔عورتوں کے لئے چونکہ جان و مال قربان کرنے کے مواقع کم ہوتے ہیں' ان سے ان امانتوں کے تحفظ کی بیعت لی جاتی ہے جوان کی تحویل میں ہوتی ہے۔قرآن میں آیا:

''اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اوراس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی' چوری نہ کریں گی' زنا نہ کریں گی' اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی' اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت

کرو۔ یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے'' (ممتحنہ:۱۲)

بیعت کی تجدید اس وقت بھی ہوتی رہی ہے جب مسلمانوں کو نظامِ خلافت بچانے کے لئے میدان میں اترنا پڑا۔ بیعتِ رضواں اسی سلسلے میں تھی۔ یہ بات البتہ مدِّنظر رہے کہ بیعت امّتی اور خلیفۂ وقت یا خلیفہ کے نمائندے کے مابین ہوتی ہے۔ دورِ رسالت میں نبی کائنات ﷺ نے حضرت عمرؓ کو عورتوں سے بیعت لینے کے لئے مامور کیا۔ چونکہ یہ معاہدہ نظامِ خلافت کی بقاء وترقی کا ضامن ہے لہٰذا اسلام میں بیعت کی بہت اہمیت ہے۔ نبی رحمت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''جو شخص مرجاوے اور کسی سے اس نے بیعت نہ کی ہو تو اس کی موت جاہلیت کی سی ہوگی'' (مسلم)

بیعت کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ضروری سمجھا گیا کہ دورِ نبوت کے اواخر میں اس کی تجدیدی تاکید کردی جائے۔ قرآن میں فرمایا گیا:

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں'' (توبہ:۱۱۱)

سوختہ بختی اسلام پر ایک دور ایسا بھی آیا کہ خلیفۂ وقت کی بیعت تو کیا' خلیفۂ راشد کا وجود ہی نہ رہا۔ یہی وہ تاریک دور ہے جس میں کچھ لوگوں نے جہالت کی موت سے بچنے کی آڑ میں خود بیعت لینا شروع کردی حتیٰ کہ بڑھتے بڑھتے ہمارے ہاں وہ نظام وجود میں آگیا جسے خانقاہی نظام یا ''پیری مریدی'' کا نام دیا گیا۔ پھر پیری مریدی کے موجدوں نے کمال ہوشیاری سے خلافت کے عنصر کو بھی خود سے چپکائے رکھا اور مختلف علاقوں کے لئے اپنے خلفاء مقرر کرنے شروع کردیئے۔ زیرِ آسماں یہ ایک ایسی بدعت تھی کہ جس نے پورے دینِ اسلام کی ہیئت بدل کر رکھ دی۔ اس لئے کہ جب بیعت کی ضرورت جعلی خلفاء نے پوری کردی تو آہستہ آہستہ خلیفہ و خلافت کی ضرورت انسانی ذہنوں سے محو ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کا نظامِ خلافت کو بھول جانا تاریخِ عالم کا سب سے بڑا سانحہ ہے جس کی ذمہ داری ان تمام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جو اختتامِ دورِ خلافت راشدہ سے لے کر آج تک اس دنیا میں آئے۔ ہم گناہگارانہ زندگی بسر کررہے ہیں اگر

بحالیٔ خلافت کی جدو جہد نہ کریں۔

ہمارے ایک تحریکی ساتھی، علامہ عنایت اللہ طورؔ صاب کی تحقیق کے مطابق خلیفۂ وقت کی عدم موجودگی میں کھینچ تان کر کسی کو بیعت لینے کا جواز نکل سکتا ہے تو کسی ایسی تنظیم کے سربراہ کو کہ جو قرآن وسنّت کے نظام کو لانے کے لئے تن من دھن کی بازی لگائے ہو۔ان کا کہنا یہ کہ ایسی بیعت اسی طرح عارضی ہوگی جس طرح کہ پانی کی عدم موجودگی میں تیمّم۔ جونہی خلیفۃ المسلمین متمکن ہوگا یہ عارضی بیعت ازخود ساقط ہو جائے گی۔دلیل علامہ صاحب کی یہ ہے کہ سورہ نساء اور سورہ مائدہ میں جہاں سمع و طاعت کے معاہدے کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے اس سے فوراً پہلے دونوں مقامات پر تیمّم کا ذکر آیا ہے۔

ایسی صورت میں گو آدمی جسمانی طور پر ناپاک ہی رہتا ہے لیکن اس کی مجبوری کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ اسے عارضی طور پر پاک قرار دیتا ہے۔

طاغوت کا انکار

خلافت کا نظامِ اطاعت متقاضی ہے کہ اللہ کے اقرار سے پہلے طاغوت کی اطاعت کا انکار کیا جائے۔جس طرح ایک جسم میں دو دل نہیں ہو سکتے اسی طرح اللہ کی اطاعت اور طاغوت کی اطاعت بیک وقت نہیں ہوسکتیں۔دونوں اطاعتوں کو بیک وقت نبھانے کی روش منافقت ہے اور منافق کا دوزخ میں مقام کافر سے بھی بدتر ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ ہر نبیؑ نے اللہ کی اطاعت کے ساتھ طاغوت کی اطاعت کی نفی کی ہے۔قرآن میں آیا:

”ہم نے ہر امّت میں ایک رسول بھیجا اس تعلیم کے ساتھ کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو“ (نحل:۳۶)

اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ طاغوت کی اطاعت کے انکار کی تاکید اس کلمے میں سمو دی گئی جو بچے کے پیدا ہوتے ہی اسے سنایا جاتا ہے یا کسی کے دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہی پڑھایا جاتا ہے۔پھر مؤذن پانچ بار دن میں اور ہر بار نماز میں کئی بار اس کا اعلان کرتا ہے کہ میں اللہ کے سوا ہر دوسرے معبود کا انکاری ہوں۔کسی ایسے آئین کو اور کسی ایسے قانون کو میں نہیں مانتا

کہ جو قرآن وسنّت کے خلاف ہو۔ کسی ایسی عدالت کو نہیں مانتا جو غیر اسلامی قوانین اپنائے اور کسی ایسے حکم کو نہیں مانتا جو خالق کے حکم کے خلاف ہو۔

حرفِ آخر

نظامِ اطاعت جو گزشتہ صفحات میں بیان ہوا' دنیا بھر میں عملاً ناپید ہے۔ ہمیں آج دینِ اسلام کی برکات حاصل نہیں ہو رہیں تو اس لئے کہ صدیاں بیت گئیں یہ دھرتی خلیفہ راشد سے محروم ہے۔ امیر المومنین کے عدم وجود نے پورے دین کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ نہ آج خلافت موجود ہے نہ اولی الامر اور نہ ہی امّت۔ ایسے میں امامِ کعبہ کی موت بھی جہالت کی موت ہے اگر وہ نظامِ خلافت کے لانے میں تن من کی بازی لگائے ہوئے نہ ہو۔ ایسے نمازی اور روزے دار سخت بھول بلکہ گمراہی کا شکار ہیں کہ جو نمازیں پڑھ کر اور روزے رکھ کر یہ سمجھ بیٹھے ہوں کہ جنت بس ان ہی کے لئے ہے۔ قرآن میں آیا:

''پھر کیا تم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ تمہیں جنت کا داخلہ بس یونہی مل جائے گا' حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے'' (بقرہ:۲۱۴)

قرآن شاہد' غزوۂ خندق کے موقع پر ایسا ہی کڑا وقت نبیٔ کائنات ﷺ اور صحابہؓ پر آیا:

''اس قت مومنین خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے'' (احزاب:۱۱)

رسول ﷺ اگر محض نماز پڑھ کر اور روزے رکھ کر اس دنیا سے چلے جاتے تو قیاس کیا جا سکتا تھا کہ محض نماز' روزے کی ادائیگی سے دین کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ قرآن وسنّت کو پڑھیں' بار بار پڑھیں کوئی نبیؑ دنیا میں ایسا نہیں آیا جس نے نماز روزے کے ساتھ ساتھ نظامِ باطل کو دینِ حق سے بدلنے کی خاطر تن من دھن کی بازی نہ لگائی ہو۔ شعبِ ابی طالب کی سختیاں' طائف کی سرگردانیاں اور بدر وحنین کی جانفشانیاں گواہ نبیٔ کائنات ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اسی نظام کو لانے کے لئے کہ جس کا نام ہے......... نظامِ خلافت۔

خلافت کا نظامِ مشاورت

تاریخ بتاتی ہے کہ شخصی اور وراثتی حکومتیں ادوارِ جہالت کا لازمی عنصر رہی ہیں۔ نمرود و فرعون وغیرہ کی حکومتیں اسی سلسلہ کی ہی کڑیاں تھیں۔ آج کی دنیا پر بھی نظر دوڑائیں تو اکیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ دور میں کئی ممالک میں یا تو شخصی اور وراثتی حکومتیں بالفعل قائم ہیں یا شاہی خاندانوں کو علامتی (Figure Head) سیادت حاصل ہے۔ عصرِ حاضر کے پارلیمانی نظام میں سربراہِ حکومت یعنی وزیراعظم کے علاوہ سربراہِ مملکت یعنی صدر کا وجود علامتی سیادت کی ہی ایک شکل ہے۔

عین اس وقت جب رسول ﷺ دنیا میں بطور آخری نبیؐ جلوہ افروز ہوئے' کرۂ ارض پر دو ایسی عظیم سلطنتیں تھیں جن پر خاندانی و وراثتی حکومتیں قائم تھیں۔ ایک ایسی بڑی سلطنت پر قیصر حکمران تھے تو دوسری پر کسریٰ۔ دونوں سلطنتوں کے آئین شخصی حکومت اور وراثتی بادشاہت کے لحاظ سے مشترک تھے۔ ہر جگہ شخصِ واحد لاکھوں کروڑوں انسانوں پر قابلیت وصلاحیت کی وجہ سے نہیں' وراثت کے ظالمانہ و بہیمانہ اصولوں کی بنا پر حکومت کرتا تھا۔ روزِ روشن کو یہ شخص اگر تاریک رات قرار دیتا تو پوری مملکت میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے سورج کی موجودگی کا احساس دلاتا۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ خواہ کتنے ہی احمقانہ ہوتے، قانون قرار پاتے۔ قرآن مجید کے بیان کردہ ابرہیمؑ و نمرود کے مکالمہ سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ شخص واحد کو کس قدر اختیارات حاصل تھے؟

ماضی قریب میں تمدنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ جمہوری حکومتیں تو وجود میں آئیں لیکن شخصی حکومتوں کا یہ افسوس ناک والمناک پہلو موجود رہا کہ انسان انسانوں کے لئے قانون سازی کرتا اور خودساختہ قوانین کے ذریعہ حکومت کرتا ہے۔ آج کی دنیا پر یہ خوف وشر' جس کی قرآنِ مجید نے نشاندہی کر رکھی ہے تو اس طرح کہ " خشکی وتری میں فساد برپا ہو گیا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے " (روم:41) کچھ انسانوں کا دوسرے انسانوں کیلئے قانون سازی کرنا اور ان پر

حکومت کرنے کی وجہ سے ہے۔ بالفاظِ دیگر کچھ انسانوں کا دوسرے ہم جنسوں پر حکم چلانا اور انہیں اپنی مرضی کا پابند کرنا اصلی فساد کی جڑ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب بھی کوئی انسان یا انسانوں کا گروہ قانون سازی کرتا ہے تو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے اور اپنے طبقہ و برادری کے حق میں کرتا ہے' باقی انسانوں کا جینا خواہ کتنا ہی دوبھر ہو جائے۔ پارلیمنٹ میں تاجروں کی اکثریت ہو تو قانون بناتے وقت تجارتی مفادات قانون سازوں کے مدنظر رہیں گے اور اگر کاشتکاروں' جاگیرداروں وغیرہ کی اکثریت ہوگی تو فیصلے ان کے حق میں ہوں گے۔ کہنے کو تو اسے جمہوری نظام کہا جاتا ہے لیکن جمہوریت کی آڑ میں درحقیقت چند عیار و بااثر انسان دوسرے انسانوں پر یوں قابض ہو جاتے ہیں جیسے کہ چوپائے چرواہے کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ کیا ہی صحیح ترجمانی کی علامہ اقبالؒ نے اس بظاہر جمہوری لیکن در پردہ جابرانہ نظام کی جب اس نے اسے ایک شیطانی چال قرار دیا۔ شیطان کی مجلس شوریٰ کا ایک رکن اندرونی راز فاش کرتا ہے تو اس طرح:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

انسان کے ان خودساختہ نظاموں کے سامنے تو شیطان نے یہ کہتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے کہ:

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

صورتِ حال کی اسی سنگینی کے پیش نظر اسلام نے جو پہلا وار کیا تو انسان کی اسی باغیانہ روش پر۔ اعلان کیا گیا "ان الحکم الا للہ "............ قانون سازی و حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ بظاہر تو انسانوں پر حکومت لیکن ایسے انسانوں کی جو " مجبورِ محض " ہوتے ہیں خود قانون سازی نہیں کر سکتے۔ آسمانی کتابوں کی شکل میں نازل کردہ اور پیغمبروںؑ کا جاری کردہ قانون خود حکمرانوں پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جس طرح کہ عوم الناس پر۔ دائرۂ اسلام میں کوئی داخل ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ یہ رہنما اصول تسلیم نہ کرے کہ " لا الہ الا اللہ " یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی دوسرا نہیں کہ جس کے قانون و حکم کی پیروی کی جائے۔ سرِ تسلیم خم ہوگا تو صرف اس وحدہ لاشریک ہستی کے لئے اور بس۔

قانون سازی وحکمرانی کا یہ اعزاز صرف اس لئے ہی اللہ تعالیٰ کو سزاوار نہیں کہ وہ غیر جانبدار، اوّل وآخر اور قادر وقدیر ہے بلکہ اس لئے بھی کہ انسان کا خالق وہی ہے۔ انسان فطرت کی فیکٹری کا پروڈکٹ ہے اور کسی بھی فیکٹری کے مالک کو ہی یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی فیکٹری میں تیار کئے جانے والے پروڈکٹ کو استعمال میں لانے کیلئے ہدایات دے۔ قرآن مجید میں اس اصول کو بیان کیا گیا تو اس طرح:

"پس (اے نبیؐ اور نبیؐ کے پیرو) یکسو ہو کر اپنا رخ دین پر جمادو' قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالی نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں" (روم: 30)

اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ بہر حال نہیں کہ وہ دنیا میں کہیں دفتر کھول کر قانون سازی وحکمرانی کرے۔ انسانوں ہی کے ذریعہ وہ اپنے قانون کے مطابق حکمرانی کرتا ہے۔ ادارۂ خلافت بلکہ نظامِ خلافت ایسے ہی طرزِ حکومت کا مظہر ہے۔ خلیفۃ المسلمین قوی ہوتا ہے تو اس قدر کہ پوری اسلامی دنیا کے ذرائع ووسائل اسی کے ہاتھ میں مجتمع ہوتے ہیں لیکن وہ بے بس ہوتا ہے تو اس قدر کہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ اور رسول ﷺ کا اولیں اختیار کردہ قانون خود خلیفہ پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جیسے کہ مملکت کے کسی عام شہری پر۔

پوری بات کا احاطہ کرنے کیلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وضاحت کردی جائے کہ نظامِ خلافت دو طرح کے قوانین پر استوار ورواں دواں ہوتا ہے۔ کچھ قوانین تو وہ ہیں کہ جو بنیادی' اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ احکاماتِ قرآن وسنّت انہیں قوانین پر مشتمل ہیں۔ کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین کو تا قیامت بدل سکے' خواہ وہ پیغمبرؐ ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے قوانین وہ ہیں جو وقتی اور عارضی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور حقیقت میں ان کی حیثیت ذیلی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ تو قرآن وسنّت نے طے کردیا کہ اولی الامر مسلمانوں میں سے ہوں لیکن یہ بات کہ وقت کے کسی موڑ پر کتنے گورنر ہوں وقتی اور عارض معاملہ ہے جو کسی بھی وقت طے کیا جاسکتا ہے اور طے شدہ کو بدلا بھی جاسکتا ہے۔ یہ ذیلی قوانین ہوتے ہی نہیں بلکہ قوانین کی

شرح ہوتے ہیں۔ وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قرآن وسنت ہی کی روشنی میں بنائے بھی جاتے ہیں اور بدلے بھی جاسکتے ہیں۔ ذیلی وتشریحی قانون سازی کا یہ کام اسلام ہرا یرے غیرے کے سپرد نہیں کرتا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر وہ اس مخصوص اور انتہائی ماہرانہ کام کیلئے ایک ایسا مخصوص ادارہ معرضِ وجود لاتا ہے جو اولی الامر کا ہی حصہ ہوتا ہے۔ ایسا ادارہ چونکہ مخصوص ترکیب وہیئت کا حامل ہوتا ہے لہذا ہم اسے پالیمنٹ، مقنّنہ وغیرہ کا نام نہیں دے سکتے۔ قرآن وسنّت میں اسے مخصوص نام............ "شوریٰ" سے موسوم کیا گیا ہے۔

قرآن وسنّت کی شکل میں اٹل اور ناقابل تغیر قوانین تو آج بھی من وعن موجود ہیں اور تا قیامت موجود رہیں گے کیونکہ ان کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔ البتہ یہ قوانین دھرے رہ جاتے ہیں جب تک کہ وہ ادارہ موجود نہ ہو کہ جو ان قوانین کو بروئے کار لائے۔ قرآن کریم اپنی اصطلاح میں اس بروئے کار لانے والے ادارے کو بھی مخصوص نام "اولی الامر" سے یاد کرتا ہے۔ نظامِ خلافت کی بقاء وارتقاء کیلئے اولی الامر کا مسلمانوں کے درمیان ہونا اتنا ہی اہم ہے کہ جتنا خود قرآن وسنّت کا ہونا۔ بالفاظِ دیگر قرآن وسنّت اور اولی الامر لازم وملزوم ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک موجود ہو، دوسرا موجود نہ ہو تو نظامِ خلافت معرضِ وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ بنا بریں اسلام نے اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کو اس طور نتھی کر دیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کے بغیر اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت ممکن ہی نہیں۔ فرمایا گیا:

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اللہ ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے"۔

یعنی اولی الامر کا مسلمانوں کے درمیان ہمہ وقت موجود ہونا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت کا ایک ہی راستہ ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کی جائے۔ پھر چونکہ اولی الامر میں خلیفہ یعنی مسلمانوں کا ایسا حکمران کہ جس کی سربراہی میں پوری اسلامی دنیا ہو، کی

مرکزی حیثیت ہوتی ہے۔ لہذا خلیفہ وقت کا ہمہ وقت مسلمانوں میں موجود رہنا لازمی ہے۔ یعنی اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے لئے ضروری ٹھہرا کہ اولی الامر کی اطاعت ہو اور اولی الامر کی اطاعت کے لئے لازم ٹھہرا کہ خلیفہ وقت کی اطاعت ہو۔ بنابریں قرآنِ مجید میں خلیفہ وقت کی اطاعت کو اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت متصور کیا گیا ہے۔ ایک جگہ پر آیا:

"اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس سے سرتابی نہ کرو" (انفال:20)

چند ہی سطور کے بعد فرمایا گیا:

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے" (انفال:24)

پہلی آیت (20) میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاع یعنی دو اطاعتوں کا ذکر ہے لیکن جب یہ فرمایا کہ "اس سے سرتابی نہ کرو تو ضمیر واحد (عنہ) استعمال کی۔ رسول ﷺ کی حیات میں تو ظاہر ہے "اس سے سرتابی نہ کرو" کا مطلب رسول ﷺ کے حکم کی سرتابی نہ کرو ہے لیکن مابعدِ رسول ﷺ جس کا حکم سنا جائے گا اور جس سے سرتابی ممنوع قرار پائی وہ خلیفہ ہی ہوگا۔ اسی طرح دوسری آیت (24) میں اللہ ورسول ﷺ کی پکار کیلئے بھی " دعا کم " یعنی صیغہ واحد کا استعمال ہوا۔ نبی ﷺ کی زندگی میں تو "اذاد عاکم " کا مطلب رسول ﷺ کا پکارنا ہی ہے لیکن مابعدِ رسول ﷺ ظاہر ہے خلیفۂ وقت ہی کی پکار پر لبیک کیا جائے گا۔

اوپر ہم نے ذکر کیا کہ خلیفۂ وقت بے بس ہوتا ہے تو اتنا کہ خود قانون سازی نہیں کر سکتا بلکہ خود خلیفہ پر قانون اسی طرح لاگو ہوتا ہے' جیسے کہ ایک عام شہری پر۔ وہ قوی ہوتا ہے تو اس قدر کہ پوری اسلامی دنیا اس کے اشارۂ ابرو پر تن من دھن وارنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہوتی ہے۔ یہ عظیم مقام خلیفۂ وقت کو حاصل ہوتا ہے تو دو کڑی شرائط کے ساتھ' ایک طرف وہ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کا پابند ہوتا ہے تو دوسری طرف شوریٰ سے مشورہ لینا اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔

بصورتِ دیگر وہ اپنے حکم کی اطاعت کا حق اسی طرح کھو بیٹھتا ہے جس طرح کہ شوریٰ اگر مشورہ نہ دے تو وہ اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔قرآن میں آیا:

"امرھم شوری بینھم "(شوریٰ:38)اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشورے کی اہمیت اور اس قدر' آخر کیوں؟

مشورہ کیوں؟

خلافت ایک شورائی نظام ہے۔مشورے کے بغیر نظامِ خلافت کو چلانا ممنوع ہے۔ خلیفہ وقت کے لئے لازم ہے کہ کاروبارِ خلافت امّت کے مشورہ سے چلائے۔اسلام میں اس مشورہ لینے کی اتنی اہمیت ہے کہ خود پیغمبر ﷺ کو بھی مشورہ لینے کا پابند کیا گیا ہے۔قرآن میں ہے:

"شاورھم فی الامر" (آل عمران:159) اور کام میں انہیں شریک مشورہ کرو۔

یاد رہے کوئی بھی نبیؑ اپنے وقت کا خلیفہ بھی ہوتا ہے۔رسول ﷺ کو یہ مشورہ لینے کا پابند کیا گیا تو کارِ خلافت میں' کارِ رسالت میں نہیں۔کارِ رسالت تو اللہ و رسول ﷺ کا معاملہ ہے' کسی تیسرے کی مداخلت و مشاورت کا کوئی سوال نہیں۔

خلیفہ کو مشورہ کا پابند کیا گیا تو اَن گنت مصلحتوں کے پیش نظر۔ایک تو اس لئے کہ منصبِ خلافت پر متمکن ہونے والا شخص کہیں مطلق العنان نہ ہونے پائے۔اسے بالاتر قانون کا پابند بھی کیا گیا تو اسی لئے' حتیٰ کہ قانون کو من وعن اس پر لاگو کیا گیا اسی مصلحت کو مدِنظر رکھتے ہوئے۔نظامِ خلافت میں ویسے بھی خلیفہ کے مطلق العنان ہونے کے امکانات اس قدر کم ہوتے ہیں کہ نہ ہونے کے برابر اس لئے کہ امت میں سے خلیفہ بنایا ہی اسے جاتا ہے کہ جو تقویٰ کے معراج پر ہو' خلیفہ کو اتنا خدا خوف ہوتا ہے کہ امت کے فیصلے وہ تنہا کرنے کا خطرہ مول لیتا ہی نہیں۔ اللہ کے ہاں تو اسے جوبدہ ہونا ہی ہے' اسلام میں پوری امتِ مسلمہ کو حزبِ مخالف کا درجہ حاصل ہے۔کوئی بھی شہری خلیفہٗ وقت کا دامن پکڑ کر اس سے حساب لے سکتا ہے۔

خلیفہ کو مشورے کی ضرورت پڑتی ہے تو اس لئے بھی کہ زیادہ دماغوں کا اجتماع کسی بھی

فیصلے کو قرآن وسنّت کے عین مطابق کرنے کا یہی مؤثر طریقہ ہے۔ قرآن وسنّت کے عین مطابق فیصلہ ہو جائے تو نہ صرف یہی مطلوب ہے بلکہ وہ فیصلہ ہی بہترین ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی بھی فیصلے کو بہترین ہی ہونا چاہیے۔ مشورہ کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ مشورے سے کوئی قدم اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ عوام الناس کو اعتماد میں لے کر کوئی قدم اٹھاتا ہے۔ اس طرح سے فیصلہ عوامی ہو جاتا ہے نہ کہ فردِ واحد کا۔ اس میں کیا شک کہ راعی و رعایا کے مابین اعتماد کی فضا قائم رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

قرآنِ کریم میں مشورے سے کام کرنے کا حکم جس انداز سے بیان ہوا ہے وہ خود بدرجۂ اتم مشورے کی اہمیت وضرورت کی غمازی کرتا ہے۔ قرآنِ مجید میں صلوٰۃ وزکوٰۃ کا ذکر اکثر و بیشتر اکٹھا آیا ہے۔ تاہم مشاورت کا حکم دیا گیا تو نماز اور انفاق فی سبیل اللہ کے معروف جوڑ کو توڑ کر مشاورت کے حکم کو ان دونوں کے درمیان رکھا گیا۔ ملاحظہ ہو قرآن' اُخروی زندگی میں انعامات پانے والوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

''جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' اپنے معاملات باہمی مشورے سے کرتے ہیں اور ہم نے جو رزق انہیں دیا ہے۔ اس میں سے خرچ کرتے ہیں''۔ (شوریٰ: 38)

متعدد احادیث بھی مشورہ کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ ایک موقعہ پر رسول ﷺ نے فرمایا:

"جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین لوگ ہوں' تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے معاملات آپس میں مشورہ سے طے ہوتے ہوں تو زمین کے اوپر تمہارے لئے رہنا بہتر ہے۔ اور جب تمہارے حکمران بدترین لوگ ہوں' تمہارے مالدار بخیل ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کی خوشنودی کیلئے ہوں تو زمین کے اندر دفن ہو جانا تمہارے زندہ رہنے سے بہتر ہے"۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

"جو شخص کسی کام کا اردہ کرے اور باہم مشورہ کرنے کے بعد اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے صحیح اور مفید صورت کی طرف ہدایت مل جاتی ہے"۔ (بیہقی' شعب الایمان)

اور تو اور خود رسول ﷺ کا عمل مشورہ لینے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ آپ ﷺ نے تین مشہور غزوات یعنی غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور غزوۂ احزاب کے موقعوں پر ایسے امور میں کہ جو تاریخ کا جورخ متعین کرنے والے تھے صحابہؓ سے مشورہ لیا۔ مسئلہ افک میں بھی آپ نے مشورہ کیا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب تمام صحابہؓ دل گرفتہ تھے آپ ﷺ نے اپنی بیوی حضرت ام سلمہؓ جو اس معرکہ میں آپ ﷺ کو ساتھ تھیں، سے مشورہ کیا۔ مشورہ آپ ﷺ نے بہر حال انہیں امور میں لیا جو کارِ خلافت کے دائرہ میں آتے ہیں۔ غزوات و معاہدات ایسے ہی معاملات ہیں۔

مشورہ لیا جائے تو کیسے؟

جب قرآن و سنّت کی رو سے مشورہ لینا اس قدر اہم ٹھہرا کہ بنا بریں نظامِ خلافت کو شورائی نظام سے موسوم کیا جاتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلیفۂ وقت مشورہ لے تو کس سے اور کیسے؟ آج کی دنیا میں مروّجہ ہر نظام خواہ اشتراکیت ہو، جمہوریت یا کوئی اور تین اجزائے ترکیبی انتظامیہ، مقنّنہ اور عدلیہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ یوں تو نظامِ خلافت بھی انہی تین اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح اسلام میں قانون سازی و حکمرانی کا تصور دوسرے تمام نظاموں سے یکسر مختلف ہے اسی طرح نظامِ خلافت کے یہ تینوں شعبے بھی منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ بقول شاعر

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ﷺ ہاشمی

اس وقت مقنّنہ ہی ہمارے موضوع کے متعلق ہے لہذا ہم اس پر قدرے تفصیلاً روشنی ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا مشورہ لینا خلیفہ کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ عام روٹین کے کاموں میں تو اسے مشورہ کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی لیکن اہم امور بالخصوص پالیسی امور میں لازم ہے کہ مشورہ لیا جائے۔ خلیفۂ وقت نے سب سے پہلے اللہ و رسول ﷺ سے مشورہ لینا ہوتا ہے۔ اللہ و رسول ﷺ سے مشورے لینے کا مطلب قرآن و سنّت سے رہنمائی لینا (To Consult) ہے۔ قرآن و سنّت کی اس کام کے بارے میں کہ جس کے متعلق مشورہ درکار ہو اگر کوئی واضح نص مل جائے تو پھر خلیفۂ وقت کو مزید کسی مشورے کی ضرورت نہیں، اللہ کے بھروسے

پر وہ منصوص راستہ اختیار کرنے کا پابند ہے اور بس۔ بصورتِ دیگر یعنی اگر قرآن وسنّت سے کوئی واضح نص نہ ملے تو پھر قرآن وسنّت ہی کے ایک دوسرے ضابطے کے مطابق ایک ایسے ادارے سے مشورہ لینا ہوتا ہے کہ جس کا نام ہی "شوریٰ" ہے۔ شوریٰ ایک قسم کی پارلیمنٹ ہی ہوتی ہے البتہ اس استشناء کے ساتھ کہ مخصوص کام کے لئے ہی اور مخصوص کام کیلئے ہی اور مخصوص ہیئت و ترکیب کی حامل۔ اصل میں تو خلیفۂ وقت نے مشورہ امت سے لینا ہوتا ہے لیکن امت کے قائم مقام شوریٰ ہوتی ہے اس بنا پر کہ اس کا ہر رکن کسی نہ کسی عوامی حلقہ سے قرآنی معیارِ اہلیت کی بنا پر منتخب ہو کر آیا ہوتا ہے۔ شوریٰ کا صل کام بلکہ ایک ہی کام، جیسا کہ اس کے نام سے عیاں ہے بس خلیفۂ وقت کو قرآن وسنّت سے استنباط کر کے مطلوبہ امور میں مشورہ دینا ہوتا ہے۔ خلیفۂ وقت کا نصب وعزل بھی چونکہ مشورہ سے عمل میں آتا ہے لہذا یہ بھی شوریٰ کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ مشورہ دینے کا یہ عمل ذیلی قانون سازی میں آتا ہے اور یہی وہ ذیلی قانون سازی ہے جس کی نظامِ خلافت اجازت دیتا ہے۔

اکثر و بیشتر یہ ذیلی قانون سازی عارضی اور وقتی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور تبدیلی حالات کے ساتھ اس قانون سازی میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ اسی ذیلی قانون سازی کا اصطلاحی نام "اجتہاد" ہے۔ سیکولر نظاموں میں دو ایوانوں کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ ایک ایوان اگر عوام الناس کی پوری نمائندگی کرنے سے قاصر رہے تو دوسرا ایوان اس کمی کو پورا کر دے۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں کی پارلیمنٹ دو ایوانوں یعنی قومی اسمبلی اور سینیٹ پر مشتمل ہے۔ قومی اسمبلی میں منتخبہ ارکان کی تعداد چونکہ آبادی کے تناسب سے ہوتی ہے لہذا مختلف صوبوں سے منتخبہ ارکان کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔ جو صوبہ بڑا ہوتا ہے اس سے آمدہ ارکان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت اس صوبہ کے کہ جس کی آبادی کم ہو۔ ایسے میں امکان ہوتا ہے کہ قانون سازی اس صوبے کے حق میں ہو جائے کہ جس کے ارکان کی تعداد زیادہ ہے۔ اسی کمی کو پورا کرنے کیلئے سینیٹ کا دوسرا ایوان ہے جس میں ہر صوبے سے آمدہ ارکان کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ کوئی تحریک قانونی حیثیت اختیار نہیں کر پاتی جب تک دونوں ایوان اسے پاس نہ کر دیں اور بالآخر صدر مملکت کی

منظوری حاصل نہ ہو جائے۔ نظامِ خلافت میں ذیلی قانون سازی چونکہ قرآن وسنّت کی پابندی ہے لہذا اس کا امکان ہی نہیں کہ کسی صوبۂ علاقے یا طبقے وغیرہ کی حق تلفی ہو۔ لہذا یہ دو ایوانوں کی عیاشی نظامِ خلافت کے احاطہ میں نہیں آتی۔

جس طرح نظامِ خلافت دو ایوانوں کی عیاشی سے مبرا ہے اسی طرح وہ اس بے اعتدالی و عیاشی کو بھی گوارا نہیں کرتا کہ ایک ہی وقت مسلمانوں کے دو سربراہان ہوں .... ایک سربراہِ حکومت اور دوسرا سربراہِ مملکت۔ خلیفۃ المسلمین سربراہِ مملکت بھی ہوتا ہے تو سربراہِ حکومت بھی.......... یاد رہے خلیفۂ وقت کی اطاعت' اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت سے مشروط ہی سہی' قائم مقام ہوتی ہے۔ بنابریں یہ اطاعت سمع و اطاعت کی حامل ہوتی ہے محض فرمانبرداری نہیں۔ یعنی ایک تو بے چون و چرا ہوتی ہے اور دوسرے فیصلہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورت کو صدق دل سے قبول کرنا ہوتا ہے رنجش کے شائبہ تک کا کوئی سوال نہیں۔ یہ ایسی اطاعت ایک ہی سربراہ کی ممکن ہے' دو ہوتے ہی فیصلوں میں نہ وہ یکسوئی رہتی ہے اور نہ وہ مضبوطی جو نظامِ خلافت کا طرۂ امتیاز ہے۔ خلیفۂ وقت اسی طرح وقت کا امام ہوتا ہے جیسے کہ نماز میں پیشِ امام بلکہ امامِ نماز کی امامت' امامتِ صغریٰ ہے تو خلیفۂ وقت کی امامت' امامتِ کبریٰ۔ نظامِ صلوٰۃ میں دو امام نہیں ہو سکتے تو نظامِ خلافت میں دو سربراہوں کا کیا سوال؟

شوریٰ کا مشورہ (شوریٰ سے کی گئی ذیلی قانون سازی یا اجتہاد) اکثر و بیشتر متفقہ ہی ہوتا ہے اس لئے کہ قرآن وسنّت کی روشنی میں کیا گیا ہوتا ہے لیکن اس کا امکان بہرحال ہوتا ہے کہ کچھ ارکان کا اجتہاد دوسروں سے مختلف ہو۔ ایسے میں خلیفۂ وقت نے اکثر و بیشتر اکثریتی ارکان کے مشورہ کو ہی بروئے کار لانا ہوتا ہے لیکن یہ ضروری بھی نہیں۔ نظامِ خلافت میں نہ اکثریت فی نفسہ دلیلِ صحت و صواب ہے اور نہ اقلیت دلیلِ خطا۔ خلیفۂ وقت کی اپنی رائے اگر اقلیت کے مشورہ کے مطابق ہو تو وہ اقلیت کے اجتہاد کو ہی بروئے کار لائے گا خواہ یہ اقلیت ایک رکنِ شوریٰ پر ہی بلکہ تنہا خلیفہ کی رائے پر ہی مشتمل ہو۔ خلیفہ کے لئے اصل فیصلہ کن یہ امر ہوتا ہے کہ وہ کس مشورے کو قرآن وسنّت کے قریب سمجھتا ہے؟

نظامِ خلافت میں اصل پیروی تو ازلی و ابدی دستور یعنی قرآن و سنّت کی ہے لہٰذا اگر کوئی مشورہ اقلیت کی طرف سے ہی سہی جب قرآن و سنّت کے قریب تر محسوس ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ خلیفۂ وقت ایسے مشورے سے صرفِ نظر کرے۔ خود نبی مکرم ﷺ نے ایک صحابی کے مشورہ پر بھی عمل کیا جیسا کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر، چند اصحابؓ کے مشورے پر بھی چلے جیسے کہ غزوۂ احد کے موقع پر اور تمام موجود صحابہؓ کے مشورہ کو رد بھی کر دیا' جیسے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر۔ مانعینِ زکوٰۃ اور لشکرِ اسامہ بن زید کے متعلق اکثر و بیشتر صحابہ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ تک کی رائے خلیفہ اول کی رائے سے مختلف تھی لیکن وقت نے بالآخر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلوں کی تصدیق کر دی کہ وہ قرآن و سنّت کے عین مطابق تھے۔

اس بحث سے نتیجہ نکلا تو یہی کہ خلیفۂ وقت مشورہ لینے کا پابند ہے مشورے پر من و عن عمل کرنے کا پابند نہیں۔ خلیفۂ وقت کو اسی مشورے کو بروئے کار لانا چاہیے کہ جس پر اس کا دل ٹھک جائے کہ وہ قرآن و سنّت کے قریب تر ہے نتائج کو پھر اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ خود نبی ﷺ کائنات کو جب مشورہ لینے کا پابند کیا گیا تو وہیں یہ بھی صراحت کر دی گئی کہ گومگو کی پالیسی اختیار نہیں کرنی۔ اس مشورے پر فی الفور عمل پیرا ہو جانا چاہیے جس پر دل گواہی دے کہ وہ فیصلہ رضائے الٰہی کے مطابق ہے۔

نظامِ خلافت میں یہ خلیفۂ وقت کا اکثریت کے فیصلے کے مطابق عمل نہ کرنا بلکہ بعض اوقات پوری شوریٰ کے فیصلے کو ٹھکرا دینا بظاہر بڑا پر خطر محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے اس نظامِ احتساب کے تناظر میں دیکھا جائے کہ جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے تو خلیفۂ وقت کا اس قدر مقتدر ہو جانا کہ وہ پوری شوریٰ کے فیصلے کو ٹھکرا دے پر خطر نہیں بلکہ عین سعادت ہے۔ نظامِ خلافت اس قدر متوازن و متناسب نظام ہے کہ خلیفۃ المسلمین ہمہ وقت دو دھاری تلوار کی زد میں ہوتا ہے۔ ایک طرف تو ایک دن اسے اپنے رب کے حضور پیش ہو کر اپنے ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی ہے۔ دوسری طرف وہ شوریٰ کی عین گرفت میں ہوتا ہے۔ شوریٰ اگر محسوس کرے کہ خلیفۂ وقت کسی معاملہ میں خودسری سے کام لیتا ہے تو وہ اسے یک قلم معزول کر سکتی ہے۔ شوریٰ کو کلی اختیار حاصل

ہے کہ وہ ضروری سمجھے تو میرِ کارواں کو گردِ کارواں بنا دے۔

خلیفۂ وقت ویسے ہی اس کردار کا حامل ہوتا ہے کہ اس کا خودسر یا مطلق النان ہو جانا بعید القیاس ہے۔ خلیفۃ المسلمین نہ صرف اولی الامر کا حصہ ہوتا ہے بلکہ اولی الامر میں اس کی حیثیت کلِ سرسبد کی ہوتی ہے۔ اولی الامر کا ہر رکن خواہ اس کا تعلق انتظامیہ سے ہو' شوریٰ سے یا عدلیہ سے قرآنی معیارِ اہلیت کی چھلنی سے گزر کر آیا ہوتا ہے۔ آیا ہی نہیں ہوتا بلکہ لایا ہوتا ہے اس لئے کہ اسلام میں کوئی خود کو نہ کسی عہدے کے لئے پیش کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنے حق میں کنویسنگ کر سکتا ہے۔ پھر خلیفۂ وقت تو ان تمام میں بلکہ پوری امت میں اصلح ہوتا ہے۔ تاریخ معدودے چند افراد ہی ایسے پیدا کر سکی ہے جو خلفائے راشدین کے کردار و معیار پر پورے اترتے ہوں۔

اولی الامر کے معیارِ اہلیت کی اہمیت کے پیش نظر خود قرآن میں اسے طے کر دیا گیا ہے۔ قرآنی معیارِ اہلیت پانچ اوصاف (Qualities) ایمان (نور:55)' تقویٰ (حجرات: 13)' صلاح (نور:55)' علم اور جسم (بقرہ:247) پر مشتمل ہے۔ شوریٰ بھی چونکہ اولی الامر کا حصہ ہوتی ہے بنابریں اس قرآنی معیارِ اہلیت پر پورا اترنے پر ہی کسی کو رکنِ شوریٰ بننے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ قرآنی معیارِ اہلیت میں سے اس وقت صفتِ جسم ہمارے موضوع کے متعلق ہے۔ لازم ہے کہ رکن شوریٰ جسمانی و ذہنی لحاظ سے توانا و صحت مند ہو۔ معذور' کمزور' بوڑھا' عورت وغیرہ اسی طرح رکنِ شوریٰ بننے کے نااہل ہوتے ہیں جس طرح کہ خلیفۃ المسلمین بننے کے۔

شاید کوئی معترض ہو کہ جب عورت رکنِ شوریٰ نہیں بن سکتی تو اس طرح سے آدھی انسانیت کو کیا حقِ مشورہ سے محروم نہیں کر دیا گیا؟ اسلام دینِ فطرت ہے اور وہ عورت کو مشورے سے محروم کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ ایسے معاملے میں کہ جو عورت کے متعلق بھی ہو عورت سے مشورہ کرنا لازم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا:

"اگر فریقین (مرد و عورت) باہمی رضامندی اور مشورے سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں"۔ (بقرہ:233)

یعنی نظامِ خلافت عورت سے مشورہ لینے کو تو لازم قرار دیتا ہے لیکن ایوانِ شوریٰ میں

مردوں کے برابر بٹھا کر نہیں بلکہ کسی بھی ایسے طریقے سے کہ جہاں مردوں کے شانہ بشانہ بیٹھنے کی نوبت نہ آئے۔ اوپر ذکر ہوا کہ خود رسول ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنی زوجہ محترمہؓ سے مشورہ کیا۔ البتہ بیوی سے مشورہ کسی مجلس میں نہیں، عین خیمہ کے اندر کیا گیا۔ یہ بات زور سے کہنے کی ہے کہ اسلام میں مخلوط محفل یا مخلوط شوریٰ کا کوئی تصور نہیں۔ عورت کو مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کو فرض قرار نہیں دیا گیا۔ البتہ اجازت دی گئی تو اس کڑی شرط کے ساتھ کہ اگر امام سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو وہ اشارے کنائے سے تو مطلع کر سکتی ہے، زبان سے نہیں۔ ظاہر ہے جب مسجد میں اور عین حالتِ نماز میں جب کہ للّٰہیت کا ماحول اپنے عروج پر ہوتا ہے عورت کو زبان کھولنے کی اجازت نہیں تو کسی شوریٰ میں مردوں کے شانہ بشانہ بیٹھ کر وہ آواز کا جادو کیسے جگا سکتی ہے؟ ایسا اگر وہ کرتی ہے یا اس نظام کا حصہ بنتی ہے کہ جو ایسا کرواتا ہے تو ظاہر ہے وہ خود بھی باغیانہ روش اختیار کرتی ہے اور ایسا نظام بھی باغیانہ روش پر مبنی ہوتا ہے۔

ایسے امور میں کہ جو عورتوں کے متعلق ہوں، جب عورتوں سے مشورہ لینا ضروری ٹھہرا تو اس کی ایک صورت جسے ترجیح کا درجہ حاصل ہے یہی ہے کہ ہر رکنِ شوریٰ آگے مشورہ دینے سے پہلے اپنے ہاں اپنی اہلیہ، ماں، بہن، بیٹی سے لازماً مشورہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خواتین کی اپنی شوریٰ علیحدہ ہو جو اپنے اجتماعی مشورے کو خلیفہ تک پہنچائے اور یہی وہ صورت ہے جو اسلام میں دوسری شوریٰ کی گنجائش پیدا کرتا ہے۔ البتہ جیسے کہ عورت کا گھر میں نماز پڑھنا مسجد کی نماز پر ترجیح رکھتا ہے اسی طرح عورت سے اس کی سلطنت یعنی گھر میں جہاں پر کہ وہ نارمل ہوتی ہے، مشورہ لینا ترجیحی حیثیت کا حامل ہے۔

ایک بہت بڑی ذمہ داری کہ جس کیلئے مشورہ کی اشد ضرورت ہوتی ہے، انعقادِ خلافت کا مسئلہ ہے۔ شورائی نظام میں خلیفہ کا انتخاب مشورہ ہی سے ہونا لازمی ہے، کسی خاندانی وطبقاتی بنیاد پر نہیں۔ البتہ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مشاورت کا یہ کام شوریٰ ہی کے فرائض میں شامل ہے۔ امّت کے ہر ہر فرد سے مشورہ نہیں لیا جائے گا۔ شریعت کی رو سے منصبِ خلافت تین دن سے زائد خالی نہیں رکھا جا سکتا۔ تین دن کے اندر اندر یہ کام تبھی سرانجام پا سکتا ہے کہ محض یہ کام شوریٰ کی

صوابدید پر ہو۔ اگر امت کے ہر فرد سے مشورہ (بیعت یا ووٹ) لینے کا راستہ اختیار کیا جائے تو تین دن کیا تین مہینوں میں بھی یہ کام مکمل نہیں ہو پاتا۔ شوریٰ جب یہ کام سرانجام دیتی ہے تو اصل میں پوری امت کی نمائندگی ہو جاتی ہے کیونکہ شوریٰ پوری امت ہی کی نمائندہ ہوتی ہے۔ شوریٰ البتہ اپنے میں سے بھی کسی رکن کو خلیفہ چن سکتی ہے اور ارکان انتظامیہ (گورنر، وزراء وغیرہ) اور عدلیہ سے بھی۔ بعدہ صرف اس اسامی کو پُر کیا جائے گا کہ جہاں کا رکن، خلیفہ چنا گیا ہو۔ یہ بھی ہے کہ اسلام میں منصبِ خلافت تین صورتوں میں خالی ہوتا ہے، ورنہ ایک دفعہ کا چنا ہوا خلیفہ تاحیات قائم و دائم رہے گا، یہ تین، پانچ سال وغیرہ کے بعد انتخابات کا تصوّر اسلامی نہیں۔ خلیفہ کے ہٹائے جانے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ خود معذرت کر لے، دوسرے موت کی صورت میں اور تیسرے قرآنی معیارِ اہلیت میں فرق آنے سے (انعقاد خلافت کے سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لئے ہماری دوسری تصنیف "آئین، نظام بدلیں" سے استفادہ کریں)۔

حرفِ آخر

نظامِ خلافت ایک شورائی نظام ہے۔ جس طرح خلیفہ خود مشاورت سے ہی منصبِ خلافت پر نصب کیا جاتا ہے اسی طرح لازم ہے بلکہ اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے کہ امورِ مملکت شوریٰ کے مشورے سے سرانجام دے۔ یعنی ایک طرف خلیفۂ وقت احکاماتِ قرآن وسنّت کا پابند ہے تو دوسری طرف قرآن وسنّت کے واضح حکم کی عدم موجودگی میں یا کسی شرعی نص کی تشریح و وضاحت کیلئے وہ شوریٰ سے مشورہ کا پابند ہے۔ روزمرہ کے امور کو کہ جن کے بارے میں پہلے سے ہدایات موجود ہوں وہ معمول کے مطابق سرانجام دے سکتا ہے لیکن پالیسی اور غیر معمولی نوعیت کے معاملات میں وہ کلیۃً شوریٰ سے مشورے لینے کا پابند ہے۔

انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسے امور جو زیادہ افراد کے متعلق ہوں، متعلقہ افراد کے مشورہ سے طے ہوں۔ اس فطری تقاضے کو پورا کرتا ہے تو وہ نظام کہ جس کا نام ہے..........نظامِ خلافت۔

خلافت کا نظامِ عفّت وعصمت

اسلام میں عفّت وعصمت اور شرم وحیا کی اہمیت کو مخبرِ صادق ﷺ نے چند الفاظ میں بیان فرمایا تو اس طرح کہ ''الحیاء لا یاتی الا بخیر'' (بخاری ومسلم) یعنی حیاء انسانی اوصاف میں سے وہ صفت ہے کہ جو صرف بھلائی لاتی ہے۔ عصمت کے مقام وقدر کا اس سے بھی اندازہ لگائیں کہ کسی آدمی کے پاس اگر دولت کے انبار ہوں اور اس پر کوئی وقت ایسا آجائے کہ اس کی جان صرف ایک ہی صورت میں بچ سکتی ہو کہ وہ اپنی تمام دولت لٹا دے تو جان بچانے کی خاطر وہ تمام دولت داؤ پر لگانے میں غنیمت سمجھے گا۔ البتہ اس کے سامنے اگر کوئی شر پسند اس کی عصمت پامال کرنے کی جسارت کرے تو پھر وہ جیتے جی ایسا نہیں ہونے دے گا اور جان تک کی بازی لگا دے گا۔

تاریخِ انسانی میں عورت ان موضوعات میں سے ایک اہم موضوع رہی ہے کہ جنہیں زیادہ سے زیادہ زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ عفّت وعصمت کی قدر وقیمت کسی بھی تمدن میں بہر حال براہِ راست اس سے معلق رہی ہے کہ عورت کو وہاں پر کیا مقام دیا گیا ہے۔ عورت کا مقام جتنا کسی معاشرے میں ارفع واعلیٰ ہوا عفّت وعصمت کی اتنی ہی زیادہ قدر کی گئی اور اس کے برعکس جتنی بیچاری عورت بے قدر ہوئی اتنی ہی بے قدر عفّت وعصمت ٹھہری۔ قدیم ادوار میں جب اکثر معاشروں میں جنگل کا قانون کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس رواں دواں تھا تو جتنے مظالم عورت پر ہوئے شاید ہی کسی اور معاشرے میں ہوئے ہوں۔ مرد کو بھی دونوں انتہاؤں یعنی غلام اور آقا بنایا گیا لیکن کبھی بھی اسے اتنی گراوٹ اور ذلت سے واسطہ نہ پڑا جتنا کہ عورت کو۔ انسانی سطح پر وقار ومرتبہ کی نشانی ایک ہی ہے کہ کسی کو جائیداد میں حصہ ملے یا بالفاظ دیگر وہ مشکل گھڑی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی استعداد رکھتا ہو۔ عورت کو جائیداد میں حصہ تو کیا خود اثاثوں کا حصہ بنائے رکھا گیا۔ زیرِ آسمان اسے بیچا گیا' خریدا گیا' بانٹا گیا' منتقل کیا گیا حتیٰ کہ ذریعۂ آمدن اور کاروبار کا

وسیلہ بنایا گیا۔ متضاد مقام دیا گیا تو اس قدر کہ کبھی اسے مذہبی عہدوں پر متمکن کیا گیا تو کبھی اسے اس قدر گھٹیا اور ناپاک گردانا گیا کہ اسے مذہبی رسومات ادا کرنے کے قابل نہ سمجھا گیا۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ 99 فیصد معاشروں میں لڑکی کی پیدائش کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا گیا۔ مقامِ افسوس تو یہ کہ لڑکی کی پیدائش نہ چاہنے والوں میں خود عورت ہی پیش پیش رہی ہے۔ نوبت بایں رسید کہ بیٹیوں کو اسی دھرتی پر زندہ درگور بھی کیا جاتا رہا۔ بطورِ عورت مظلومیت' مرعوبیت اور محرومیت تو بہر صورت اس کا مقدر رہا ہی لیکن رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس سلوک کا محض تصور کرتے ہوئے کہ جو اسے بطورِ بیوہ ملا۔ اکثر لادینی معاشروں میں اس کا دوبارہ شادی کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ بیوہ ہوتے ہوئے صاف ستھرا رہنے' اچھے کپڑے پہننے اور عمدگی کی زندگی گزارنے کو بے غیرتی و بے حیائی تصور کیا گیا۔ دل خون کے آنسو روتا ہے اور قلم یہ لکھنے سے لڑکھڑاتا ہے کہ ایسے معاشرے بھی اس دنیا میں رہے ہیں کہ جنہوں نے بیوہ کے حقِ زیست ہی کو چھین لیا اور چیختی چلاتی بیوہ کو مرنے والے خاوند کے ساتھ ہی شعلوں کی نذر کر دیا۔

جور و جفا اور مظالم کی یہ داستان تو بہت طویل لیکن جو زیادتی آج کے دورِ جدید میں اس پر ڈھائی گئی' گزشتہ تمام مظالم پر بازی لے گئی۔ اسے سب سے بڑا دھچکا لگا تو اس وقت جب اسے اس کی طاقت یعنی اولاد اور اس کی مملکت یعنی گھر سے محروم کر دیا گیا۔ بطورِ آئینہ مغربی دنیا آج ہمارے سامنے ہے۔ نعرۂ مساواتِ مرد وزن کی آڑ میں بستیاں ویران' گھر اداس' دن سرگرداں' راتیں بیزار غرضیکہ ہو کا عالم۔ بظاہر بڑی چمک دمک لیکن آنکھوں کو خیرہ کرنے والے معاشرے اندر سے یوں جیسے زندہ درگور۔ کسی گھر چلے جائیں' اولاد معدوم' کتوں اور بلیوں نے ڈیرے آ جمائے۔ لان میں کتے' صحن میں کتے' کچن میں کتے' بیڈ روم بلکہ عین بیڈ میں کتے۔ صبح اٹھتے ہی جیسے مشین کے پرزے میاں اپنے کام پر سدھار جاتا ہے تو بیوی اپنی راہ لیتی ہے۔ گھر کی چابی ہر ایک کے پاس' جو پہلے آ گیا' کھول لے۔ دوسرے کا انتظار بھی فضول شاید رات کہیں باہر ہی گزار دے۔ جو آ گیا دکان سے لائے ہوئے برگر کھائے اور سو رہے۔

شادیانے بھی بجتے ہیں' شہنایاں بھی کھنکتی ہیں' ڈانس بھی ہوتا ہے لیکن یہ سب کچھ ہوتا ہے تو کلبوں بلکہ نائٹ کلبوں میں گھروں میں اداسی وسوگ کے سوا کچھ نہیں۔ مغربی عورت خود دھوکے میں پڑگئی۔ آزادی حاصل کرنے کی دوڑ میں نکلی نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ گھر گیا' اولاد گئی' بسا اوقات خاوند بھی آنکھیں چرا گیا۔ صدارتی ایوان تک یوں جیسے چکلے۔ خون جوان ہوتا ہے تو شمع محفل بنی رہتی ہے' ادھیڑ عمر ہوتے ہی لپکتی ہے سسکیوں اور آہوں کی طرف' دلاسا دے تو کون؟ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کی عبث دوڑ میں اپنا مقام کھویا تو عفّت و عصمت کا کیا سوال' مغربی عورت سرِ بازار لٹ گئی۔ نظامِ خلافت اسی انمول نسوانی جوہر .... عفّت و عصمت کی آخری حدود تک حفاظت کرتا ہے' آئیں' دیکھیں کیسے؟

اسلام کا نظامِ عفّت و عصمت

کوئی نظام' کوئی منظّم معاشرہ معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا جب تک کہ خود انسانی زندگی کو منظّم و منضبط نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے عفّت و عصمت کا دارومدار کسی ایک صنف کے کردار پر نہیں۔ بنا بریں اسلام مرد و زن دونوں کی معاشرت کو اس طور منظّم کرتا ہے کہ کوئی بھی غیر جانبدار شخص اس کی خوبیوں کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک بات شروع میں نوٹ کر لیں کہ نظم جہاں بھی ہوگا ظاہر ہے کچھ پابندیوں کے نتیجہ کے طور پر ہی ہوگا۔ پابندیوں کو کوئی احمق اگر رکاوٹیں تصور کر بیٹھے تو اس کی حماقت ورنہ سڑک کے کنارے لگائے گئے اشارات ظاہر ہے کسی کا سفر کھوٹا کرنے کے لئے نہیں' مسافروں کے بحفاظت منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لئے ہوتے ہیں۔ نظامِ خلافت تحفظِ عفّت و عصمت کے بارے میں جو تدابیر اختیار کرتا ہے' ہم انہیں تین عنوانات یعنی عمومی اصلاحی اپروچ' انسدادی و احتیاطی تدابیر اور قانونی و انضباطی تدابیر کے تحت زیرِ بحث لاتے ہیں۔

عمومی اصلاحی اپروچ

انسانی زندگی' انفرادی سطح کی ہو یا اجتماعی تبھی منظّم و منضبط ہو سکتی ہے جب کسی قانون و

ضابطہ کی پابندی کی جائے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسا قانون اور کس کا دیا ہوا؟ اسلام سب سے پہلے اسی سوال کا جواب دیتا ہے۔ پھر وہ اس سوال کا بھی ساتھ ہی جواب ڈھونڈتا ہے کہ اگر کوئی قانون کی پابندی نہ کرے تو اس کا احتساب کیسے ہو؟ ہم ان سوالات کے جوابات قدرے تفصیل سے زیرِ بحث لاتے ہیں اس لئے کہ ان دونوں سوالات کے جوابات پر انسان کی اصلاحی واخلاقی زندگی کا دارومدار ہے۔ درج ذیل تین میں سے کوئی ایک اتھارٹی قانون سازی کی سزاوار قرار دی جاسکتی ہے' اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ ان میں کون اس معیار پر پوری اترتی ہے کہ جو قانون ساز کے لئے ازبس ضروری ہے۔

☆ ہر انسان اپنا خود قانون ساز ہو۔

☆ اس کے لئے کوئی دوسرا فرد یا ادارہ قانون سازی کرے۔

☆ ماورائے انسان کوئی بالائی طاقت قانون ساز ہو۔

تین ہی وہ صفات یا شرائط ہیں کہ جو فیصلہ کن ہیں کہ مندرجہ بالا تین میں سے کسے قانون سازی سزاوار ہے۔ پہلی صفت جو ایک قانون ساز میں ہونی چاہئے یہ ہے کہ اس کا علم مکمل' بھرپور اور بے نقص ہو۔ وہ پوری کائنات کی نہ صرف ترکیب و ترتیب سے واقف ہو بلکہ یہ بھی جانتا ہو کہ یہ کائنات کیسے اور کس لئے وجود میں لائی گئی اور اس کا انجام کیا ہے؟ پھر قانون ساز کو مکمل علم ہو کہ کائنات میں ذرائع و وسائل کتنے ہیں اور ان کی نوعیت کیا ہے؟ ایسا نہ ہو کہ وہ مثال کے طور پر آج خاندانی منصوبہ بندی کے لئے کوئی ضابطہ بنائے اور کل کو مزید وسائل کی دریافت اس ضابطے کا مذاق اڑائے۔ پھر قانون ساز انسانی فطرت سے کماحقہ آگاہ ہو۔ انسان کے دل کے کسی کونے میں جنم لینے والی خواہش تک سے واقف ہو۔ وہ ''عالم الغیب والشہادۃ'' ہو' اسے تجربات کر کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہو۔ رات کی تاریکی میں قانون شکنی کرنے والا ہر آنکھ سے چھپ جائے تو چھپ جائے' قانون ساز سے بہرحال نہ چھپ سکے۔ کروڑوں انسان مل کر بھی اگر کوئی گناہ یا نیکی کا کام کریں تو قانون ساز جانتا ہو کہ کس کا اس نیکی یا گناہ میں کتنا حصہ ہے؟

دوسری بڑی شرط جو سزاوارِ قانون سازی کے لئے ضروری ہے یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہو۔ وہ قدیر ہو' عزیز ہو' قوی ہو۔ زندگی وموت اس کے ہاتھ میں ہو۔ وہ کسی کو فائدہ دینا چاہے تو کوئی روکنے والا نہ ہو اور کسی کی گرفت کرنا چاہے تو کوئی چھڑا نہ سکے۔ وہ اول تا آخر بلکہ یہ اول و آخر بھی قانون ساز کے لئے نہیں' اس کی نسبت سے ہو کہ جس کے لیے قانون بنایا جانا مطلوب ہو۔ وہ ہر لمحہ' ہر گھڑی' ہر جگہ موجود ہو۔ کوئی پتہ ہلے تو اس کے اذن سے' کوئی پرندہ محوِ پرواز ہو تو اس کی مرضی سے اور کوئی مچھلی تیرے تو اس کے حکم وایماء پر۔ لیل ونہار' شمس وقمر' شجر وحجر پر قابض ہو تو وہی اور موسموں کا تغیر' حادثات کا واقع ہونا' بجلی کی چمک' بادل کی کڑک' دھوپ چھاؤں وغیرہ نہ صرف اس کی سکیم کی تکمیل میں ہوں بلکہ ان تمام کا مصور ومحرک ہو تو وہی۔ ''کن فیکون'' صرف اسی کا اعزاز ہو۔

ایک اور صفت جس کا قانون ساز کیلئے حامل ہونا ضروری ہے یہ ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو۔ اس کا تعلق کسی خاندان' کنبے' طبقے' معاشرے' قوم' ملک وغیرہ سے نہ ہو۔ اس کا کوئی رشتے دار حتیٰ کہ بیوی بچے بھی نہ ہوں۔ اس کا کوئی پیشہ نہ ہو۔ اخلاقی بنیاد کے بغیر اس کی ہمدردیاں کسی کے ساتھ نہ ہوں حتیٰ کہ جو اسے قانون ساز تسلیم نہ کرے وہ اس کے لئے بھی غیر جانبدارانہ رویہ رکھے۔ سب اس کے محتاج ہوں وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ وہ مخلوق نہ ہو بلکہ ہر شے کا خالق ہو۔ غیر جانبدار ہو تو اس حد تک کہ اسے غصہ اور جذبات تک مغلوب نہ کر سکیں۔

غور فرمائیں تو مذکورہ بالا تین ممکنہ قانون سازوں میں سے آخری .... ماورائے انسان کوئی بالائی طاقت یعنی اللہ تعالیٰ ان شرائط پر کما حقہ' پورا اترتا ہے۔ لہٰذا اسے ہی قانون سازی سزاوار ہے۔ یہی آیا قرآن میں' فرمایا ''ان الحکم الا اللہ'' فرد صرف اسی بنیاد پر ہی قانون سازی کا اہل نہیں کہ وہ نہ علیم ہے' نہ قدیر اور نہ غیر جانبدار بلکہ اس بنیاد پر بھی کہ اگر ہر آدمی اپنا قانون خود بنائے تو دنیا میں اتنے قانون ساز ہوں گے جتنے کہ انسان۔ ایسے میں کوئی معاشرہ تمدن وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ کوئی دوسرا فرد یا ادارہ بھی نہ صرف اس لئے ہی قانون سازی کے لئے نا اہل قرار

پاتا ہے کہ وہ مندرجہ بالا تینوں شرائط پوری نہیں کرتا بلکہ اس لئے بھی کہ تاریخ انسانی شاہد دنیا میں ہر خرابی کی جڑ انسان کا انسانوں کے لئے قانون ساز ہونا ہے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ قانون سازی صرف اللہ تعالیٰ کو ہی سزاوار ہے تو یہ مسئلہ بھی خود بخود حل ہو گیا کہ محتسب کون ہو؟ قانون کی پیروی کرنے والے کو انعام دے گا تو اللہ تعالیٰ اور قانون شکن کو گرفت میں لائے گا تو اللہ تعالیٰ۔ اپنی احتسابی سکیم کی تکمیل کے لئے اس نے انسانی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک دور اس دنیا کی زندگی پر محیط ہے اور موت پر ختم ہو جاتا ہے جبکہ دوسرا دور آخرت کا ہے۔ پہلا دور دار العمل کا ہے تو دوسرا دور حساب و کتاب اور جزا و سزا کا۔ اس دنیا میں آنے والے ہر فرد' عورت ہو یا مرد' کے اعمال کو بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ ریکارڈ کیا جا رہا ہے اور اس ریکارڈ کی بنیاد پر آخرت میں متعلقہ فرد جزا یا سزا اور جنت یا دوزخ میں داخلے کا مستحق قرار پائے گا۔ بالفاظِ دیگر مرنے پر کوئی بھی شخص محض زندگی کے ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل ہوتا ہے' معدوم نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں اسے کرنا ہے تو آخرت میں اپنے کئے کا انجام وصول کرنا ہے۔

اسلام کا یہ عمومی اصلاحی پروگرام ہر مسلمان کے دل میں ہمہ وقت کی ایک پولیس چوکی قائم کر دیتا ہے۔ خود احتسابی کا یہ عمل جو قرآن کی زبان میں تقویٰ کہلاتا ہے ہر ہر قدم پر پہلے واقع ہوتا ہے تو الٰہی احتسابی کا عمل آخر میں۔ یعنی جواب دہی کا احساس یا تقویٰ وہ معیار ہے جس سے اللہ تعالیٰ کسی شخص کے افضل یا ابتر ہونے کو ماپتا ہے۔ یہ محکم بنیاد فراہم کر کے اسلام مزید آگے بڑھتا ہے۔

انسدادی و احتیاطی تدابیر

معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر نظامِ خلافت نے کم ہی کسی اور دائرہ کار کے متعلق اتنی ہدایات دی ہوں کہ جتنی تحفظِ عفّت و عصمت کے بارے میں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا عورت جتنی کسی معاشرے میں بے قدر ہو گی' عفّت و عصمت کی اتنی ہی زیادہ بربادی ہو گی۔ اسلام نے اسی مرکزی

نقطے کو مدِ نظر رکھ کر مقامِ عورت کو بالا و مستحکم کیا ہے تو اس حد تک کہ وہ جو کبھی خود اثاثوں میں منقسم ہوتی تھی، وراثت میں حصہ دار بن گئی۔ تاریخِ انسانی میں تبدیلی کا یہ وہ نقطۂ عروج ہے کہ جس نے انسانی آبادی کے نصف کو یک قلم تحت الثریٰ سے اٹھا کر اوجِ ثریا پر بٹھا دیا۔ قرآن میں آیا:

''مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے۔ مال تھوڑا ہو یا بہت، حصہ ہے مقرر'' (النساء:7)۔

چند الفاظ پر مشتمل اس ضابطہ الٰہی نے عورت کی کایا ہی پلٹ دی۔ اس لئے ہی نہیں کہ وہ باحیثیت ہوگئی اس لئے بھی نہیں کہ کسی حادثے یا بے سہارا ہونے کی صورت میں وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوگئی بلکہ اس لئے کہ اس کی گراں بہا متاع.....عزت و آبرو اور عفّت و عصمت......کا مؤثر و مؤکد بندوبست ہوگیا۔ اسلام نے اس ایک ضابطہ سے تحفظِ عفّت و عصمت کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل کر دیا۔ اس لئے کہ وراثت کا عمل وقوع پذیر ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ تشخص و تخصیصِ خون نہ ہو۔ یعنی دو اور دو چار کی طرح معلوم نہ ہو کہ کون کس مرد کی اولاد ہے؟ کس قدر ممنون ہو انسان نظامِ خلافت کا' ایک تیر سے دو شکار کئے' شکار بھی بہت بڑے بڑے۔ ایک تو عورت کو باحیثیت کر کے اس کے مقام کو ارفع و اعلیٰ کر دیا اور دوسرے تحفظِ عفّت و عصمت کا فول پروف انتظام کر دیا۔ تخصیصِ خون کا بندوبست کیا تو اس قدر بھرپور کہ انسانی معاشروں سے ہٹ کر عدت کو متعارف کرایا۔ جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے اسے چار ماہ اور دس دن تک دوبارہ شادی کرنے سے روک دیا اور عورت طلاق یا خلع کی بنا پر خاوند سے علیحدہ ہوئی ہو' اس کی مدتِ عدت تین مرتبہ ایامِ ماہواری آنے تک ہے۔ پھر یہ بھی تاکید کی گئی کہ دورانِ عدت عورت پر عیاں ہو جائے کہ وہ حاملہ ہے تو پھر وہ اس حمل یا غیر حمل ہونے کو چھپائے نہیں اس لئے کہ اس صورت میں عدت کی مدت وضعِ حمل تک ہے۔ ظاہر ہے اس بھرپور انتظام کا مقصد صرف تشخصِ خون ہے یعنی یہ بات بالکل متعین اور طے ہو کہ بچہ کس مرد سے ہے۔ تشخصِ خون کی پھر اس قدر فکر ہے اسلام کو کہ

زمانۂ عدت میں شارۃً کوئی بات ہو جائے تو علیحدہ بات ورنہ متعلقہ عورت کو مزید پیغامِ شادی دینے یا کسی مرد کا اس سے شادی کرنے کے اظہار کو ممنوع قرار دیا۔یعنی نظامِ خلافت کو یہ بھی گوارا نہیں کہ بچہ پیٹ میں ہو اور عورت میں دو محبتوں والا خون گردش کرے۔ بالفاظِ دیگر دینِ حق کو محض تشخصِ خون کی ہی فکر نہیں دورانِ عدت جذبات وخیالات کے یکسور کھنے کی فکر بھی دامن گیر ہے۔

قرآن میں آیا:

''زمانۂ عدت میں خواہ تم ان بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کردو خواہ دل میں چھپائے رکھو، دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تو تمہارے دلوں میں آئے گا ہی مگر دیکھو! خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا۔ اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقے سے کرو اور عقدِ نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک مت کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ لہٰذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بردبار ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگذر فرماتا ہے'' (بقرہ:235)۔

نیز ولی عہدی بھی اسلام میں ممنوع ہے تو اسی لئے کہ دو اطاعتوں کا اختلاط نظامِ خلافت کو گوارا نہیں۔

پھر تحفظِ عفّت وعصمت کے لئے یہ تشخصِ خون کی محکم بنیاد فراہم کرنے پر ہی اکتفاء نہ کیا گیا۔ مزید احتیاطی تدابیر کا ایک بھرپور پیکج دیا۔ اس بارے میں پہلا قدم اٹھایا تو یہ کہ نکاح کرنے کی ترغیب وتاکید کی تو مجرد رہنے کو ناپسند فرمایا۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور فطری تقاضوں سے صرفِ نظر نہیں کرتا۔ بنابریں اس نے شادی کرنے کو فرض تو قرار نہ دیا کیونکہ کئی ایک جسمانی و حادثاتی وجوہات کی بنا پر ایک فرد نکاح کرنے سے قاصر رہ سکتا ہے۔ البتہ نکاح کی تاکید کی تو اس قدر کہ اسے محض ایک معاہدہ ہی قرار نہ دیا نیکی اور عبادت قرار دے دیا۔ رہبانیت کو بھی اسلام حرام قرار دیتا ہے تو اسی مصلحت کے پیشِ نظر کہ اسلام شادی شدہ ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔

پھر اسلام نے صرف نکاح کی ترغیب وتاکید پر ہی اکتفاء نہ کیا انسانی فطرت بالخصوص

مرد کی فطرت کی رعایت کرتے ہوئے چند شرائط کے ساتھ دو تین بلکہ چار تک بیک وقت شادیاں کرنے کی اجازت دے دی۔ عورت کو بہر حال ایسا کرنے کی اجازت نہ دی ایک تو استحکامِ خاندان اور نظمِ خانہ کی خاطر اور دوسرے اسی بنیادی مصلحت یعنی تشخصِ خون کی خاطر۔ مرد کی سہولت کے پیشِ نظر عورت کو تو مرد کی اجازت کے بغیر نفلی روزے رکھنے کی ممانعت کر دی۔ شادی کرنے کی مزید تاکید کیلئے نبی رحمت ﷺ سے بھی بہت سی احادیث بیان ہوئی ہیں یہاں ہم صرف دو کا ذکر کرتے ہیں۔

''بندہ نے جب شادی کر لی تو اس نے نصف دین مکمل کر لیا''۔ (مشکوٰۃ)

ایک اور موقع پر فرمایا:

''میں شادی کرتا ہوں۔ جو میرے طریقہ سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں'' (بخاریؒ)

اگر مجبوری کی بنا پر کوئی فرد شادی نہ کر پائے تو اسے بھی تحفظِ عفّت و عصمت کی بہر حال تاکید کی۔ قرآن میں آیا:

''اور جن کو بیاہ کا مقدور نہ ہو وہ پاکدامنی کو اختیار کیے رہیں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے'' (نور:33)۔

شادی کے لئے مرد یا عورت کا انتخاب کرتے ہوئے بھی عفّت و عصمت کو مدِ نظر رکھا گیا۔ فرمایا:

''زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک۔ اور یہ (زانی یا زانیہ سے شادی کرنا) حرام ہے مومنوں کے لئے'' (نور:3)۔

پھر شرم و حیا اور عفّت و عصمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام نے نہ صرف محرم اور غیر محرم جیسی اصطلاحات وضع کیں بلکہ کچھ قریبی رشتوں کا باہمی شادی کرنا حرام قرار دے دیا۔ فرمایا:

''تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں، اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری

بیویوں کی مائیں اورتمہاری بیویوں کی لڑکیاں جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہو....ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلقِ زن وشوہ رہ چکا ہو۔ ورنہ اگر (صرف نکاح ہوا ہواور) تعلقِ زن وشونہ ہوا ہوتو (انہیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے...اورتمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جوتمہاری صلب سے ہوں اور یہ بھی تم پرحرام کیا گیا ہے کہ ایک وقت میں دو بہنوں کو جمع کرومگر جو پہلے ہوگیا سو ہوگیا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (النساء:23)۔

کس قدر پاس ہے اسلام کو حیاء وشرم کا کہ جو رشتے کسی طور محترم قرار پاتے ہیں ان کو شادی کے بندھن میں بندھنے سے منع فرمایا۔ ایک جگہ پر تو اظہار ہی کر دیا کہ ایسی شادیاں اس لئے ممنوع ہیں کہ حیا اجازت نہیں دیتی ۔فرمایا:

''اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے ہرگز نکاح نہ کرومگر جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔ درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے' ناپسندیدہ ہے اور براچلن ہے'' (نساء:22)۔

پھر ایسی طبیعت کہ جو مسلمانوں سے باہر شادی کی خواہاں ہو' اہل کتاب کی پاکدامن عورتوں سے شادی کی اجازت دے کر اس کے لیے بھی گنجائش پیدا کر دی البتہ اس شرط کے ساتھ کہ عفّت کا مقصد بہرحال ملحوظ رہے۔ فرمایا:

''اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہلِ ایمان کے گروہ سے ہوں یا اہل کتاب سے بشرطیکہ ان کے مہر دے دو اور ان سے عفّت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ چھپی دوستی'' (مائدہ:5)۔

اگر کسی وجہ سے مرد یا عورت ایک دوسرے کو راس نہ آئیں تو بذریعہ طلاق علیحدہ ہونے اور ہر ایک کو مزید دوبارہ' سہ بارہ وغیرہ شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ بیوہ کو دوبارہ شادی کی اجازت دینا ایک انقلابی قدم ہی نہیں رسمِ دنیا کے بھی خلاف ہے لیکن تحفظِ عفّت و

عصمت کی خاطر ایسا کرنا چونکہ لازمی تھا لہٰذا دین فطرت نے گوارا نہ کیا کہ ایک نفس کو غیر فطری ماحول میں رہنے دیا جائے۔

پاکدامنی نسوانی راز ہے۔ بنابریں عورت سے بیعت لی گئی تو بالخصوص تحفظِ عفّت و عصمت کے حوالے سے‘ فرمایا:

''اے نبی (ﷺ)! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اوراس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی‘ چوری نہ کریں گی‘ بدکاری نہ کریں گی‘ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی‘ اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امرِ معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں اللہ سے مغفرت کرو‘ یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے'' (ممتحنہ: 12)۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی بندی مریمؑ کی تعریف کی تو ان الفاظ کے ساتھ کہ ''وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی'' (انبیاء: 91) فلاح پانے والے اپنے بندوں کا ذکر کیا تو فرمایا ''یقیناً فلاح پائی ایمان لانے والوں نے جو ...اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں'' (مومنون: 5)۔

پردہ

عفّت و عصمت کو سب سے بڑا خطرہ مرد و زن کے آزادانہ میل جول سے ہوتا ہے۔ اس خطرے کا مداوا بلکہ مؤثر اور بھرپور مداوا نظامِ خلافت نے ایک اور انوکھا ادارہ متعارف کرا کے کیا۔ اس ادارے کو اسلام کی اصطلاح میں ''حجاب'' کہا جاتا ہے۔ ستر بھی حجاب ہی کا ایک پہلو ہے۔ عام طور پر پردے سے برقع‘ چادر وغیرہ اوڑھنے کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ ہم نے اس کے لئے جو ایک ادارے کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس لئے کہ پردہ صرف برقع پہننے کا نام نہیں بلکہ ان تمام مبادیات و تفصیلات پر مشتمل ہے کہ جن سے عورت کو مرد کی آوارہ نگاہوں اور اپروچ سے مستور کیا جائے۔ پردے کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اصل میں خانگی زندگی کی تمام مسرتیں اور رونقیں اسی سے وابستہ ہیں۔ صرف افراد کے بننے

اور بگڑنے کا دارومدار ہی پردے پر مبنی نہیں، تہذیبوں اور حکومتوں کے ضعف و استحکام کا دارومدار بھی پردے پر ہے۔ پردے کا مفہوم نبی رحمت ﷺ کے اس ارشاد سے کما حقہ واضح ہوتا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ جس کھیت میں کسی مویشی کا داخلہ نامنظور ہو اس کھیت کے پاس بھی مویشی کو نہ جانے دیا جائے۔ قرآن و سنّت میں پردے کے بارے میں اس قدر تفصیلات آئی ہیں کہ ان کو اس چھوٹے سے رسالے میں بیان کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ چند کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

اسلام کی یہ منفرد اپروچ کہ وہ پردے کی ہدایات کا آغاز عین نبی کائنات ﷺ کے گھر سے اور عین ازواجِ مطہرات سے کرتا ہے۔ اس کا بہرحال یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایسی ہدایات محض ازواجِ مطہرات کے لئے ہیں، ان کا نفاذ عام مومنات پر بھی ہوتا ہے۔ پردے کے متعلق جو پہلی ہدایات آئیں تو یہ:

''نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے۔ بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیعت نبی ﷺ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے'' (احزاب:33)۔

آگے چل کر اسی سورۃ کی آیات 53-55 میں فرمایا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نبی کے گھر میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کے وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔ مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔ تمہاری یہ حرکتیں نبی کو تکلیف دیتی ہیں مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے۔ اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔ نبی ﷺ کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ ازواجِ نبی ﷺ کے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کے باپ ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے ان کے میل جول کی عورتیں اور ان کے مملوک گھروں میں

آئیں۔(اے عورتو!) تمہیں اللہ کی نافرمانی سے بچنا چاہئے۔اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے‘‘۔

ان آیات میں دوسری پابندیوں کے علاوہ ایک عظیم انقلابی تبدیلی لائی گئی۔عورت کے دائرہ کار کو گھر کی چاردیواری کے اندر مقرر کر کے انسانی نصف آبادی کو ان بے جواز کلفتوں‘ کاوشوں اور دقتوں سے بچالیا گیا کہ جن سے اسے ادوارِ جہالت میں دوچار ہونا پڑا ہے۔مرد کی ذمہ داری کے عام کاموں کی تو کیا بات تاریخ میں آتا ہے کہ ہل چلاتے وقت ایک طرف گدھی کو اور دوسری طرف عورت کو جوتا جاتا رہا ہے۔اور کچھ نہیں تو دوگنا کاروبار یعنی گھر کے کاموں کا بوجھ اور بیرونِ گھر کے کاموں کا بھی بوجھ اسے اٹھانا پڑا ہے۔سنجیدگی سے تجزیہ کیا جائے تو گھر پر کام اپنی نوعیت و وسعت کے حساب سے اس قدر بوجھل‘ مشکل اور صبر آزما ہے کہ عورت کو شاباش دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ گھر کی صفائی‘ کپڑوں کا دھونا‘ پھر استری کرنا‘ کھانا پکانا اور پھر لگانا‘ بچوں کی پرورش‘ سینا پرونا‘ بیماروں کی تیمارداری‘ مہمانوں کی آؤ بھگت‘ خاوند کی دیکھ بھال‘ سب سے آخر میں سونا اور سب سے پہلے جاگنا‘ پھر ایک دو دن نہیں عمر بھر ایسا کرنا اگر کسی مرد کو الاٹ کر دیا جائے تو یقینی طور پر ایک دو دن میں ہی ہتھیار ڈال دے۔غیر جانبدار قانون ساز.....خالق و مالک کائنات ......عورت کے کام کی نوعیت و وسعت اور اہمیت سے کما حقہ آگاہ تھا لہٰذا اس نے عورت کی سرگرمیوں کا میدان گھر کو قرار دے کر برسہا برس سے کھویا ہوا حق اسے دلوادیا۔آج جدید جہالت پر مبنی جن معاشروں نے عورت کو گھریلو کاموں کے علاوہ بیرونِ گھر کاموں میں پھنسا دیا ہے‘ عورت پر ہی زیادتی نہیں کی‘ خود مردوں کو بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔عفّت و عصمت کا کباڑا ہونا ہی تھا‘ گھر ویران کر بیٹھے۔

دینِ فطرت عورت کے دائرہ کار کو گھر کی چاردیواری کے اندر محدود کرتا ہے لیکن اسے بوقتِ ضرورت گھر سے نکلنے سے نہیں روکتا۔البتہ یہ نکلنے کی اجازت بوقتِ ضرورت یعنی انتہائی اہم کام جسے ٹالا نہ جاسکے کے لئے ہے۔شوقیہ گھومنے پھرنے‘ سیر سپاٹے اور پکنک وغیرہ کے لئے نہیں ہے۔گھر سے نکلنے کی اجازت ہے تو ساتھ ہی جلباب یعنی لمبی چادر اوڑھنے اور گھونگھٹ چہرے پر لٹکانے کی پابندی کا ذکر ہے۔فرمایا گیا:

''اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کردو کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگھٹ لٹکالیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تا کہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفورو رحیم ہے''۔(احزاب:59)۔

یہ پردے کا حکم تو گھر سے باہر نکلتے وقت کا ہے لیکن گھر میں ہوتے ہوئے بھی پردے کا حکم ہے گو کہ اس کی نوعیت قدرے مختلف ہے۔ قرآن میں آیا:

''اے نبی! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر' باپ' شوہروں کے باپ' اپنے بیٹے' شوہروں کے بیٹے' بھائی' بھائیوں کے بیٹے' بہنوں کے بیٹے' اپنے میل جول کی عورتیں' اپنے مملوک' وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی نہ چلا کریں کہ اپنی زینت کہ جو انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا علم لوگوں کو ہو جائے''(نور:31)۔

نظامِ خلافت نے پھر عمومی ماحول کو پاکیزہ رکھنے کے لئے ان تمام رخنوں کو بند کیا جو آزادانہ میل جول' بدنگاہی اور اخلاقی مفاسد کو راہ دیتے ہیں۔ اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں بغیر اجازت اور مکینوں پر سلام کئے بغیر داخلے کی ممانعت کر دی۔ اجازت نہ ملنے کی صورت میں واپس ہونے کو کہا۔ محرم رشتہ داروں کی عدم موجودگی میں غیر محرم مرد و زن کو تنہا بیٹھنے سے منع فرمایا۔ جائز نہیں رکھا کہ کسی مرد کا ہاتھ کسی غیر محرم عورت کے جسم کو لگے حتیٰ کہ عورتوں سے بیعت کا طریقہ بھی مختلف کر دیا۔ جمعہ کی نماز کو فرض کیا تو عورتوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا۔ مخلوط محفلوں اور مخلوط کاروبار کی ممانعت کر دی۔ لمبا سفر کرنا ہو تو محرم کے ساتھ ورنہ نہیں۔

مومن عورتوں کو ایسی عورتوں سے بھی پردہ کرنے کی تاکید کی کہ جو بد اطوار ہوں۔ گھر سے باہر میک اپ کرنے' خوشبو لگانے بھڑکیلے کپڑے پہننے' جھانجر وغیرہ جیسے زیورات پہننے غرضیکہ

ہر قسم کی نمود و نمائش اور اظہارِ زینت سے منع فرمایا۔ اندھوں اور مخنثوں تک سے پردہ کرنے کی تاکید کی۔ حد تو یہ کہ بیوی کو غیر عورت کی حالت خاوند سے بیان کرنے اور خاوند کو اپنی بیوی کے راز دوسروں پر ظاہر کرنے سے منع فرمایا۔ گانے بجانے، تصویر بنوانے کا کوئی سوال نہیں۔ مختصراً اسلام پاکیزگی و پاکدامنی کے مطالبہ سے پہلے ماحول کو پاکیزہ و پارسا بناتا ہے۔

قانونی وانضباطی تدابیر

رب کائنات سمیع و بصیر اور قوی و عزیز ہی نہیں علیم و حکیم بھی ہے۔ اسے گوارا نہیں کہ روحانی و اصلاحی اور انسدادی تدابیر اختیار کئے بغیر چھوٹتے ہی لوگوں کو ٹکٹکیوں سے باندھنا شروع کر دے۔ نظامِ خلافت کسی بھی معاملے میں قانونی کاروائی کرتا ہے تو آخری چارۂ کار کے طور پر۔ عفّت و عصمت کے بارے میں بھی یہی راستہ اختیار کیا گیا۔ مندرجہ بالا درجنوں اخلاقی و انسدادی تدابیر کے علی الرغم بھی اگر کوئی عفّت و عصمت کو برباد کرے یا بربادی کا ذریعہ بنے تو اس کی پھر آہنی ہاتھ سے گرفت کی ہے۔ فحاشی پھیلانے والوں پر سب سے پہلے ہاتھ ڈالا۔ فرمایا:

''جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں فحش پھیلے وہ دنیا و آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں'' (نور:19)۔

اس آیۂ مبارکہ کی زد میں وہ تمام لوگ جو بدکاری کے اڈے قائم کرتے، فحش لٹریچر چھاپتے، کلبوں اور ہوٹلوں کو مخلوط رقص اور مخلوط تفریحات کے لئے استعمال کرتے، جذبات ابھارنے والے اشعار، گانے، تصویریں، کھیل تماشے منعقد کرتے غرضیکہ کسی طور پر عمومی ماحول کو پراگندہ کرتے ہیں، آتے ہیں۔ اسلامی قانون ایسے تمام افعال کو مستلزم سزا اور قابلِ دست درازی پولیس قرار دیتا ہے۔

عمومی ماحول کو پراگندہ کرنے میں سب سے زیادہ عمل دخل آشنائیوں کے قصے بیان کرنے اور تہمت تراشی کی روش اختیار کرنے کا ہوتا ہے۔ نظامِ خلافت یوں مزے لے لے کر تہمت تراشی کرنے والوں کے لئے تقریباً ویسی ہی سزا مقرر کرتا ہے جیسی کہ خود بدکاری کی۔ قرآن میں آیا:

''اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسی

کوڑے مارواوران کی شہادت کبھی قبول نہ کرواوروہ ہی فاسق ہیں‘‘ (نور:4)۔

ان تمام اخلاقی وانسدادی تدابیر کو ملیامیٹ کرتے ہوئے جو بدکاری کا مرتکب ہوتو نظامِ خلافت اس گلے سڑے پھل کوتوڑ پھینکتا ہےاوروہ بھی اس طور کہ دوسرے پھل خوداس گلے سڑے پھل سے نفرت کریں۔غیرشادی شدہ بدکاروں کی سزایہ ہے:

’’زانیہ عورت اورزانی مرد دونوں میں سے ہرایک کوسوکوڑے مارو۔اوران پرترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کودامنگیر نہ ہواگرتم اللہ تعالیٰ اورروزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہواوران کوسزادیتے وقت اہلِ ایمان کاایک گروہ موجودرہے(تاکہ عبرت حاصل ہو)‘‘ (نور:2)۔

شادی شدہ مردوزن کوسنگسارکرنے یعنی پتھر مارمارکر مارنے کاحکم دیا۔یہ سزاہردوسری سزاسے بڑھ کرہے۔ایک تو شایداس لئے کہ انہوں نے شادی شدہ ہونے کے علی الرغم حدوداللہ کو توڑااوردوسرےاس لئے کہ ان بدکاروں نے مل کرایک دوسرے شخص کوکہ جس کی وہ بیوی تھی اس خطرے میں مبتلاکردیاکہ وہ کسی ایسے بچے کی پرورش کرے کہ جواس کانہیں۔

حرفِ آخر

قلتِ جگہ کی وجہ سے ہم پیش نہیں کرسکے ورنہ بہت سی اورتفصیلات اورقابلِ بیان مصلحتیں ہیں‘ خلافت کے نظامِ عفّت وعصمت کی۔مختصراًیہی کہ ایک تو اسلام نکاح کوآسان بناتاہےتوبدکاری کومشکل تر۔اوردوسرے عورت کووراثت میں حصہ داربناکرنہ صرف اسے باحیثیت بناتاہے بلکہ عفّت وعصمت کاتحفظ کرتاہےتواس حدتک کہ اسے وراثت کے لئے شرطِ اول قراردیتاہے۔تشخصِ خون کے بغیرکارِوراثت کاچلناممکن ہی نہیں۔واقعات کی دنیاسامنے‘ گھوم پھرکردیکھ لے آج کوئی کہ کیاحال ہے عفّت وعصمت کالادینی ممالک میں اوران ممالک میں کہ جہاں کسی نہ کسی طورپر اسلامی قوانین نافذہیں‘ زمین وآسمان کافرق پڑگیا۔کس قدربدنصیبی وناشکری ہےانسان کی کہ وہ آج اس نظام کوترک کئے ہوئے ہے کہ جس کانام ہے.............نظامِ خلافت۔

سوال وجواب

سوال: دنیا میں کچھ لوگ مسلمان ہیں اور کچھ کافر‘ مسلم اور کافر میں فرق کیا ہے؟

جواب: پیشتر اسکے کہ آپ کے سوال کا جواب دیا جائے‘ یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات میں سے انسان (اور کسی حد تک جن) ایک ایسی مخلوق ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقررہ مدت تک نہ صرف کچھ صوابدیدی اختیارات دے رکھے ہیں بلکہ سمجھنے‘ سوچنے‘ اور بولنے کی صلاحتیں بھی دے رکھی ہیں۔ اس کے برعکس فرشتے‘ حیوانات‘ نباتات‘ سورج‘ چاند وغیرہ سب ایک لگے باندھے ضابطے کے پابند ہیں‘ اپنی مرضی کو بروئے کار نہیں لا سکتے۔ انسان کے البتہ یہ صوابدیدی اختیارات اور منفرد صلاحیتوں کے حامل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ’’غیر مسؤل‘‘ ہے۔ روزِ آفرینش یہ غیر معمولی اختیارات وصلاحیتیں عطا کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے انسان پر واضح کر دیا تھا کہ یہ منفرد عنایات بلکہ اسکے جسم کا ہر عضو انسان کے پاس بطور امانت ہے۔ لازم ہے کہ باوجود اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی قدرت رکھتے ہوئے انسان ان امانتوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کو بروئے کار لانے میں استعمال کرے۔ اگر انسان ان امانتوں کو اپنی یا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی مرضی کے مطابق استعمال کرے گا تو وہ خیانت ہوگی جس کی سزا اسے آخرت میں لازماً بھگتنا ہوگی۔ اور یہ بھی کہ جو انسان ان امانتوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق استعمال کریں گے ’’مسلم‘‘ یعنی ماننے والے اور جو خیانت کے مرتکب ہونگے ’’کافر‘‘ یعنی انکار کرنے والے گردانیں جائیں گے۔ ماننے والے آخرت میں ابدی انعامات سے نوازے جائیں گے جبکہ نہ ماننے والے وہاں پر ابدی عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ یہی فرق ہے مسلم اور کافر میں۔

سوال: یہ آخرت کیا چیز ہے؟

جواب: ایک دفعہ پیدا کئے جانے والا انسان کبھی ختم نہیں ہوتا‘ البتہ اللہ پاک‘ جو انسان کا خالق ہے‘ نے انسانی زندگی کو دو ادوار میں منقسم کر دیا ہوا ہے۔ پوری زندگی کا کچھ حصہ انسان اس دنیا میں

بسر کرتا ہے جبکہ باقی حصہ آخرت میں۔ اس دنیا میں بسر کی جانے والی زندگی گنتی کے چند سالوں پر مشتمل ہے جبکہ اگلی دنیا یعنی آخرت میں گزاری جانے والی زندگی بے حدو بے کنار ہے۔ یہ اگلی دنیا ہی آخرت ہے۔

سوال: اس کا کیا ثبوت ہے کہ آخرت واقعی واقع ہوگی؟

جواب: اللہ ورسول ﷺ پر ایمان لانے کے بعد ایک مسلمان کو تو چنداں ثبوت کی ضرورت نہیں‘ سرِ تسلیم خم ہے اگر اللہ ورسول ﷺ نے فرما دیا۔ یہی اسلام اور یہی مسلمانی ہے۔ البتہ مسلمان کی دلبستگی کیلئے اور کافر کی حسِ منطق کو پورا کرنے کیلئے قرآنِ مجید میں نوع بہ نوع دلائل دیئے گئے ہیں۔ انہی دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں فطری طور پر انسان کی انجوائے کرنے کی اہلیت محدود ہے تو سزا پانے کی بھی محدود ہے۔ انصاف کا تقاضا پورا ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس محدودیت کو ختم نہ کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کسی دوسرے کو چھرا گھونپ کر ختم کر دیتا ہے جبکہ ایک دوسرا شخص لاکھوں نفوس کو ایٹم بم گرا کر نیست و نابود کر دیتا ہے۔ ایک فرد کے قاتل کو اگر پھانسی یا کسی اور طریقہ سے ختم کر دیا جائے تو انصاف کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے لیکن وہ جو لاکھوں جانوں کو تلف کرنے اور لاکھوں کو معذور کرنے کا ذمہ دار ہے اگر بھدے سے بھدے طریقے سے بھی ختم کیا جائے تو انصاف کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ کوئی وقت ایسا ہونا چاہیے کہ لاکھوں کے قاتل کی قوتِ برداشت کو اسقدر بڑھا دیا جائے کہ وہ لاکھوں جانیں تلف کرنے کی سزا بھگت سکے۔ آخرت ہو تو ایسا ہونا ممکن ہے ورنہ بے انصافی ہوگی۔ قرآن پتہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یعنی اس کائنات کا خالق و مالک ”عین عدل“ ہے۔ اس نے ازل سے ایسے زمان و مکاں کا بندوبست کر رکھا ہے کہ جس میں انسان کی انجوائے کرنے کی صلاحیت اور سزا پانے کی قوت کو لامحدود کر دیا جائے گا۔ سزا پانے کا عمل تو جاری رہے گا لیکن انسان خود ختم نہیں ہوگا۔ پھر اس دنیا میں تو اربوں مجرم کسی نہ کسی طور سزا سے بچ نکلتے ہیں لیکن آخرت میں ہر مجرم کو اس کے حصے کی اسی طرح سزا ملے گی جیسے کہ لاکھوں جانیں بچانے والے کو اس کے حق کے مطابق جزا سے نوازا جائے گا۔

سوال: آخرت میں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ فلاں نے ایک قتل کیا ہے اور فلاں نے لاکھوں۔ پھر

کئی کام تو ایک انسان اکیلا کرتا ہی نہیں‘ ہزاروں لاکھوں انسان مل کر ایک کام کو کرتے ہیں۔ ایسے میں کیسے پتہ چلے گا کہ کسی کام کے ہونے میں ہر کس و ناکس کا کتنا حصہ ہے؟

جواب: قرآنِ مجید پتہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف ایسے کام کو اور کام کے کرنے والے کو جانتا ہے جو رات کے اندھیرے میں کیا جائے بلکہ وہ اس خواہش اور ارادے تک کو جانتا ہے جو کسی دل کے کسی گوشے میں پیدا ہوتا ہے۔ بایں ہمہ آخرت میں جزا سزا کا معاملہ چونکہ انتہائی نازک اور صحت طلب تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس معاملے کا محض اپنے جاننے پر نہیں چھوڑا۔ قرآنِ مجید نے آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے‘ جب لکھنے کیلئے کاغذ تک ایجاد نہیں ہوا تھا اطلاع دی تھی کہ ہر انسان کے اعمال کا ریکارڈ محفوظ کیا جا رہا ہے۔ مخالفینِ اسلام نے اس وقت یہ کہہ کر مذاق اڑایا تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ اسلام کی حقانیت کا اس سے اندازہ لگائیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذرائع کی تو بات ہی کیا‘ چھوٹی سی کھوپڑی کا حامل انسان آج خود اس قابل ہو گیا ہے کہ کسی بھی انسان کی حرکات و سکنات کو اس کی عدم موجودگی میں دیکھا بھی جا سکتا ہے اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات کو سنا بھی جا سکتا ہے۔ قیامت کو ہر انسان کی زندگی کی فلم اس کے سامنے چلا دی جائے گی۔ کوئی پھر بھی انکار کرے گا تو اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ خود پکار اٹھیں گے کہ انہیں کس کس استعمال میں لایا گیا۔ نیز اللہ تعالیٰ کے کمپیوٹر اس قابل ہونگے کہ اجتماعی طور پر کیئے گئے کاموں میں سے ہر ہر فرد کا حصہ علیحدہ کر دیں۔

سوال: قرآنِ مجید کہ جس کا آپ بار بار حوالہ دے رہے ہیں‘ کیا ہے؟

جواب: ہر فیکٹری کے مالک کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی فیکٹری میں تیار ہونے والے پروڈکٹ کو استعمال میں لانے کی ہدایات دے۔ انسان فطرت کی فیکٹری کا پروڈکٹ ہے لہٰذا انسانی زندگی گزارنے کیلئے قوانین وضوابط دینا اللہ تعالیٰ کا ہی حق ہے۔ اللہ تعالیٰ پوری انسانی تاریخ پر وقفے وقفے سے آسمانی صحیفوں کی شکل میں یہ قوانین وضوابط نازل کرتا رہا ہے۔ قرآنِ مجید اسی سلسلۂ تنزیل کی آخری کڑی ہے۔

سوال: یہ وقفے وقفے سے بار بار نازل کرنے کی کیوں ضرورت پڑی‘ شروع میں ایک مفصل

صحیفہ نازل کر دیا جاتا تو کیا کافی نہیں تھا؟

جواب: بالکل کافی نہیں تھا اس لیے کہ تاریخ شاہد ہے انسان نے تہذیب و تمدن کے بیشمار مراحل طے کئے ہیں۔ اس ارتقائی عمل میں جس سطح کے قوانین وضوابط کی ضرورت ہوتی تھی اسی سطح کی آسمانی کتابیں نازل کی جاتی رہی ہیں۔ بنیادی قوانین یا دینِ حق تو ہمیشہ ایک ہی یعنی ''اسلام'' رہا ہے لیکن دین پر عمل پیرا ہونے والے طریقوں یا شریعت میں وقت کے ساتھ ساتھ ردوبدل ہوتا رہا ہے۔ بنابریں آسمانی صحائف کو وقفے وقفے سے نازل کیا جانا لازم تھا۔

سوال: قرآنِ مجید کو آپ نے سلسلۂ تنزیل کی آخری کڑی قرار دیا ہے' کیا اب ارتقائی عمل رک گیا ہے؟

جواب: ارتقائی عمل ہرگز رکا نہیں اور نہ اس کے رکنے کا قیامت سے پہلے کبھی امکان ہے البتہ ایک مرحلے پر پہنچ کر جب خالقِ کائنات نے محسوس کیا کہ انسانیت اس کی مشیت کے مطابق گلوبل ویلیج کی صورت اختیار کرنے والی ہے تو قرآنِ مجید کی شکل میں گلوبل ضروریات کو تا قیامت پورا کرنے والے دستورِ حیات کو نازل فرما کر اللہ پاک نے نہ صرف سلسلۂ تنزیل کو منقطع کر دیا بلکہ نبیٔ آخرِ زماں حضرت محمد ﷺ کو بھیج کر سلسلۂ نبوت کو بھی منقطع کر دیا۔

سوال: یہ انبیاءؑ کو وقفے وقفے سے مبعوث کیا گیا تو کیوں؟ کیا یہ علیحدہ علیحدہ دین کے علمبردار تھے؟

جواب: ان سوالات کے جوابات دینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انبیاؑ کو مبعوث کیا ہی گیا تو کیوں' صرف صحائف ہی نازل کر دیئے جاتے؟ دیکھئے ایک طریقہ تو یہ ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ آسمانی کتاب کسی طور بہ اہتمام کسی موزوں جگہ پر رکھوا دیتا ان ہدایات کے ساتھ کہ انسان کتاب اللہ میں دیئے گئے قوانین کے مطابق زندگی گزاریں۔ اللہ تعالیٰ نے بوجوہ یہ طریقہ استعمال نہیں کیا۔ ایک تو اس لیے کہ کتاب اللہ اصولوں کی بنیادی کتاب ہوتی ہے' تفصیلات اس میں نہیں ہوتیں۔ دوسرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان کوئی واسطہ ہونا چاہئے کہ جو نہ صرف براہِ راست اللہ تعالیٰ سے قانون کے منشا کو سمجھے بلکہ قوانینِ کتاب اللہ کے مطابق ایک زندگی گزار کر

نمونہ پیش کر دے تا کہ اتنی اہم ہدایات کیلئے کسی قسم کے گمان وقیاس کا شائبہ تک نہ رہے۔ نبیؑ یہی نمونہ ہوتا ہے۔ نبیؑ بشر بھی ہوتا ہے تو اسی لیے کہ وہ انسانی زندگی گزار کر انسانوں کو زندگی کے تمام نشیب وفراز اور اسرار ورموز سے آگاہ کر دے۔ اسی نمونے کی زندگی کو قرآنِ مجید ''اسوۂ حسنہ'' اور معیارِ حق قرار دیتا ہے۔ شریعت کی زبان میں اسے ''سنتِ رسول ﷺ'' کہا جاتا ہے۔ قرآن و سنت کی اصطلاح بھی مستعمل ہوتی ہے تو اسی لیے۔ قرآن، سنتِ رسول ﷺ کے بغیر ایک قدم نہیں چلتا۔ وہ صرف ''اطیعوا اللہ'' کی تاکید نہیں کرتا ''اطیعوا الرسول'' کی تاکید بھی کرتا ہے۔

یہ بات سمجھنے کیلئے انبیاء بار بار کیوں آئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ دودھ کی مقررہ مقدار میں اگر مسلسل پانی ڈالتے جائیں تو ایک مرحلے پر پہنچ کر نیا وجود پذیر ہونے والا مشروب سود مند ہونے کی بجائے صحت کیلئے مضر ہو جاتا ہے۔ اسی کا ملتا جلتا عمل پوری انسانی تاریخ پر حق و باطل کے باہم امتزاج سے ہوتا رہا ہے۔ ایک نبیؑ کے آنے اور حق کو برگزیدہ کرنے کے بعد باطل آہستہ آہستہ حق میں سرائیت کرنا شروع کر دیتا تھا حتیٰ کہ ایک مرحلے پر پہنچ کر دینِ حق اسقدر مسخ ہو جاتا تھا کہ وہ انسانوں کیلئے نفع آور ہونے کی بجائے نقصان دہ ہونے کو ہوتا۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ ایک اور نبیؑ مبعوث فرما کر دینِ حق کو پھر اجاگر کر دیتا۔ آمیزش کردہ اور مسخ شدہ دین کو باطل سے پاک کرنے کی ضرورت چونکہ بار بار پڑی، اسی لیے انبیاؑ کی بار بار بعثت ناگزیر ٹھہری۔ تمام انبیاءؑ البتہ ایک ہی دین یعنی اسلام کے علمبردار تھے۔

سوال: قرآن وسنت کی شکل میں قانون تو ہمارے ہاں ہے لیکن قانون خود بخود تو نافذ نہیں ہوا کرتا، کوئی ادارہ ایسا بھی ہونا چاہیے کہ جو قرآن وسنت پر مشتمل دین کو نافذ کرے؟

جواب: آپ نے بہت پتے کی بات کی۔ حقیقتاً قانون دھرے کا دھرارہ جاتا ہے اگر اسے نافذ کرنے والا کوئی ادارہ یا اتھارٹی نہ ہو۔ دورِ نبوت میں تو یہ نفاذِ دین کا کام نبیؑ ہی انجام دیتا ہے۔ مابعدِ رسول ﷺ البتہ یہ کام اولی الامر نے کرنا ہوتا ہے۔ اولی الامر میں ہوتے تو گورنر، وزراء، جج صاحبان، اداروں کے سربراہان، اہلِ فکر ودانش وغیرہ سبھی ہیں لیکن ان میں مرکزی حیثیت خلیفۂ وقت کو ہوتی ہے۔ یاد رہے قرآنِ مجید اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کو ہی لازم قرار نہیں دیتا، اولی الامر کی

اطاعت کو بھی ضروری قرار دیتا ہے اس بڑی شرط کے ساتھ کہ اولی الامر خود اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے پابند ہوں۔

سوال: ہمارے ہاں کے حکمران کیا ''اولی الامر'' ہیں؟

جواب: اولی الامر ویسے تو ان حضرات کو کہا جاتا ہے جو کسی طور صاحبِ امر ہوں۔ البتہ ہمارے ہاں کے یہ صاحبِ امر حکمران سیکولر اولی الامر ہیں' شرعی اولی الامر نہیں۔ شرعی اولی الامر کیلئے لازم ہے کہ ان میں خلیفۃ المسلمین یعنی مسلمانوں کا ایسا حکمران جس کی سربراہی میں پوری اسلامی دنیا ہو' کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ صدیوں سے چونکہ ہمارے ہاں خلیفۃ المسلمین کا وجود نہیں' بنابریں شرعی اولی الامر کا وجود بھی نہیں۔ نیز اولی الامر میں سے خلیفۃ المسلمین کو نکال دیں تو وہ اسی طرح بے کارو بے اثر ہو جاتے ہیں جس طرح کہ انڈے سے زردی نکال دیں تو وہ بچہ بنانے کے قابل نہیں رہتا۔

سوال: کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے ہاں قرآن وسنت کی شکل میں ازلی وابدی قانون تو ہے لیکن اس قانون کو یا دین کو نافذ کرنے والے موجود نہیں۔

جواب: بالکل ٹھیک' ہمارے ہاں قوانینِ قرآن وسنت تو من وعن موجود ہیں لیکن ان قوانین کو نافذ کرنیوالے صدیوں سے معدوم ہیں۔ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ پوری انسانی تاریخ پر وقفے وقفے سے دینِ حق کو انحطاط پذیر کیا جاتا رہا ہے۔ سلسلۂ نبوت منقطع ہونے پر یہ بحالی وتجدیدِ دین کا کام امتِ مسلمہ کے سپرد کیا گیا تھا لیکن امتِ مسلمہ نہ صرف یہ کہ فرائضِ منصبی ادا نہیں کر سکی بلکہ اسی پاداش میں اپنا وجود تک قائم نہیں رکھ سکی۔ آج دنیا میں امتِ مسلمہ کا کہیں وجود نہیں' اقوام ہیں' کوئی مصری قوم تو کوئی شامی قوم' کوئی ایرانی قوم تو کوئی عراقی قوم' اکثر وبیشتر باہم دگر اور ایک دوسری کے خلاف صف آراء۔

سوال: نافذ کرنیوالے نہ ہوں تو ظاہر ہے دینِ حق وجود پذیر نہیں ہوتا تو جس دین کو آج ہم اختیار کیئے ہوئے ہیں کیا یہ دینِ حق نہیں؟

جواب: ایک مثال سے بات واضح ہوگی۔ ہمارے ہاں جو مختلف فصلیں پیدا کی جاتی ہیں ہر فصل کی کئی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ فصل کی کوئی بھی قسم وقت کے ساتھ اپنا جوہرِ اصلی کھو دیتی ہے۔ اگر

محکمہ زراعت کسی ایسی قسم کو بونے کی سفارش کرتا جائے کہ جو اپنے جوہرِ اصل کو کھو چکی ہو تو کاشتکاروں کو نفع حاصل کرنے کی بجائے الٹا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ آج ہمارا دین نہ صرف ہمارے لیے نفع آور ہونے کی بجائے مضر ہو چکا ہے بلکہ اس کی تبلیغ و دعوت الٹے اثرات پیدا کر رہی ہے۔ ہمارے ہاں دعوت وتبلیغ کا کام تو کسی نہ کسی طور جاری وساری ہے۔ اور نہیں تو ہر جمعہ کو دنیائے اسلام کی لاکھوں مساجد میں مسلسل دعوت وتبلیغ کا کام ہو رہا ہے۔ لیکن سوختہ بختی ہمارے آج اختیار کردہ دین کے مسخ اور انحطاط پذیر ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا کہ اثرات الٹے برآمد ہو رہے ہیں۔ اخوت کی بجائے تعصب' محبت کی بجائے نفرت' اتحاد کی بجائے انتشار کا چلن کیا آج ہمارا مقدر نہیں؟ یہ تمام اقدار کا یکسر الٹ جانا ہمیں کیا پیغام دیتا ہے؟ یہی نا کہ جس دین کو آج کے مسلمان اختیار کیے ہوئے ہیں وہ دینِ حق نہیں۔

سوال: ہمارے دین میں آج کونسی کمی واقع ہو چکی ہے کہ یہ دینِ حق نہیں رہا؟

جواب: جس طرح رسول ﷺ رہتی دنیا تک پوری انسانیت کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' ہیں اسی طرح دورِ خلافتِ راشدہ تا قیامت ''نمونے کا دور'' ہے۔ قرآنِ مجید نے اسے ''سبیل المؤمنین'' قرار دے کر اسی کے اپنانے کو لازم قرار دیا ہے تو رسول ﷺ نے ''سنتی وسنت الخلفاء الراشدین المہدیین'' کہہ کر ہمیں اسی کی پیروی کا پابند کیا ہے۔ بنابریں یہ دیکھنے کیلئے کہ آج ہمارے دین میں کون کونسی کمی واقع ہو چکی ہے لازمی ہے کہ ہم اپنے اختیار کردہ دین کا تقابل اس دین سے کریں جو دورِ خلافتِ راشدہ میں رواں دواں تھا۔ اس وقت کے دین کی اَن گنت خصوصیات لیکن درج ذیل چار بنیادیں ایسی جیسے کہ کسی عمارت کے چار ستون۔ اس وقت:

۱۔ قرآن وسنت ہی آئینِ مملکت تھا' آج کی طرح خودساختہ کتابچہ نہیں۔

۲۔ پوری اسلامی دنیا' خواہ وہ دنیا کے کناروں تک پھیل چکی تھی' ایک خلیفہ کی سرکردگی میں تھی۔ اسلام ایک خلیفہ کی موجودگی میں دوسرے سر اٹھانے والے خلیفہ کو تہہ تیغ کرنے کا حکم دیتا ہے تا کہ مسلمان ہمیشہ ہمیشہ ایک ہی جھنڈے تلے رہیں۔ آج ہمارے ہاں اسلامی دنیا کو 57 ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان پر 57 ہی حکمران جو مسلط ہیں' قرآن وسنت کے خلاف ہے۔

۳۔شریعت نافذ کرنیوالے اولی الامر موجود تھے' آج شرعی اولی الامر کا کہیں وجود نہیں۔ بلکہ شوریٰ اور امتِ مسلمہ کا وجود بھی کہیں نہیں۔

۴۔انعقادِ خلافت ''بیعت کے ذریعہ حکومت نہ کہ حکومت کے ذریعہ بیعت'' کے سنہری اصول پر ہوتا تھا۔آج کے حکمران نسلی و نسبی بنیاد پر یا ڈنڈے کے زور پر برسرِ اقتدار ہیں۔

دینِ حق کی یوں چاروں بنیادیں آج منہدم ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں آج وہ ثمرات و برکات حاصل نہیں ہورہیں جو دینِ حق کا طرۂ امتیاز اور دورِ خلافتِ راشدہ کے مسلمانوں کو حاصل تھیں۔

سوال: وہ کونسے ثمرات و برکات ہیں جو آج ہمیں حاصل نہیں؟

جواب: قرآن پتہ دیتا ہے کہ نظامِ خلافت اگر رواں دواں ہو یا دینِ حق عملاً برپا ہو تو نتیجہ کے طور پر ثمرات و برکات اَن گنت حاصل ہوتے ہیں لیکن ان میں سے پانچ یعنی اتحاد' غلبۂ دینِ حق' امن' عدل اور خوشحالی بہت نمایاں ہیں۔ظاہر ہے اس سے بڑا اتحاد ممکن ہی نہیں کہ پوری اسلامی دنیا ایک خلیفہ کی سربراہی میں ہو۔غلبۂ دینِ حق کا اس سے اندازہ لگائیں کہ گو دورِ خلافتِ راشدہ تو کوئی 30 سال پر محیط تھا لیکن اس کی برکت سے مسلمان دنیا میں کوئی گیارہ سو سال بطور غالب قوت رہے۔امن کا یہ حال تھا کہ ایک عورت ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتی لیکن اللہ کے خوف کے علاوہ اسے کوئی خدشہ لاحق نہ تھا۔عدل و انصاف اس قدر کہ زیرِ آسماں شاید اسی دور میں خلیفۂ وقت کو کچہری کے کٹہرے میں کھڑا دیکھا گیا۔خوشحالی و فارغ البالی اس قدر کہ زکوٰۃ دینے والے بہت تھے' لینے والے مشکل سے ملتے تھے۔نہ صرف یہ کہ پانچوں فوائد و فیوض آج کے مسلمانوں کو حاصل نہیں بلکہ آج ہمارا مقدر یہ ہے کہ اتحاد کی بجائے انتشار' غلبہ کی بجائے مغلوبیت' امن کی بجائے دہشت گردی' عدل کی بجائے ظلم اور خوشحالی کی بجائے پسماندگی و درماندگی۔ہمارے ہاں آج دینِ حق کے نہ ہونے کا اور ثبوت کیا؟

سوال: آپ نے دینِ حق اور نظامِ خلافت کا یوں استعمال کیا ہے جیسے یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہوں۔کیا ایسا ہی ہے؟

جواب: اسلام' دینِ حق' الدین' خلافت' نظامِ خلافت' قرآن و سنت پر مبنی نظام سب مترادف و

ہم معنی ہیں۔ البتہ اسلامی نظریہ ایک دوسری چیز ہے یعنی تعلیمات و احکاماتِ قرآن و سنت اگر قرآن و کتبِ احادیث کے صفحات تک محدود رہیں تو محض ایک نظریہ' ایک فلسفہ اور ایک تھیوری ہیں لیکن جب یہ اسلامی نظریہ کسی خطۂ زمین میں نافذ ہو جائے تو یہی خلافت ہے' یہی اسلام ہے' یہی دینِ حق ہے۔ اوپر بیان کردہ چاروں بنیادوں پر مشتمل اگر آج دنیا میں نظامِ خلافت ہوتا تو ہمارے ہاں دینِ حق بھی ہوتا۔ نظامِ خلافت کا نہ ہونا ہی تو یہ معنی رکھتا ہے کہ جس دین کو ہم آج اپنائے ہوئے ہیں وہ دینِ حق نہیں' اس کی کوئی مسخ شدہ شکل (Self-Styled) ہے۔

سوال: ہمارے ہاں جب نماز روزے' عمرہ و حج' ذکر اذکار' کفن دفن' نکاح و طلاق' ختنے وغیرہ کا انتظام ہے تو پھر یہ دینِ حق کیوں نہیں؟ دینِ حق اور کیا ہوتا ہے؟

جواب: یہ تمام مراسمِ عبودیت جن کا ذکر آپ نے کیا ہے کسی نہ کسی درجے اور کسی نہ کسی طور دورِ جہالت میں بھی تھے۔ رسول ﷺ بھی اگر انہی مراسمِ عبودیت پر اکتفا کرتے تو معرکہ ہائے حق و باطل کی نوبت کبھی نہ آتی۔ یہ ہجرت و برأت اور غزوات و سرایا کی نوبت آئی تو اس وقت جب آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیؓ نظامِ باطل کا قلع قمع کرنے پر مصر بلکہ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں لگ گئے۔ نظامِ باطل میں لاکھوں کروڑوں خداؤں اور معبودوں کی پرستش ہوتی تھی۔ دیوتوں اور دیویوں کے محکمے اور افواج تھیں۔ مختلف قبائل کی شناخت اپنے اپنے بتوں سے ہوتی تھی۔ خانہ کعبہ میں 360 بت براجمان تھے حتیٰ کہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کہ جن کی شناخت ہی قرآن کراتا ہے تو اس طرح ''وہ مشرکوں میں سے نہ تھے'' کے نام کا بت بھی ان 360 بتوں میں شامل کر رکھا تھا۔ نبیٔ کائنات ﷺ نے برملا کہا کہ لوگو تم غلط جا رہے ہو۔ معبودِ حقیقی صرف ایک اللہ ہے۔ نظامِ باطل میں رسومات و توہمات اور فروعات و خرافات کی بھرمار تھی۔ مختلف قبائل اپنی اپنی رسومات دوسرے قبائل پر مسلط کرنے کی دھن میں رہتے تھے۔ ان میں جنگ و جدل ہوتا تھا تو اکثر و بیشتر اسی بنیاد پر۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کہا کہ تم غلط جا رہے ہو۔ قرآن کی شکل میں بے مثل قانون ان کے ہاتھ میں تھمایا۔ نظامِ باطل میں اَن گنت قبائل ہی نہ تھے اَن گنت سردارانِ قبائل بھی تھے۔ رسول ﷺ نے ان تمام سرداروں سے اقتدار چھین کر بالآخر ایک خلیفہ کے ہاتھ میں تھما

دیا۔ بالفاظِ دیگر دورِ نبوت درمیان میں‘ ایک طرف دورِ جہالت تو دوسری طرف دورِ خلافت‘ انہی چار بنیادوں کو استوار کیا جن کا ذکر اوپر ہو چکا تو دورِ جہالت‘ دورِ خلافت میں بدل گیا۔ اس قدر عظیم تبدیلی لانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جمے جمائے باطل نظام کب گوارا کرتے ہیں کہ کوئی آئے اور ان کا تیا پانچہ کردے۔ اس وقت بھی نظامِ باطل نے خوب مقابلہ (React) کیا۔ نتیجہ کے طور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہجرت و برأت اور غزوات و سرایا کی نوبت آئی۔ چشمِ فلک نے معرکہ ٔ ہائے حق و باطل کا بھرپور منظر دیکھا تو قرونِ اولیٰ ہی میں۔

غلط سوچ ہے ان کی کہ جو نماز روزہ‘ قرآن خوانی اور دیگیں وغیرہ چڑھا کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کو راضی کر لیا ہے۔ دینِ حق کی آج چاروں بنیادیں منہدم ہیں۔ جب تک ہم ان کو پھر استوار کرنے میں اپنے خون کا آخری قطرہ نہیں بہا دیتے اور اپنی دولت کا آخری پیسہ نہیں لگا دیتے اللہ تعالیٰ کو ہماری نماز اور روزوں سے کوئی غرض نہیں۔ ہم آج نصرتِ ایزدی سے محروم ہیں تو اسی لیے کہ اللہ ہمارے اعمال سے بیزار ہے۔ دین ایک ایسا نظام تھا جس میں ہر شعبہ قرآن وسنت کی تعلیمات پر مبنی تھا۔ آج ہم نے اپنے ہاں کا ہر شعبہ اغیار کے طور طریقوں پر استوار کر رکھا ہے۔ ایسے میں محض چند مراسمِ عبودیت ادا کرنے سے ہم نے دین کو اسی طرح ایک مذہب میں تبدیل کر رکھا ہے جس طرح کہ یہود و نصاریٰ نے۔

سوال: خلافت کے مقامِ عالی مقام سے ندامت کی سطح پر ہم جو گرے تو اتنی بڑی تبدیلی یک لخت ہوئی یا کہ تدریجاً؟

جواب: میرِ کارواں سے گردِ کارواں کی حیثیت اختیار کرنے میں ایک لحاظ سے تبدیلی یک لخت واقع ہوئی تو دوسرے لحاظ سے بتدریج۔ یک قلم تو اس طرح کہ جیسے ہم نے اوپر ذکر کیا‘ انحطاط کا پورا عمل چار بنیادیں منہدم ہونے سے واقع ہوا۔ ان میں سے ایک بنیاد یعنی انعقادِ حکومت کیلئے ’’بیعت کے ذریعے حکومت نہ کہ حکومت کے ذریعہ بیعت‘‘ کے اصول کو توڑا گیا تو اسی وقت دورِ خلافت کا اختتام اور دورِ ملوکیت کا آغاز ہوا۔ بالفاظِ دیگر یہ المنام تبدیلی ایک ستون کو گرانے کے نتیجہ کے طور پر واقع ہوئی۔ باقی تینوں بنیادیں بھی کم وبیش اسی وقت ہلا ماری گئیں۔ قرآن وسنت کا

بطور آئینِ مملکت ہونا کچھ عرصہ بعد تک جاری رہا لیکن وہ آئین کیسا جس پر جزوی عمل ہوا۔ انعقادِ حکومت کے اصول کو بدلنا، شرعی خلیفہ اور شرعی اولی الامر کے وجود کو ختم کرنا، قرآن و سنت کی خلاف ورزی میں ہی تو کیا گیا۔ لہٰذا یہ تبدیلی اس لحاظ سے یک لخت (Abrupt) تھی۔

تبدیلی البتہ اس لحاظ سے بتدریج ہوئی کہ خلافت کو پہلے ملوکیت کی شکل دی گئی، پھر ملوکیت کو ملوکیتوں میں ڈھالا گیا، پھر ملوکیتیں طوائف الملوکی میں بدل دی گئیں، پھر غلامی کا دور آیا اور آج ''مغلوبیت'' ہم مسلمانوں کا (نہ کہ امتِ مسلمہ کا، کیونکہ اس کا وجود ہی نہیں) مقدر ہے۔ یعنی ہم غلبۂ کفر سے نہ صرف سمجھوتا کیے ہوئے ہیں بلکہ اس کے رسیا ہو چکے ہیں۔ عادی ہو چکے ہیں تو اس حد تک کہ ہم بھول گئے کہ مسلمان ہونا اور مغلوب ہونا ایک تضاد ہے۔

سوال: امتِ مسلمہ معدوم ہوئی تو فرق کیا پڑا؟

جواب: ہم نے اوپر ذکر کیا کہ امتِ مسلمہ اقوام کا روپ اختیار کر گئی یعنی امتِ مسلمہ خود تو معدوم ہو گئی، اس کی بجائے مسلم اقوام معرضِ وجود میں آ گئیں۔ یہ اقوام کسی ایک پلیٹ فارم پر بھی مسلمانانِ عالم کے مؤقف کو متفقہ پیش نہیں کرتیں بلکہ ایک دوسری کی ٹانگ کھینچتی ہیں، نگران و سرپرست ہیں تو دنیائے کفر کے مفادات کی۔ آج دنیا میں کفر والے متحد ہیں تو اسلام والے منتشر۔ مسلمانوں کی بنا بریں ہوا اڑ گئی۔ ان کی آواز میں کوئی وزن نہیں۔ دنیا کی قوموں میں ذلیل ترین آج کوئی قوم ہے تو مسلمان۔ اندازہ لگائیں یو این او میں مسلمانوں کی تقریباً ایک تہائی رکنیت ہے لیکن سوختہ بختی، سلامتی کونسل کے ان پانچ مستقل ارکان کہ جنہیں ویٹو کا حق حاصل ہے میں سے ایک بھی مسلمان رکن نہیں۔ مسلمان ممالک تو تیسری دنیا کے ممالک گردانے جاتے ہیں وہ بھی نرم لہجے میں ورنہ تیسری دنیا کے ممالک کہنے والوں کا اصل مطلب تیسرے درجے کے ممالک ہوتا ہے۔

قرآن و سنت سختی سے ممانعت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے بیک وقت زیادہ تو کیا دو خلفاء ہوں۔ حکم یہی ہے کہ ایک خلیفہ کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص بطور خلیفہ سر اٹھائے تو اسے قتل کر دو۔ مطلب یہ کہ مسلمانانِ عالم ہمیشہ ہمیشہ ایک جھنڈے تلے، ایک خلیفہ کی سربراہی میں رہیں۔ آج مسلمانوں پر 57 حکمران مسلط ہیں جو اصل میں ایک خلیفہ کے حقِ خلافت کو غصب کیے ہوئے ہیں

لہٰذا غاصب ہیں۔ مسلمانانِ عالم اگر ایک خلیفہ کی سرکردگی میں رہتے تو ''امتِ مسلمہ'' کا وجود بھی قائم و دائم رہتا۔ آج 57 حکمران آ دھمکے ہیں تو 57 ہی اقوام معرضِ وجود میں آ گئیں ہیں۔ بنابریں وہ فرائضِ منصبی جو امتِ مسلمہ کی سطح پر کیے جانے تھے اور جو دینِ حق کا اصل جوہر ہیں آج ادا نہیں ہو رہے۔ صرف یہی نہیں کہ آج ''امتِ مسلمہ'' کا کہیں وجود نہیں' حقیقتاً اجتماعی طور پر ہی سہی' خود مسلمانوں کا وجود بھی کہیں نہیں ورنہ قرآن کی رو سے مومن ہوں اور دنیا میں مغلوب یہ ایک تضاد ہے۔

سوال: وہ کونسے فرائضِ منصبی ہیں جو امتِ مسلمہ نے ادا کرنے تھے اور آج اس لیے نہیں ہو رہے کہ امتِ مسلمہ کا اپنا وجود دنیا میں کہیں نہیں؟

جواب: بڑے بڑے فرائضِ منصبی تین ہیں:

۱۔ اقوامِ عالم کی قیادت امتِ مسلمہ کے ذمے ہے۔ بنابریں اسے ''خیرِ امت'' کے عظیم لقب سے نوازا گیا ہے (آلِ عمران: 110)۔ ایسا ہونے کیلئے مزید لازم قرار دیا گیا کہ دنیا میں غلبہ مسلمانوں کا ہو یعنی ان کے پائے کی کوئی دوسری طاقت زیرِ آسماں نہ ہو (انفال: 34)۔

۲۔ چھوٹا سا باغیچہ بھی ویران ہو جاتا ہے اگر اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی مالی نہ ہو۔ اسی طرح لازمی ہے کہ کوئی ایجنسی یا ادارہ ایسا ہو جو دنیا کو سنوار کر رکھے اور بگاڑ سے بچائے۔ یہ دنیا کو سنوار کر رکھنے اور بگاڑ سے بچانے کی ذمہ داری ''امتِ مسلمہ'' کے ذمہ ہے (آلِ عمران: 110)۔ قرآنِ کریم نے اس کیلئے ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کی مخصوص اصطلاح استعمال کی ہے۔

۳۔ دنیا کے انسانوں کی اکثریت زیادہ تر غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہوتی ہے لہٰذا از خود اکثر و بیشتر علمِ وحی یا قرآنی تعلیمات سے لاعلم رہتی ہے۔ چونکہ قیامت کے دن تمام انسانوں کا حساب کتاب ایک ہی پلیٹ فارم پر ہونا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو کہ جو براہِ راست تعلیماتِ قرآن و سنت سے مستفید ہوتی ہے کی ڈیوٹی لگا رکھی ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام تک قرآن و سنت کے علم کو پہنچائے تاکہ کل قیامت کو کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ میرے پاس تو اصل بات پہنچی ہی نہیں۔ قرآنِ کریم نے امتِ مسلمہ کے اس فرضِ منصبی کو ''شہادت علی الناس'' کی اصطلاح سے یاد کیا ہے (بقرۃ: 143)۔

شومئ قسمت یہ تینوں فرائضِ منصبی آج کماحقہ ادا نہیں ہو رہے۔

سوال: پھر کیا یہ حق ہے کہ دنیا میں آج مسلمانانِ عالم ذلت و رسوائی اور پسماندگی و درماندگی سے دوچار ہیں تو اس لیے کہ دنیا میں آج خلیفہ ہے نہ خلافت' اولی الامر ہیں نہ امتِ مسلمہ' اسلام کی مملکتِ واحدہ ہے نہ قرآن و سنت کو آئینِ مملکت بنایا گیا ہے؟ دنیا میں مسلمانوں کا غلبہ بھی نہیں' نہ امتِ مسلمہ کے فرائضِ منصبی ادا ہو رہے ہیں۔ پھر کیا یہ بھی حق ہے کہ بحر و بر میں آج جس قدر فتنہ و فساد' طغیان و شر ظلم و جور اور کفر و شرک ہے' مسلمانوں کی نااہلی اور اپنے فرائضِ منصبی سے اعراض کی وجہ سے ہے؟

جواب: یہ عین حق ہے۔ یہ جتنی چیزوں کے عدم وجود کا آپ نے ذکر کیا ہے' سب دینِ حق کے اجزاء ہیں۔ ظاہر ہے جب اجزا نہیں تو ہمارے ہاں دینِ حق کہیں نہیں اور جب دینِ حق نہیں تو اس کی برکات نہیں۔

سوال: اشد ضروری ٹھہرا کہ دینِ حق یا نظامِ خلافت کا احیاء ہو لیکن ہو تو کیسے؟

جواب: ہدف تو تبھی حاصل ہوگا جب موجودہ مسلم ممالک کو صوبوں کی شکل دے کر ایک عظیم تر اسلامی مملکتِ واحدہ ...... دارالسلام کو معرضِ وجود میں لایا جائے۔ دارالسلام ایک ہی خلیفہ کی سربراہی میں ہو اور قرآن و سنت ہی آئینِ دارالسلام ہو۔ یہ بنیادیں استوار ہوں گی تو تبھی دینِ حق یا نظامِ خلافت پھر انسانیت کا مقدر بنے گا۔

سوال: ایسے میں جب دنیائے اسلام ایسے 57 ٹکڑوں میں بٹ چکی کہ جن کے درمیان نہ صرف سمندر اور پہاڑ بلکہ 57 حکمران بھی حائل ہیں تو ایسے میں دنیائے اسلام کا آج پھر ایک جھنڈے تلے ہونا کیا ناممکن نہیں؟

جواب: ناممکن تو نہیں' البتہ مشکل اسقدر ہے کہ پوری انسانی تاریخ پر یہ کام کبھی نصرتِ ایزدی کے بغیر نہیں ہوا۔ آج بھی جس نے یہ عظیم کام کرنا ہو اور ظاہر ہے کہ کئے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہیں' تو لازمی ہے کہ پہلے وہ نصرتِ ایزدی کو حاصل کرے۔ قرآنِ مجید بتکرار پتہ دیتا ہے کہ نصر اللہ اور فتح و کامیابی لازم و ملزوم ہیں۔

سوال: نصر اللہ کو حاصل کیا جائے تو کیسے؟

جواب: مسنون طریقہ ایک ہی ہے اور یہ وہی ہے جسے رسول ﷺ اور صحابہؓ نے مکی دورِ نبوت میں اختیار کیا۔ یاد رہے مکی دورِ نبوت ''قیامِ خلافت'' کا دور ہے تو مدنی دورِ نبوت بشمول دورِ خلافتِ راشدہ ''دوامِ خلافت'' کا دور ہے۔ مکی دورِ نبوت میں اپنائی گئی حکمتِ عملی اور جدوجہد کے نتیجہ میں اس دور کے اختتام پر مدینہ میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم ہوگئی جس کے سربراہ خود نبیؐ کائنات ﷺ تھے۔ بالفاظِ دیگر انقلاب آ گیا اور نظامِ خلافت قائم ہوگیا۔ یاد رہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا کوئی بھی نبیؑ اپنے وقت کا نبیؑ بھی ہوتا ہے تو خلیفہ بھی۔ رسول ﷺ کو ساتھیوں سے مشورہ لینے کا پابند کیا گیا تو کارِ خلافت میں ہی، کارِ رسالت میں مشورے کی ضرورت کا کیا سوال؟ لازمی ہے کہ آج اسی مسنون طریقے کو تبدیلی لانے کیلئے اختیار کیا جائے جو مکی دورِ نبوت میں اختیار کیا گیا اور جس کے نتیجہ میں قیامِ خلافت کا مرحلہ طے ہوا۔

مکی دورِ نبوت میں جو طریقِ کار اور حکمتِ عملی اپنائی گئی اس کے دو پہلو بہت نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ جس نظام کو بدلنا تھا، نبیؐ کائنات ﷺ اور ان کے ساتھیؓ اس سے یکسر علیحدہ ہو گئے اور دوسرے یہ کہ جس نظام کو لانا تھا اس کی دعوت دی۔ انقلاب لانے کا یہ وہی طریقہ ہے جو ''لا الٰہ الا اللہ'' میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کا اقرار کرنے سے پہلے طاغوت کا انکار کیا جائے۔ طاغوت کا انکار پہلے تو اللہ کا اقرار بعد میں ہے۔ نظامِ عدل وقسط کو لانے سے پہلے نظامِ جبر وظلم کا قلع قمع لازمی ہے۔ اگر محض تبلیغ ودعوت کا کام کیا جائے تو نہ نصرتِ ایزدی کمائی جاتی ہے اور نہ انقلاب آتا ہے۔

جب جمے جمائے نظامِ باطل کے ساتھ مسلمانوں نے چلنے سے انکار کیا تو باطل نظام نے بھرپور جوابی حملہ کیا۔ حملہ کیا تو کن پر؟ نبیؐ رحمت ﷺ اور گنتی کے چند صحابہؓ پر جن میں بیشتر غلام تھے یا نوجوان یعنی جو اکثر و بیشتر خود مختار نہ تھے بلکہ دو وقت کی روٹی کیلئے بھی دوسروں کے محتاج تھے۔ پھر مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی بھی لگا رکھی تھی کہ وہ مخالفین کے خلاف تلوار تو کیا، ان کے ساتھ ترش کلامی سے بھی پیش نہ آئیں۔ پھر کیا تھا چند نہتے مسلمان اور مقابلے میں بپھرا ہوا چاک وچوبند نظامِ باطل جو کسی اخلاقی قدر کا پابند نہ تھا۔ زیرِ آسماں مسلمانوں کو مار پڑی تو بے حدو بے انداز۔ گھروں سے بے گھر کر دیا گیا۔ کاروبار ٹھپ ہو گئے۔ بار بار مسلمانوں کو حبشہ کی طرف

ہجرت کرنا پڑی۔ ایک دو چار سال نہیں، دس سال اسی کشمکش میں گزر گئے۔ ایسے جیسے چارہ مویشیوں کے آگے ڈالا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے گنتی کے چند مسلمانوں کو کفار و مشرکین کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیؓ پکار اٹھے "متیٰ نصر اللہ...... کہاں ہے اللہ تعالیٰ تیری نصرت؟" لیکن اللہ تعالیٰ یوں جیسے سننے پر آمادہ ہی نہیں۔ بعثت کے دسویں سال مکہ والوں کی بے حسی سے تنگ آ کر رسول ﷺ طائف تشریف لے گئے اس امید پر کہ شاید وہاں سے ہی کچھ پیش رفت ہو۔ پیش رفت کیا ہونی تھی، طائف والوں نے پیغمبر ﷺ پر سنگ باری کر دی۔ بعد میں ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے نبیٔ رحمت ﷺ سے پوچھا کہ ان پر زندگی میں کونسا مشکل ترین دن آیا۔ رسول ﷺ نے اسی دن کا ذکر کیا۔ یہی وہ تاریخی دن ہے جب اسلام نے موڑ لیا یعنی نبیٔ رحمت ﷺ کا اپنا خون طائف کی گلیوں میں گرا تو وہ نصرت جو دس سال سے رکی ہوئی تھی، دھیمے سے آوارد ہوئی۔ فرشتۂ نوید حاضر ہوا۔ فرمایا گیا اب پیغمبر ﷺ کی صوابدید پر ہے، چاہے تو طائف والوں کو پہاڑوں میں پیس کر رکھ دیا جائے۔ اصلی انقلاب تو تین سال بعد آیا لیکن ہوا کا رخ اسی دن سے بدل گیا۔ مشکلات کے ساتھ نویدوں کی جھنکار بھی سنی گئی۔

نصرتِ ایزدی کمانے کا طریقہ ہے ہی یہی۔ پیغمبر ﷺ جو انقلاب لائے اس کا یہی راستہ تھا۔ آج بھی کسی نے تبدیلی لانی ہو تو نصرتِ ایزدی کے بغیر یہ کام ہونے والا نہیں اور نصرتِ ایزدی حاصل کرنے کا وہی مسنون طریقہ ہے جو مکہ کی وادیوں اور فاران کی چوٹیوں میں اختیار کیا گیا۔ ضروری نہیں انقلابیوں کی تعداد لاکھوں میں ہی ہو۔ مسلح ہونے کی بھی ضرورت ہرگز نہیں۔ ضرورت ہے تو اس امر کی کہ فدائین نظامِ باطل کے ساتھ چلنے سے دوٹوک انکار کر دیں اور جس نظام...... قرآن و سنت کے نظام کو برپا کرنا ہے اس کی دعوت دیں۔ تن جاتا ہے، جائے دھن جاتا ہے جائے، ان کے جانے ہی سے نصرتِ ایزدی حاصل ہوتی ہے۔ پہلے بہرحال نصر اللہ حاصل ہو تو پھر فتح ورنہ ایں خیال است و بحال است و جنوں۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

سوال: اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ اور رسول ﷺ کا آزمودہ مبارک نظام...... نظامِ خلافت جب دنیا میں رواں دواں ہوگا تو اس کی برکات وثمرات اور فوائد وفیوض کیا ہونگے؟

جواب: قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق جب دورِ خلافتِ راشدہ ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک محبوب ومطلوب نظام ہے تو بہبودِ امت کی جزوی یافتوں میں الجھنے کی بجائے ہماری توانائیوں، محنتوں اور صلاحیتوں کا بہترین مصرف نظامِ خلافت کو پھر معرضِ وجود میں لانا ہی ہے۔ لہٰذا اگر ہم:

۱۔ تمام موجودہ اسلامی ممالک کو صوبوں کی شکل دے کر باہم مدغم کر کے نقشۂ عالم پر ایک عظیم تر اسلامی مملکت معرضِ وجود میں لے آئیں جس کا نام ''دارالسلام'' ہو۔

۲۔ موجودہ درجنوں مسلم سربراہوں کی بجائے پوری اسلامی دنیا یعنی دارالسلام کو ایک خلیفہ کی سرکردگی میں لے آئیں تو یوں بحالیٔ خلافت سے نہ صرف ہماری آخرت سدھر جائے گی بلکہ اس دنیا میں بھی اَن گنت فیوض وبرکات حاصل ہوں گی جن کا اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے:

سیاسی برکات

☆ ''دارالسلام'' کے معرضِ وجود میں آنے، خلافت بحال ہونے اور مسلمانوں کے وسائل وذرائع مجتمع ہونے سے دارالسلام کے پائے کی کوئی اور مملکت دنیا میں موجود نہ ہوگی۔ دنیا میں صرف اور صرف مسلمانوں کا غلبہ ہوگا۔ امتِ مسلمہ بے مثال یکجہتی اور باہمی اتحاد واتفاق کا عظیم الشان مظہر ہوگی۔ مقصدِ بعثتِ محمدی ﷺ (غلبۂ دین) کا ظہور ہوگا۔ مقصدِ تخلیقِ آدم یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کوئی طاقت وقوت مزاحم نہ رہے گی۔

☆ پوری اسلامی دنیا کا ایک سربراہ، ایک فوج، ایک کرنسی، ایک زبان، ایک شہریت ہونے سے وطنی، لسانی، عربی، عجمی اور موجودہ بین المملکتی جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ نہ پاسپورٹ کی ضرورت ہوگی نہ ویزے کی۔

☆ غیر مسلموں کو ذمی بن کر رہنا ہوگا اور ذمی ہونے کی علامت کے طور پر جزیہ ادا کرنا ہو گا۔

☆ خلیفہ وارکان شوریٰ میں سے ہر ایک قرآنی معیارِ اہلیت یعنی ایمان' تقویٰ' صلاح' علم اور جسم کا حامل ہوگا۔ امانت دارانہ عہدے اہل لوگوں کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے پورا نظام عدل وقسط کا مظہر ہوگا۔

☆ بشرطِ قرآنی معیارِ اہلیت چونکہ خلیفہ وارکان شوریٰ تاحیات اپنے عہدوں پر متمکن رہ سکیں گے اور چونکہ کسی عہدے کیلئے امیدوار بھی نہیں بنایا جاسکے گا' لہٰذا یہ آئے دن کے انتخابات' انتخابی مہم' بے جا اخراجات' تضیع اوقات وغیرہ نظامِ سیاست کا حصہ نہ ہونے کی بناء پر پوری مملکت سکون وچین کا گہوارہ ہوگی۔ بے جا مسابقت' محاذ آرائی' بغض' حسد وغیرہ کا نام ونشان نہ ہوگا۔ نسل درنسل دشمنیاں عنقا ہوجائیں گی۔

☆ چونکہ مجلسِ شوریٰ کا ہر رکن قرآنی معیارِ اہلیت کا حامل ہوگا لہٰذا مجلسِ شوریٰ کے ہوتے ہوئے کسی اسلامی نظریاتی کونسل یا ایسے کسی دوسرے ادارے کی ضرورت نہ رہے گی۔ نیز مجلس شوریٰ چونکہ قرآن وسنت کی صرف تعبیر وتشریح کرنے پر ہی قادر ہوگی لہٰذا دستور سازی اور قانون سازی کی مجاز نہ ہونے پر امت کو انسانوں کے بنائے ہوئے قانون سے نجات مل جائے گی۔ شوریٰ صرف اجتہاد کی مجاز ہوگی۔

☆ امر بالمعروف' نہی عن المنکر' اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ چونکہ خلافت کے اہم فرائض میں سے ہونگے نتیجہ کے طور پر ایک صالح' متوازن اور خوشحال معاشرے کے معرضِ وجود میں آنے کے علاوہ' مقصدِ تخلیقِ امتِ مسلمہ یعنی دنیا کی ہدایت ورہنمائی کا مقصد خود بخود ادا ہوگا۔

☆ انتظامی وحدت کا مرکز مسجد کو بنانے سے لوکل مسائل کا حل سہل ہوجائے گا۔ مسجد کا امام سربراہِ حکومت کا نمائندہ ہوتے ہوئے اپنے گردونواح علاقے کا سربراہ بھی ہوگا۔ تمام مقامی مسائل کے حل کا اختیار اسے ہی ہوگا۔ مقدمات کا فیصلہ تو اکثر وبیشتر موقع پر ہی کرلیا جائے گا'

فوجداری مقدمات کی شہادتیں بھی نہ چھپائی جاسکیں گی۔ کسی پولیس افسر کے مظالم باقی نہ رہیں گے۔ معاشرہ جرائم سے پاک ہوگا۔ دکاندار ملاوٹ نہ کرسکیں گے۔ تول درست ہوں گے۔ اغوا' چوری' ڈکیتی نام کو نہ ہوگی۔ کوئی گندگی نہ پھیلا سکے گا۔ کسی کو تجاوزات کی جرأت نہ ہوگی۔ غرض یہ کہ وہ سماں پھر لوٹ آئے گا جو کبھی قرونِ اولیٰ میں تھا۔

☆ چونکہ خلیفہ' ارکانِ شوریٰ اور دوسرے اعلیٰ عہدوں پر صرف قرآنی معیارِ اہلیت کے حامل افراد کو متمکن کیا جائے گا لہٰذا اس معیار پر اترنے میں مسابقت ہوگی۔ سرمایہ' جائیداد' فاخرانہ اثر و رسوخ وغیرہ وجہ امتیاز نہ رہے گی لہٰذا دور دورہ ہوگا تو اخلاق کا اور وقعت ہوگی تو کردار کی۔

معاشی برکات

☆ امیر و غریب کے مابین تفاوت کم سے کم ہو جائے گا۔ زکوٰۃ لینے والوں کی تعداد بتدریج کم ہو کر نہ ہونے کے برابر ہو جائے گی۔

☆ دارالسلام کا کوئی شہری روٹی' کپڑا' مکان' تعلیم اور علاج جیسی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے گا۔ کفالت عامہ کے پروگرام کے تحت بیواؤں' یتیموں' معذوروں وغیرہ کی بنیادی ضروریات کی فراہمی بذمہ خلافت ہوگی۔ پوری مملکت میں ایک بھی گداگر نظر نہیں آئے گا۔

☆ سودی نظام ختم ہو جائے گا۔ تمام بینک بیت المال کی برانچیں ہونگی۔ ان برانچوں میں بچت بغیر منافع کے' حفاظت' مبادلہ اور دیگر سہولیات کے عوض عندالطلب واپسی کے معاہدے کے تحت جمع کرائی جاسکے گی۔

☆ عملی شرکت کے بغیر سرمایہ لگانے کی صرف ایک ہی صورت ہو گی کہ کاروباری منصوبوں میں براہِ راست حصہ دار بنا جائے۔ کارکنوں کی کاروباری اداروں میں براہِ راست شمولیت سے خواہ وہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو ہڑتال' تالہ بندی وغیرہ کی گنجائش نہ رہے گی۔ نیز وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیداوار فی یونٹ لاگت کا گراف بلند ہی ہوتا جائے گا۔ بین الاقوامی منڈیوں اور اقوامِ عالم سے لین دین سود کی بجائے شراکت کی بنا پر ہوگا۔ کاروبار میں شراکت'

اعتماد اور زیادہ منافع کا باعث بنے گی۔

☆ ہر وہ معاشی عمل جو فرد یا معاشرہ کیلئے نقصان دہ ہوگا ممنوع قرار پائے گا۔ اس سے ملاوٹ' سمگلنگ' چور بازاری' لاٹری' جوا' سٹہ' احتکار وغیرہ سب ناپید ہوں گے۔

☆ اسلامی قانونِ وراثت کے ٹھیک ٹھیک نافذ ہونے سے بیٹیوں اور عورتوں کے حصہ کو کوئی دوسرا غصب نہیں کر سکے گا۔ احساسِ ملکیت عورتوں کو عزتِ نفس سے نوازے گا۔

☆ نظامِ خلافت میں زکوٰۃ وصدقات' عشر' قومی زمینوں' صنعتوں اور کاروباری منصوبوں کی آمدنی کے علاوہ کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا۔ آدم کی اولاد سفارش' رشوت' استحصال وغیرہ سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نجات پا جائے گی۔

☆ کارخانے' فیکٹریاں اور صنعتوں کا پھیلاؤ فطری یعنی خام مال کی فراہمی کے منبع کے پاس ہوگا۔ ان کا شہروں کی بجائے زیادہ تر دور دراز علاقوں میں ہونے کی وجہ سے شہری سہولیات دیہات میں ہی میسر ہونگی۔ لوگوں کا شہروں کی طرف انتقال رک جائے گا۔

☆ اعتماد و امانت دارانہ فضا ہونے کی وجہ سے کوآپریٹو فارمنگ کا رواج ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے کاشتکار اپنی زمینیں کوآپریٹو اداروں کے سپرد کر کے خود صنعتی اداروں میں کام کرنا پسند کریں گے۔ اس طرح سے انسانی' حیوانی اور مادی ذرائع کا ضیاع ماضی کی یاد ہوگا۔

☆ زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی' انفاق فی سبیل اللہ اور رفاعی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے سے روپیہ گردش میں رہے گا۔ رفاہی اداروں' تربیت گاہوں' مدرسوں' پیشہ وارانہ اسکولوں' ہسپتالوں وغیرہ کا جال بچھ جائے گا۔

☆ ہر فرد کی تعلیم وعلاج کا بندوبست اس کی سکونت کے قریب میسر ہوگا۔ ذرائع پیداوار میں انفرادی تصرف کو ظلم وعدوان کا ذریعہ نہیں بننے دیا جائے گا۔ عمدہ سلوک (Fair Deal) کاروبار کا طرۂ امتیاز ہوگا۔

☆ چونکہ زمین حقیقت میں اللہ ہی کی متصور ہوگی جسے استعمال میں لانے کا حق ہر ایک کو مساوی ہوگا لہٰذا دارالسلام میں ایسے نظریات کا قلع قمع ہو جائے گا جو اس بنیادی اصول سے متصادم

ہوں۔

☆ مفت طبی و قانونی تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔ جگہ جگہ فلاحی و مشاورتی ادارے قائم کیے جائیں گے جہاں انتقالِ جائیداد' تقسیم وراثت' تخمینۂ زکوۃ و عشر' محصولات' مکانوں اور دوکانوں کے کرایوں کا تقرر' آجر اور مزدور کی شرائط' قانونی چارہ جوئی کے بارہ میں مفت مشوروں کا خاطر خواہ انتظام ہوگا۔

معاشرتی برکات

☆ اسلامی حدود کے نفاذ سے دارالسلام میں مجرمین ڈھونڈے سے نہیں ملیں گے' چوری چکاری' ڈاکے' رہزنی' قتل' دنگا فساد' غنڈہ ٹیکس ماضی کا افسانہ بن جائیں گے۔ جان و مال' عزتَ نفس اور آبرو کا مکمل تحفظ ہوگا۔

☆ سفارش' بدعنوانی' رشوت' سرخ فیتہ' دفتری مسائل کا نام و نشان نہ ہوگا۔ وہ کام جو آج سالوں میں نہیں ہوتے' ہفتوں میں ہوا کریں گے۔

☆ پابندیٔ قانون' پابندیٔ وقت اور پابندیٔ اخلاق مسلم معاشرہ کا طرۂ امتیاز ہوگا۔ زندگی چین اور سکون کا مرقع ہوگی۔ انسان ہی نہیں حیوان بھی اطمینان کا سانس لیں گے۔ محض تماشابینی کی خاطر جانوروں پر زیادتی نہیں ہوگی۔ غیر مسلموں کیلئے کوئی چارۂ کار نہ ہوگا ماسوائے اس نظام کی طرف لپک لپک کر آنے میں۔ دنیا گواہی دے گی کہ نظامِ عدل وقسط ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

☆ بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی ہوگی۔ دورانِ جنگ بھی دشمن کی عورتوں' بوڑھوں' بچوں' فصلوں' درختوں اور جانوروں کو محترم سمجھا جائے گا۔

☆ والدین' اساتذہ' اپنے سے اعلیٰ عہدوں پر متمکن افراد کی فرمانبرداری کے معاملے میں حسنِ سلوک کی وہ روایات قائم ہوں گی جو دورِ خلافتِ راشدہ کا طرۂ امتیاز ہی ہیں۔

☆ عورت کا دائرۂ کار اس کا گھر ہوگا۔ اس پر وہ وقت نہیں آنے دیا جائے گا کہ اسے حصولِ معاش میں گھر سے باہر نکلنا پڑے۔ مخلوط تعلیم' مخلوط محفلیں' مخلوط کاروباری اداروں کا وجود نہ رہے گا۔ عورتوں کا گھر سے باہر اگر کوئی حصہ ہوگا تو عورتوں کے تعلیمی اور علاج معالجہ کے اداروں کیلئے۔

☆ جہیز اور برات کی موجودہ رسمیں عنقا ہو جائیں گی۔ شادی بیاہ کے موقعہ پر اگر کچھ اخراجات ہوں گے تو ان کا بوجھ لڑکے والوں پر ڈالا جائے گا۔

☆ دوسری شادی بشرطِ ضرورت ہی کی جا سکے گی۔ اسے عیش و عشرت اور عدم مساوات کا ذریعہ نہیں بننے دیا جائے گا۔

☆ قومی لباس' قومی زبان' قومی روایات مستحکم ہوں گی۔ اغیار سے صرف وہ اقدار لی جائیں گی جو درحقیقت مومن ہی کی گمشدہ میراث ہوں گی۔

☆ ذرائع ابلاغ' اخبارات و جرائد' تصویر' خوشنویسی' موسیقی' شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو یوں مرتب و مروج کیا جائے گا کہ یہ صرف اور صرف اسلامی اقدار کو جلا دینے کا باعث بنیں۔ نتیجہ کے طور پر ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ معرضِ وجود میں آئے گا جس پر فرشتے بھی رشک کریں گے۔

تعلیمی برکات

☆ پورے دارالسلام میں ایک ہی طرز تعلیم رائج ہونے سے موجودہ عام مدارس' پبلک اسکولوں اور دینی مدارس کی تمیز مٹ جائے گی۔ نیز عربی کو بین الاقوامی زبان کا درجہ حاصل ہونے سے لسانی اور اصطلاحاتی مشکلات سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔

☆ دینی اور معاصر تعلیم کے باہم مدغم ہونے سے اخلاق و کردار کی بہتر تعمیر ہوگی۔ استاد و شاگرد کا رشتہ مستحکم اور مقدس ہو جائے گا۔ اساتذہ کو ان کا جائز مقام اور پورا احترام ملے گا۔

☆ تعلیم و تربیت میں بہترین افراد لگانے سے معیارِ تعلیم بلند ہوگا اور معیارِ تعلیم بلند ہونے سے زندگی کے ہر شعبہ میں کمال کی صورت عود آئے گی۔

☆ ہر مرد اور عورت کیلئے تعلیم فرض قرار دینے سے ناخواندگی کا کلی قلع قمع ہو جائے گا۔ ناخواندگی ختم ہونے سے بود و باش' رہن سہن' لین دین غرض یہ کہ ہر شعبۂ زندگی میں نکھار آ جائے گا۔

☆ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت وتزکیہ کی سہولت میسر ہونے سے صالح ہنر مند افراد کی بہتات ہوگی۔☆ اعلیٰ تعلیم صرف مستحقین کے لیے مختص ہونے سے بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرین کی ایک عظیم کھیپ تیار ہو جائے گی۔نتیجہ کے طور پر کارِ خلافت آسان ہو جائے گا۔

عدالتی برکات

☆ چونکہ خلیفۂ وقت کو دارالخلافت کی مرکزی مسجد کا خطیب وامام بھی ہونا ہوگا اوراسی طرح گورنروں، کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں حتیٰ کہ محلّہ کی سطح تک یونین کونسل کے سربراہوں کو اپنے اپنے دائرۂ اختیار کی مرکزی مسجدوں کے خطباء وامراء ہونے سے کم ازکم پانچ وقت اپنے عوام کے درمیان آنا ہوگا، عوام کی شکایات کا ازالہ سونے سے پہلے ہو جایا کرے گا۔حدود کے نفاذ اور فرائض وحقوق کے متوازن ہونے سے جرائم کی تعداد کم ہو جائے گی۔لہٰذا قاضیوں اور عدالتوں کی تعداد برائے نام رہ جائے گی۔

☆ قانون سے کوئی فرد بالا نہ ہوگا۔اس طرح بڑے سے بڑے حاکم کیلئے امتیازی اختیارات کا بے جا استعمال ممکن نہ رہے گا۔سفارش، بدعنوانی جیسی کسی قباحت کا نام تک نہ رہے گا۔

☆ سلمانوں کے دنیا میں غالب قوت ہونے کی وجہ سے بین الاقوامی اختلافات کے فیصلے قرآن وسنت کے مطابق ہوں گے۔نتیجہ کے طور پر صرف مسلمان ہی نہیں پوری انسانیت قرآن و سنت کی برکات وفیوض سے مستفید ہوگی۔

☆ عدلیہ، انتظامیہ سے کلی طور پر علیحدہ ہوگی اور صرف ربِ کائنات کے سامنے جواب دہ ہو گی اس طرح عدل وانصاف عوام کا مقدر ہوگا۔

☆ نظامِ عدل وقسط قائم ہونے سے مجرم سزا پانے کیلئے خود حاضر ہوا کریں گے حتیٰ کہ جنسِ جرم ہی آہستہ آہستہ اسلامی دنیا سے ناپید ہو جائے گی۔انسانیت گواہی دے گی کہ اگر ’’فردوس برروئے زمین است، ہمیں است وہمیں است وہمیں است‘‘۔